

# تذکرہ معاصرین

(1974 اور 1975 کے دوران میں وفات پانے والے ادباء کے حالات اور کلام)

(حصہ سوم)

مالک رام

مکتبہ جامعیہ ملیہ

اشتراک

پیشکش کنندہ: قومی ادارہ برائے ادبیات

# تذکرہ معاصرین

(1974 اور 1975 کے دوران میں وفات پانے والے ادباء کے حالات اور کلام)

(حصہ سوم)

مالک رام

مکتبہ جامعی دہلی

اشتراک

پیشکش کنندہ: قومی ادارہ برائے ادبیات

## معروضات

قارئین کرام! آپ جانتے ہیں کہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ایک قدیم اشاعتی ادارہ ہے، جو اپنے ماضی کی شاندار روایات کے ساتھ آج بھی سرگرم عمل ہے۔ 1922ء میں اس کے قیام کے ساتھ ہی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو زمانے کے سروگرم سے گزرتا ہوا آگے کی جانب گامزن رہا۔ درمیان میں کئی دشواریاں حائل ہوئیں، نامساعد حالات سے بھی سہاقتہ چہ انگریز سفر جاری رہا اور اشاعتوں کا سلسلہ کئی طور پر کبھی منقطع نہیں ہوا۔

اس ادارے نے اردو زبان و ادب کے معتبر و مستند مصنفین کی سیکڑوں کتابیں شائع کی ہیں۔ بچوں کے لیے کم قیمت کتابوں کی اشاعت اور طلباء کے لیے ”دری کتب“ اور ”معیاری سیریز“ کے عنوان سے مختصر مگر جامع کتابوں کی تیاری بھی اس ادارے کے مفید اور مقبول منصوبے رہے ہیں۔ اوپر چند برسوں سے اشاعتی پروگرام میں کچھ تعطل پیدا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے گہرست کتب کی اشاعت بھی ملتوی ہوتی رہی مگر اب برف کھلی ہے اور مکتبہ کی جو کتابیں کیا اب بلکہ نایاب ہوتی جا رہی تھیں شائع ہو چکی ہیں۔ زیر نظر کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اب تمام کتابیں مکتبہ کی دہلی، ممبئی اور علی گڑھ شاخوں پر دستیاب ہیں اور آپ کے مطالبہ پر بھی روانہ کی جائیں گی۔

اشاعتی پروگرام کے حدود کو توڑنے اور مکتبہ کی ناؤ کو کھنور سے نکالنے میں مکتبہ جامعہ بورڈ آف ڈائریکٹرز کے چیئرمین اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر جناب نجیب جنگ (آئی اے ایس) کی خصوصی دلچسپی کا ذکر ناگزیر ہے۔ موصوف نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے فقال ڈائریکٹر جناب حمید اللہ بھٹ کے ساتھ (مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے درمیان) ایک معاہدے کے تحت کتابوں کی اشاعت کے معطل شدہ عمل کو نئی زندگی بخشی ہے۔ اس سرگرم عملی اقدام کے لیے مکتبہ جامعہ کی جانب سے میں ان صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ یہ تعاون آئندہ بھی شامل حال رہے گا۔

خالد محمود

چیئرمین ڈائریکٹر، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

ڈاکٹر سید عابد حسین  
کی نذر

نشانِ سجدہ من نیز ہم بر آستانِ بینی



# تعارف

تذکرہ معاصرین کی اس جلد میں ان ۵۶ ادیبوں، شاعروں، صحافیوں کے حالات شائع کیے جا رہے ہیں، جو ۱۹۰۷ء اور ۱۹۰۸ء کے دو برسوں میں ہم سے جدا ہوئے۔ یہ اس سلسلے کے، جہاں ہم میں سے ہر ایک آگے پیچھے پہنچنے والا ہے۔ (اٹا پتہ کو آتا رہے راجوٹن۔ دیکھنا یہ ہے کہ انھوں نے اپنی حیاتِ مستعد میں کیا کیا بندوبست کی، انھیں جو صلاحیتیں دی گئیں، کیا انھوں نے ان کا اپنی بساطِ سمجھ و شعور کے استعمال کیا، کیا انھوں نے اپنے دل و دماغ کی خداداد قوتوں کو اپنے مہموں اور سنی فروعِ انسان کی بھلائی اور بہتری کی راہ میں صرف کیا، کسی زندگی کی کامیابی اور ناکامی کا یہی معیار رہا ہے، اور یہی آئندہ بھی رہیگا۔ اگر ان سوالات کا جواب اثبات میں ہے، تو بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے نامت میں خیانت نہیں کی، اور کم و بیش کامیاب زندگی گزاری۔

ان میں سے بعض اصحاب اس پالیے کے تھے کہ کوئی نوڈرچ ادب اور دہ انھیں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ انھوں نے اپنے پیچھے ایسے اُستاد چھوڑے ہیں اور اپنے بعد کے آنے والوں کی راہ اس حد تک ہموار کر دی ہے کہ اگر وہ کامیاب ایک طالب علم ان کا نمونہ رہیگا۔ حالات کی فراہمی میں طریقہ کار وہی رہا ہے جس کی طرف اس سے پہلے اشارہ کر دیا ہوا۔ جن اصحاب کے بارے میں غور کرنے کی ذاتی تعلقات تھے، یا جن کے لواحقین اور متعلقین نے معلومات تیار کرنے میں مستعدی دکھائی، ان کے حالات بھی مفصل اور بڑی حد تک مکمل ہیں؛ دوسروں کے نسبتاً تشہہ ہیں، اگرچہ یہاں بھی بنیادی اور اہم کوائف بہر حال محفوظ ہو گئے ہیں۔ موجودہ حالات میں ان سے زیادہ معلومات حاصل کرنا دشوار تھا۔

یہاں ایک اور بات کی طرف اشارہ کرنا بھی نہیں ہوگا:

بعض اوقات ایک صاحب کے ترجمے میں کسی دوسرے شخص کے حالات بھی جمع ہو گئے ہیں۔ کسی کے نزدیک یہ غیر ضروری ہو، یہ بات اہم خیال کرتے ہیں کہ حتی الامکان

ہر ایک ادیب یا شاعر کے خاندان کا حال معلوم ہونا چاہیے، تاکہ ہم دیکھ سکیں کہ اس کا پس منظر کیا تھا، وہ کس ماحول میں پیدا ہوا، بڑا ہوا۔ پھر اس کا استاد کون تھا جس سے ہم اس کی تعلیم و تربیت کا کچھ اندازہ کر سکیں۔ اس سے ہمارے لیے یہ فیصلہ کرنا آسان ہو جائیگا کہ اس کی کونسی صلاحیت موردِ ترقی تھی اور کونسی اس کے اپنے ذہن پر بازو کا نتیجہ۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ان تفصیلات میں جاننے کا باعث ہوتی ہے۔

اپنی جستجو اور پوچھ گچھ کے دوران میں میرے سامنے کئی ایسی باتیں آ جاتی ہیں جس سے متعلق کسی نے کچھ نہیں سمجھا۔ چونکہ حسن اتفاق سے یہ معلومات حاصل ہو گئی ہیں، چاہتا ہوں کہ وہ محفوظ ہو جائیں، ورنہ بعد کو کوئی استاد ہمارے دالہ بھی نہیں ہوگا اور وہ کاٹا مرڈہ خطا میں چلی جائیگی؛ میرے خیال میں یہ علم کا ناقابلِ تلافی نقصان ہوگا۔ کون کہہ سکتا ہو کہ کس کس کو ان کی ضرورت نہیں پیش آئیگی۔

جب بھی ان اصوات کی قبرست اور ان کے حالات پر نظر ڈالتا ہوں، تو وہ دم کے ایک پتہ پہن میں آتی ہے کہ سچے سچے وہ بڑے ہیں اور سینے خالی ہوتے جا رہے ہیں۔ ہر روز بیمار نئی کتابیں شائع ہو رہی ہیں، لیکن علم کم ہو رہا ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ مستقبل کی طرف سے ایسے ہو جانے والے قوانینِ فطرت کی صداقت سے انکار کا مرادف ہو گیا لیکن اتفاقاً سر کوئی محسوس کر سکتا ہے کہ ہماری نئی نسل کو بزرگوں کی حلائی ہوئی تسبیحِ علم و معرفت روشن رکھنے کے لیے بہت کوشش کرنا پڑیگی۔

آخر میں ایک حوالہ پھر ان احباب کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے حالات کی فراہمی میں مدد کی، کلام کے مجموعے تیار کیے، یاد دہری مطبوعات مستعار دیں۔ میں ان سب کا شکریہ خدا و فردا پہلے بھی ادا کر چکا ہوں، اب پھر مجموعی طور پر اس کا اعادہ کرتا ہوں۔

فخرِ اہم اللہ احسن الخیرات

نئی دہلی

مالک رام

۳۰ اپریل ۱۹۷۸ء

# نہرست بہ ترتیب حروف تہجی

- ۱۔ اثر حیدر آبادی، صدیق احمد : ۹۴
  - ۲۔ اظہر سیالکوٹی، احمد الدین (اے، ڈی) : ۵۳
  - ۳۔ اعجاز حسین، شید (پروفیسر) : ۲۱۸
  - ۴۔ انسر میرٹھی، حامد اللہ : ۸۴
  - ۵۔ اکمل جالندھری، رام پرتاپ : ۲۰
  - ۶۔ انجمنی، محمد امجد : ۳۰
  - ۷۔ انور، ڈاکٹر منوہر سہاس : ۴۵
  - ۸۔ انور کامٹھی، یار محمد انصاری : ۱۱۲
- 
- ۹۔ بسمل الہ آبادی، سکھ دیو پرشاد : ۳۰۹
  - ۱۰۔ بجزاد بکھنوی، سردار احمد خان : ۱۴۴
  - ۱۱۔ تاج توپکی، محمد اسماعیل علی خان بہادر : ۱۵۱
  - ۱۲۔ تمکین مرست، محمد قادر الدین، شید : ۳۳۷
  - ۱۳۔ ٹھاکر پوچھی، جگن ناتھ : ۱۴۱
  - ۱۴۔ شائق عظیم آبادی، شید حسن رضا : ۱۵
  - ۱۵۔ شرچھری، عبدالحفیظ صدیقی : ۱۵۸
  - ۱۶۔ جمالی، طفیل احمد : ۱۳۶
  - ۱۷۔ جوان سندیلوی، سنی لال : ۲۴
  - ۱۸۔ حامد الہ آبادی، حامد حسین : ۲۶۹

- ۱۹۔ حیدر احمد خان ۷۹ :  
 ۲۰۔ حیرت بدایونی، سید حسن ۲۰۷ :  
 ۲۱۔ حضرت عیسیٰ، مراد بخش ۹۹ :  
 ۲۲۔ دیوان سنگھ مفتون ۱۸۷ :  
 ۲۳۔ ذوالفقار علی بخاری ۲۲۸ :  
 ۲۴۔ ن - م، راشد ۲۷۵ :  
 ۲۵۔ ریاض القادری، ریاض الدین، نقاضی ۱۱۷ :  
 ۲۶۔ ساجد صدیقی، محمد اختر ۱۲۸ :  
 ۲۷۔ ساگر نکودری، بلونت کار ۶۰ :  
 ۲۸۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب ۳۲۴ :  
 ۲۹۔ شاہ معین الدین احمد ندوی ۱۶۶ :  
 ۳۰۔ شفقت کافعی، سید فضل الحسن ۲۲۵ :  
 ۳۱۔ شمس میری، شمس الدین احمد ۲۱۳ :  
 ۳۲۔ شمیم کرمانی، شمس الدین حیدر ۲۲۳ :  
 ۳۳۔ شوہر شاکشیری، عبدالکریم، آغا ۲۸۷ :  
 ۳۴۔ شیر محمد اختر گجراتی ۱۷۲ :  
 ۳۵۔ طالب دہلوی، شیش چندر سکیت ۲۹۷ :  
 ۳۶۔ طالب دقاقی، محمد قطب الدین حسن قادری ۲۵۵ :  
 ۳۷۔ عبدالرحمن چغتائی ۱۷۶ :  
 ۳۸۔ عزیز جمال دادی، محمد عزیز الرحمن قریشی ۳۷ :  
 ۳۹۔ قاصر، یحیٰی، ناظمہ دت ۳۱۲ :  
 ۴۰۔ قیس کوٹوی، نور محمد ۲۷ :  
 ۴۱۔ مانی ناگپوری، بشیر خان ۲۴۰ :

## تذکرہ عامرین

- ۴۲۔ جمید امجد، عبدالجمید : ۱۱۰ :  
 ۴۳۔ عشر مرزا پودی، مرزا فرزند علی : ۱۴۸ :  
 ۴۴۔ محمد حسین حستان : ۱۳۳ :  
 ۴۵۔ محمود احمد عباسی اردہوی : ۶۳ :  
 ۴۶۔ محوی مدنی مکنوی، محمد حسین : ۳۰۳ :  
 ۴۷۔ مسیح الزمان، شید : ۲۰۴ :  
 ۴۸۔ مضطر حیدری، دلادر حسین : ۲۲۳ :  
 ۴۹۔ منظر گھنوی، شید منظر حسن : ۲۶۵ :  
 ۵۰۔ ہندو ناتھ : ۷۱ :  
 ۵۱۔ بہبود شمس، شید عبدالقیوم : ۴۱ :  
 ۵۲۔ میرزا محمود بیگ : ۳۳۴ :  
 ۵۳۔ نثار، نامادی، نثار حسین : ۱۰۴ :  
 ۵۴۔ نجم آفندی، میرزا جمال حسین : ۳۴۹ :  
 ۵۵۔ نشتربانندھری، محمد عبدالیکم خان : ۲۶۱ :  
 ۵۶۔ ہزار گھنوی، شید حسن : ۲۹۴ :

# فہرست

## بترتیب تاریخ و فوات

- نمبر ۱۰ / مخلص مقام وفات تاریخ دفن صفحہ
- ۱۔ نائب عظیم آبادی، سید حسن خواہ ..... پٹنہ ..... ۱۹ جنوری ۱۹۷۲ء ۱۵
  - ۲۔ اکمل جالندھری، ارام پرتاپ ..... دلی ..... ۲۰ جنوری ۱۹۷۳ء ۲۰
  - ۳۔ جوان سندیلوی، مستی لال ..... لکھنؤ ..... ۲۵ جنوری ۱۹۷۳ء ۲۴
  - ۴۔ رئیس کوٹلی، نور محمد ..... سیکت ..... ۲۶ جنوری ۱۹۷۳ء ۲۷
  - ۵۔ امجد بھٹی، محمد امجد ..... سنگر ..... یکم فروری ۱۹۷۳ء ۳۰
  - ۶۔ عزیز جالانداری، محمد عزیز الرحمن قوشی، بھالادار ..... ۶ فروری ۱۹۷۳ء ۳۷
  - ۷۔ مجبور شمس، سید عبدالقیوم ..... پٹنہ ..... ۸ فروری ۱۹۷۳ء ۴۱
  - ۸۔ انور، ڈاکٹر منوہر سہاسی ..... دلی ..... ۱۷ فروری ۱۹۷۳ء ۴۵
  - ۹۔ انور سیالکوٹی، احمد الدین (اے ڈی) بکاشی ..... ۲۳ فروری ۱۹۷۳ء ۵۳
  - ۱۰۔ ساگر نگور، بلونت کمار ..... ننگور ..... ۲۵ فروری ۱۹۷۳ء ۶۰
  - ۱۱۔ محمود احمد عباسی امرتسری ..... کراچی ..... ۱۳ مارچ ۱۹۷۳ء ۶۴
  - ۱۲۔ ہند متا تم ..... بیٹی ..... ۲۰ مارچ ۱۹۷۳ء ۷۱
  - ۱۳۔ حمید احمد خان ..... لاہور ..... ۲۲ مارچ ۱۹۷۳ء ۷۶
  - ۱۴۔ امیر میٹھی، جانا اللہ ..... لکھنؤ ..... ۱۹ اپریل ۱۹۷۳ء ۸۴
  - ۱۵۔ اثر حمید آبادی، صدیقی احمد ..... حیدر آباد ..... ۲۷ اپریل ۱۹۷۳ء ۹۴
  - ۱۶۔ خضر شمس، مولابخش ..... لاہور ..... اپریل ۱۹۷۳ء ۹۹
  - ۱۷۔ نثار آبادی، نثار حسین ..... انارک ..... ۶ مئی ۱۹۷۳ء ۱۰۳
  - ۱۸۔ مجید امجد، عبدالحمید ..... ساہیوال ..... ۱۸ مئی ۱۹۷۳ء ۱۱۰

- ۱۹۔ ریاض انصاری، ریاض الدین، دہلی... گوالیار... ۹ جولائی ۱۹۷۴ء ۱۱۷
- ۲۰۔ محمد حسین تحسان... نئی دہلی... ۱۴ جولائی ۱۹۷۴ء ۱۲۳
- ۲۱۔ ساجد صدیقی، محمد اختر... لاہور... ۱۸ جولائی ۱۹۷۴ء ۱۲۸
- ۲۲۔ جمالی، طفیل احمد... کراچی... ۱۲ اگست ۱۹۷۴ء ۱۳۰
- ۲۳۔ شجاع الرحمن، عیسیٰ نامتھو... جھٹ... ۴ اگست ۱۹۷۴ء ۱۳۱
- ۲۴۔ بیزاد کھٹوی، سردار احمد خاں... کراچی... ۱۰ اکتوبر ۱۹۷۴ء ۱۳۲
- ۲۵۔ محشر مرزا پوری، مرزا فرحت علی... الہ آباد... یکم نومبر ۱۹۷۴ء ۱۴۸
- ۲۶۔ تلح گوٹھی، نواب محمد اسماعیل علی شاہ آباد، ٹنک... ۲۱ نومبر ۱۹۷۴ء ۱۵۱
- ۲۷۔ ترچہ پوری، عبدالغنیظ صدیقی... بھیلوادی شریف... ۲۶ نومبر ۱۹۷۴ء ۱۵۷
- ۲۸۔ انور کامٹوی، احاطہ یاد محمد انصاری... کاسمی... ۲۷ نومبر ۱۹۷۴ء ۱۶۲
- ۲۹۔ شاہ معین الدین احمد ندوی... اعظم گڑھ... ۱۳ دسمبر ۱۹۷۴ء ۱۶۶
- ۳۰۔ شیر محمد اختر گجراتی... لاہور... ۳۰ دسمبر ۱۹۷۴ء ۱۷۲
- ۳۱۔ عبدالرحمن چشتی... لاہور... ۱۷ جنوری ۱۹۷۵ء ۱۷۶
- ۳۲۔ دیوان سنگھ مفتون... نئی دہلی... ۲۶ جنوری ۱۹۷۵ء ۱۸۷
- ۳۳۔ بیج الزمان اتید (پروفیسر)... الہ آباد... ۶ فروری ۱۹۷۵ء ۲۰۴
- ۳۴۔ جبرئیل الہی، سید حسن... حیدر آباد... ۱۵ فروری ۱۹۷۵ء ۲۰۷
- ۳۵۔ شمس الدین احمد میرزا... چٹنہ... ۱۸ فروری ۱۹۷۵ء ۲۳۳
- ۳۶۔ امجد حسین، اتید (پروفیسر)... مظفر پور... ۲۳ فروری ۱۹۷۵ء ۲۱۸
- ۳۷۔ شفقت کاظمی، سید فضل الحسن... ڈیرہ غازی خان... ۱۲ مارچ ۱۹۷۵ء ۲۲۵
- ۳۸۔ نسیم کربانی، شمس الدین حیدر... دہلی... ۱۹ مارچ ۱۹۷۵ء ۲۳۳
- ۳۹۔ اعلیٰ ناگپوری، بشیر خان... ناگپور... ۲ مئی ۱۹۷۵ء ۲۴۰
- ۴۰۔ منظر حیدری، دلاور حسین... بکلتہ... ۱۳ مئی ۱۹۷۵ء ۲۴۳
- ۴۱۔ ذوالفقار علی بخاری، تید... کراچی... ۱۲ جون ۱۹۷۵ء ۲۴۸

- ۴۲۔ فخر جان دہری، محمد عبدالجبار خان لاہور۔۔۔۔۔ ۲۲ جون ۱۹۷۵ء ۲۶۱
- ۴۳۔ منظر لکھنؤ، شید منظر حسن۔۔۔۔۔ لکھنؤ۔۔۔۔۔ ۲۲/۲۳ جون ۱۹۷۵ء ۲۶۵
- ۴۴۔ حامد الاکبادی، حامد حسین۔۔۔۔۔ الاکباد۔۔۔۔۔ ۱۰ ستمبر ۱۹۷۵ء ۲۶۶
- ۴۵۔ ن، م، راشد (زند محمد)۔۔۔۔۔ لندن۔۔۔۔۔ ۹ اکتوبر ۱۹۷۵ء ۲۷۵
- ۴۶۔ خوش کاشمیری، عبدالکریم (آغا) لاہور۔۔۔۔۔ ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۵ء ۲۸۷
- ۴۷۔ ہزار لکھنؤ، شید حسن۔۔۔۔۔ کانپور۔۔۔۔۔ ۳ نومبر ۱۹۷۵ء ۲۹۴
- ۴۸۔ طالب دلوی، شیش چندر سکینہ۔۔۔۔۔ دلی۔۔۔۔۔ ۱۷ نومبر ۱۹۷۵ء ۲۹۷
- ۴۹۔ محی صدیقی لکھنؤ، محمد حسین۔۔۔۔۔ بھوپال۔۔۔۔۔ ۱۹ نومبر ۱۹۷۵ء ۳۰۳
- ۵۰۔ بس الاکبادی، سکھدی پرشاد۔۔۔۔۔ الاکباد۔۔۔۔۔ ۲۲ نومبر ۱۹۷۵ء ۳۰۹
- ۵۱۔ قاصر، ابرہیم ناتھوت۔۔۔۔۔ کوئٹہ کبیر۔۔۔۔۔ ۲۵ نومبر ۱۹۷۵ء ۳۱۲
- ۵۲۔ شید مسعود حسن رضوی ادیب۔۔۔۔۔ لکھنؤ۔۔۔۔۔ ۲۰ نومبر ۱۹۷۵ء ۳۲۲
- ۵۳۔ نکیں سرمست، شید محمد قادر الدین۔۔۔۔۔ حیدرآباد۔۔۔۔۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۷۵ء ۳۳۷
- ۵۴۔ میرزا محمود بیگ۔۔۔۔۔ دلی۔۔۔۔۔ ۱۴/۱۵ دسمبر ۱۹۷۵ء ۳۴۲
- ۵۵۔ نجم آفندی، میرزا مجتبیٰ حسین۔۔۔۔۔ کراچی۔۔۔۔۔ ۲۲ دسمبر ۱۹۷۵ء ۳۴۹
- ۵۶۔ طالب رزاقی، محمد قطب الدین حسن۔۔۔۔۔ حیدرآباد۔۔۔۔۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۷۵ء ۳۵۵



## شائق عظیم آبادی، سید حسن رضا

پٹنہ کے منی دادنی لکھنے کی معروف شخصیت تھے۔ ان کے والد شیخ عبد علی حسن عظیم آبادی  
وہاں کے مشہور اور باہر خوشنویس تھے اور شہر میں بڑے خوشی صاحب کے نقب سے معروف  
تھے۔ اس فن میں باقر عظیم آبادی کے شاگرد تھے۔

شائق کی ولادت ۱۹۰۵ء میں ہوئی، ابتدائی تعلیم نجی طور پر گھر کے بزرگوں سے پائی۔ اس  
کے بعد شہر کے مسلم استاد عالم مولانا لائف صاحب سے منطق، فلسفہ، طب، فقہ، حدیث وغیرہ  
حاصل کیے۔ ۱۹۳۶ء میں مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ سے "عالم کی سند" اور ۱۹۴۰ء  
میں الہ آباد یونیورسٹی سے "فاضل ادب" کی۔ پھر ۱۹۴۰ء میں انگریزی کے دسویں درجہ کا  
امتحان بھی پاس کر لیا، حال آنکہ وہ خود اس زمانے میں سرکاری اسکول پٹنہ میں عربی  
اور فارسی کے معلم رہتے۔ مختلف اسکولوں میں کام کرنے کے بعد بالآخر ۱۹۶۵ء میں پٹنہ  
پر سبکدوش ہوئے۔

ان صدی کے ادائل میں پٹنہ سٹی، جہاں ان کی سکونت تھی، علم و ادب اور شعر و سخن کا مرکز  
تھا۔ شاہ عظیم آبادی (ن جنوری ۱۹۲۷ء) عبد الحمید پریشان (دف نگار ۵۰) تن عادی  
(دف، نومبر ۱۹۶۷ء) اور کئی دوسرے حضرات اسی نواح کے رہنے والے تھے۔ غرض  
پوری فضا شعر و فن سے ممتلئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ شائق بھی بچپن سے شعر گوئی کی طرف  
ائل ہو گئے۔ آغاز میں انھوں نے میر باقر عظیم آبادی اور ان کے شاگرد رشتید  
وحید الدین و جید الدہادی سے مشورہ کیا۔ فن خطاطی اور خوشنویسی میں بھی میر باقر  
ہی کے شاگرد تھے ان دونوں سے انے استفادے کا ذکر ایک مقطع میں کرتے ہیں:  
یہی ہے راہنمای سخن کی، اے شائق! جو کھینچنا ہو، تو نقشِ وحید دیا قر تھینچ

ایک اور قطع ہے :

ہے نبی حضرت یا قر سے اتباعِ جدید  
کہ جزئ کے رنگ کا، ثناء تب جواب ہو دسکا

انوس کہ ان کا شعری مجرم ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا۔ اسے ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے سید سعید رضا گہر عظیم آبادی نے "سرمایہ نشاط" کے عنوان سے رتبہ کو کے شائع کیا، چہنہ ۱۹۷۷ء (دو شری کتابیں عظیم آبادی کی محورشہ ادبی مجلس "دریا و گاہِ عشق" (سوانحی شاہ رکن الدین عشق دہلوی ثم عظیم آبادی) ان کی حیات میں چھپ گئی تھیں۔ پہلی کتاب پر بہارِ انجوشین بورڈ نے ایک ہزار روپیہ انعام بھی دیا۔

ان کے چھیارہ اولادیں ہوئیں لیکن بدقسمتی سے نو بے ان کی زندگی ہی میں داغِ مفار دے گئے۔ ان پے درپے حادثات نے ان کا دماغی توازن بخل کر دیا۔ بہت دن کے علاج معالجے کے بعد یہ توازن بحال ہوا تھا کہ اپنے چل چلاؤ کا راز آگیا۔ ۱۹ جنوری ۱۹۷۷ء کو دن کے دس بجے پٹنے میں رخصت کی۔ راتاً شد کو اتنا ایسہ راجہوں، محلہ شاہ کی لٹا میں مثل مسجد کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

حضرت قاتل دانا پوری نے تارِ سخنِ وفات کہی :

ایں غلط ثابت آدہ، صد حیف      قطبِ جہندہ اسے قاتل آڑ جاے  
بہر تارِ سخن آدہ، ندا آدہ      "آدہ ثناء تب، صد آدہ، حسرت بے"

(۱۳۹۳)

تبدیلِ یوسف کے طویل قطعہ تارِ سخن کا آخری شعر ہے :

رحلت کا سن ہے بے سہراہ      "ثناء تب سوے جنتِ رواں"

(۱۳۹۳-۱۳۹۴)

ان کا کلام نہایت ادبِ عیب ہے، مضمون آفرینی کی کوشش نمایاں ہے، غزل کے

علاقہ نظم بھی کہتے تھے۔ چنانچہ مجموعے میں چند نظمیں بھی شامل ہیں۔ خود کے طور پر چلدر شمر طافطہ ہوں،

مل کہتے ہیں وہ ہر دن کل آج نہیں ہوتا

ہے وعدہ خدا ابھی خداے قیامت کا

یہ رات مصیبت کی نلے بھی نہیں ملتی

سٹ جا تا ہے باتوں میں دن بیش و عشرت کا

نہ دیکھا مجھے آنکھ اٹھا کر تو کیا غم شرف تو ملا بزم کی حاضری کا

تھری جو دیر کعبہ میں تھی پہنتی نگاہ منزل نہیں تھی وہ، جسے منزل بنا دیا

گرتے ہیں زرد پتے کر شاخیں ہوں بسیر پھر

پیغام دے رہی ہے خزاں بھی بہار کا

انسا بھی آشیانہ کبھی شاخ گل پہ تھا بندے بھی لطف اٹھایا ہے فصل بہار کا

مرے گاہ ہیں پھر بھی شمار کے اندر ترے کرم کا تو کوئی حباب ہو دم کا

وقت یہ کیا آگیا، نام خلوص مٹ گھیا

غیر تو غیر ہی ہوں، دیتے ہیں آشنا فریب

ہیں مسور کیوں اپنے جلوں سے خود چلے کیا ہیں آئینہ خانے سے آب

کہتے ہو کیوں نظر آتا ہوں پریشان بہت

جان کر تم تو بنا کرتے ہو انجان بہت

فریب دینے لگی انتظار کی آہٹ سمجھ رہا ہوں جسے پائے یاد کی آہٹ

ہے آردان جب سہی کیا سبک خدا کہ پیدوں کے گلے ہے سوار کی آہٹ

بھل ہی آئی ہے پری جو اب بے یازوں ہے بانیوں کو یہ روز شمار کی آہٹ

ساتی! ترے کرم کی حلاوت بھی ہے عجیب

کل جو شراب تلخ تھی، وہ انکبیں ہے آج

تغیر گردانی ہے تو ساحل پہ ہے طوفان اندر نگہاں ہے، تو طوفان بھی ہے ساحل

عیش بریں سے روزِ پلشتی ہے نامراد      ہے شکوہِ سنچ ہم سے نغماں اور نغماں ہم  
 زندگی جو کئی کس طرح بسر، یاد نہیں      روزِ شب یاد نہیں، شام و سحر یاد نہیں  
 گن گئی کئی محبت میں یہ کھریاد نہیں      کیسے برباد ہوئے قلب، جگر یاد نہیں  
 جب چاک گریباں ہکلی آتی ہے خوبصورت      خیرِ نیکی پر دے میں ہے تعمیر کا پہلو

زمین و آسمان کا فرق ان دونوں میں ہے پھر بھی

غمِ جاناں سے ہوتا ہے، غمِ دوراں کا اندازہ  
 کس کا ایک دروازہ خدا جی بند کرتا ہے

اس کے فضل سے کھلتی ہے کوئی اور دروازہ  
 دنیا کے مال و زر کی حقیقت ہی کیا ہے رشتہ جو استوار ہو شاقب! خدا کے ساتھ  
 خدا کا شکر ہے وحشت رکھ لی اگر دِل کی

دگر ہم زمانے بھر کو سمجھانے کہاں جاتے  
 فرمائے کس کس سے کوئی دل کو بچائے  
 انداز سے، شوخی سے، تہمت سے، جیاع  
 جب کچھ نہ رہا جامہِ روی کو، تو یہ سو بھی  
 دو چادر گرہ کم کو دن زاہد کی عباس  
 ہے شمع بھی خاموش، پتنگوں کو جلا کر  
 سچ ہے کہ مجبے کام کا انجام برباد  
 جس حال میں وہ رکھے، یہی حال میں خوش ہو  
 بند و سی اچھا ہے، جو راضی بہ رضا ہے  
 داغِ ماضی، چشمِ تنہا، قلبِ وارفتہ  
 انھیں غفلتوں سے ہم شرحِ کتابِ زندگی لکھ  
 بارِ گلشنِ مستی خزاں کے ساتھ نہ جاتا  
 جو دیکھے گریہ شبنمِ وہ چھوٹوں کی شہی سبھ  
 دے پاؤں نسیم آکے کہ جاتی ہے کچھ سب سے

چمن کی جو کھلی ہے، رازِ دہاں معلوم ہوتی ہے

چھتا تلوے میں کاٹا اور خلشِ دل میں موٹی پیدا

کہاں تکلیف پہنچی ہے، کہاں معلوم ہوتی ہے

دیکھو اور کوئی دوسرا باتیں ہوں تو ان کی غلوں

یہی اک داستان سینے میں اک داستان کہیے

درواہوں تھے کل تو ہجرت الے جابلے! پھر اس گلی میں جانے کو تیار کیوں ہوئے؟

دیکھتے ہیں جو تھارے گیسو ورنے کی بہار صبح الی کی صبح ہے اور شام الی کی شام ہے

کیا بناؤں آپ کو تاریکی روزِ فراق صبح سے معلوم ہوتا تھا کہ وقتِ شام ہے

ماٹھے کاہل سمجھتے ہیں جس بچہ و تاب کو زمین ہے گیسوؤں کی اسی بچہ و تاب ہے

## اکمل جاندھری، رام پرتاب

اگرچہ ان کا خاندان مشرقی پنجاب کے شہر جاندھری کا رہنے والا تھا، مگر چونکہ ان کے والدین دہلی منتقل ہو گئے تھے، اور اسی سلسلے میں یہاں مقیم تھے، اس لیے رام پرتاب کی ولادت یہیں لکھنؤ میں ۲ فروری ۱۹۰۷ء کو ہوئی۔

ابتدائی تعلیم کے بعد ڈی اے، دی کالج، لاہور میں داخلہ لے لیا، لیکن ان کے بعد سلسلہ منتقل ہو گیا اور انھوں نے اکتوبر ۱۹۲۷ء میں ریلوے کے محکمے میں ملازمت اختیار کر لی۔ یہیں شعر گوئی کے شوق کو فروغ ہوا، جس کی طرف وحمان طالب علم کے زمانے ہی سے نمایاں تھا۔ ان کے ابتدائی اسکوٹی میں پنڈت یوگ راہ نظر سودھوئی بھی مدرس کے نظر اچھے شامل تھے۔ وہ زیادہ تر مذہبی مضامین لکھتے تھے؛ ان کا گیتا کا منظوم ترجمہ چھپ چکا ہے۔ اسی باعث شہر سیاسی زندگی میں بدرفتار ہوئے، البتہ ان کے بڑے تراجم تھے۔ نظر نے نوجوان رام پرتاب کا میلانِ طبع دیکھ کر ان کی حوصلہ افزائی کی؛ اکمل متخلص بھی انھیں کامیاب تھا۔

ملازمت کے بعد باقاعدہ شہر کہنے کا موقع ملا تو انھوں نے رضا علی خان رضا آبادی سے اصلاح لینا شروع کی جو انھیں کی طرح ریلوے ہی میں ملازم تھے۔ حسن اتفاق سے ان زمانے میں ریلوے کے اس دفتر میں کئی شاعروں کا اجتماع ہو گیا تھا۔ مثلاً عبدالغنی، نہال بیولہ روی بھی یہیں تھے اور اکمل سے ان کی گاڑی چھٹی تھی۔ نہال بہت اچھا کہتے تھے؛ اور ان کا سائل دیوی کے نمائندہ شاعروں میں شمار ہوتا تھا۔ وہ بادل ناخوش تقسیم ملک کے بعد پاکستان گئے تھے اور وہیں کراچی میں جنوری ۱۹۵۲ء میں ان کا انتقال

ہوا۔ منور کھنوی بھی اس زمانے میں یہیں تھے۔

پوری عمر بلوے کی ملازمت میں گوری۔ یہیں سے ۳ فروری ۱۹۶۷ء کو سکندرشہ پور  
اس کے بعد بسرفوات کے لیے دلی کی ایک ٹرانسپورٹ کمپنی میں ملازم ہو گئے تھے۔  
اتوار ۲ جنوری ۱۹۷۷ء کو انتقال ہوا اور ۴ جنوری کو جسدِ خاکی نذر آتش کر دیا گیا۔  
اولاد میں صرف ایک بیٹا رنگو ہرنندی چھوڑا۔ یہ سیندری فیکٹری میں ملازم ہیں۔

انتخابِ کلام: کسے نکل ان کی زندگی میں چھپ گیا تھا دلی ۶۶ ۱۹۶۷ء غالب کے شعر  
کا تلازمہ پورا کرنے کو دو اور مجموعے "مالِ دل" اور "دو سرخ" بھی شائع کرنا چاہتے  
تھے، لیکن یہ آرزو پوری نہ ہو سکی، حال آں کہ دونوں مرتب ہو چکے تھے۔

ان کے کلام میں کلاسیکی رجحان اور محنتِ زبان کے ساتھ جدید رجحانات کا نیا بھی جلا  
ہے۔ وہ نظری شاعر تھے اور ان پر زبردست گاہِ تنقید، تو لیتھیا اس سے ہمیں زیادہ شہرت حاصل  
کرتے جو انھیں نصیب ہوئی۔ چند شعر ملاحظہ ہوں،

جب آئیاں ہی اپنا چمن زار میں نہیں کیا شاخ سے غرض ہمیں مطلبِ ثمر سے کیا  
میں ناشائستہ غمزدہ و حرم نہیں نسبت انھیں گر ہے تھے رنگِ دے سے کیا

ہمیں کیا، مگر خزاں کا دور ہو یا موسمِ گل ہو

خزاں کا غمِ توان کو ہو جو کھیلے ہو جانِ دل سے

اب اس پر بھی کوئی ہنسنے کے، تو کچھ علان نہیں چرخِ راہ تری رنگدہر ہوئی تو ہے  
کرم نہیں نہ ہی، میں کرم سے درِ مگردا یہ کیا ہستم پیکھی مائل شمعِ شاعر نہیں

طریقِ عشق میں جب سرورِ دہشتی شرطِ اول ہے

تو پھر عشاق کا منزل بمنزل امتحاں کیوں ہوا

یہ مانا نغمہ زن ہو تم، مرے سادِ تصور میں

مگر سادِ تصور کا بھی پردہ دریاں کیوں ہوا

ہزار داغ ہیں اودمان میں دل ہے یوں جیسے

کئی جائزوں میں اک سوگوار کا عالم

گور جائے اب دامن بچا کر ہر بشر مجھ سے      ناز نہ پھر گیا، کیا پھیر لی تہ نے نظر مجھ سے  
مے دم سے جان زندگی میں زندگی ہی ہے      خدائے کر ہے، یہ دنیٰ شام و سحر مجھ سے  
زبان دل میں یہ کیا تفرقہ والا محبت سے      کڑل کچھ اور کہتا ہے 'زبان کچھ اور کہتی ہے  
کچھ تم پہ نہیں موقوف ہوئی دنیا میں ہمارا ہونہ سکا  
تم ہم سے کنا ما کر بیٹھے، ہم سے تو کنا را ہونہ سکا  
جال انگوہ انیاں لینے لگا ہے      ہمارا دل ہمارا اور کب تک !  
بجز اس کے کیا ہیں یہ اشک و راز ہیں      وہ آنکھوں کا قلعہ، یہ غم کی کہانی  
دش پر کھری مولیٰ لعل پریشاں دیکھیے      پھر ہونے میری پریشانی کے سامان دیکھیے

## بنت

یوں کر دیم وہ اشہب یل دنہار نے      فطرت چلی ہے دیم کو جہاں کو نکھار نے  
انا نقاب رخ سے عروس بہا بنے      جلوہ دکھا دیا کسی رنگیں عذار نے  
ہر شاخ، ہر شجر کی ادا میں بدل گئیں      بنا وہ رخ فضلے، ہو ایں بدل گئیں  
ہر پھول ہر کلی میں لطافت کا جوش ہے      ہر نخل گلستان جہاں سبز پوش ہے  
صحن چمن میں باد صبا میفروش ہے      غرق نے نشاط ہے جس کو بھی ہوش ہے  
ہر سمت بغض مافی محبوب عام ہے      ہر چشم مست بادہ گلگوں کا جام ہے  
صہا ہے تگ و پیر ہے دوا ہوا جان      موج ہوا میں کیف ہے تاب ہے رواں  
یوں بار غلہ میں زینیاں کہاں      جو گلستان ہند کے پھولوں میں ہیں ناں  
ہر ذرہ آفتاب ہے اس سرزمین کا      کیا حسن لا جواب ہے اس نازنین کا  
دنیا نہیں یہ گلشن جنت ہے ہو بہو      ہر سمت ہے تلاطم امواج دنگ دنگ



ہر لب پستیوں کے ترانے ہیں چار سُو      مگانے لگے بسنت جو انانِ خواص گلو  
 بزمِ جہاں میں عیش و طرب کا ہجوم ہے  
 دیکھو جدھر، بسنت کے آنے کی دھوم ہے  
 یہ دوسرے عجیب، سماں لا جواب ہے      احباب بیگسار میں شغلِ شراب ہے  
 ہر جام میں تجلّی صبا کے تاب ہے      ہر دل بقدرِ ذوقِ طلبِ فیضِ یاب ہے  
 اتنی ملی ہے مے بجے جتنی انگ ہے  
 اس حسنِ امتیاز پر ہر شخص ہنگ ہے  
 ہے دیدنی جو رخِ چینوں کے نور ہے      جس مہوش کو دیکھیے وہ رشکِ نور ہے  
 مستانِ آنکھوں میں وہ کیفِ دسور ہے      گویا تھے میں سخن کے، خود حسنِ چور ہے  
 ہر ایک ناز میں سے بسنتی لباس میں  
 نے جیسے زعفران کی بھری ہو گلائیں

## جوان سندیلوی، مئی لال

۱۸۸۹ء میں سندیلہ (ضلع ہردوی) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد گلاب رام شاہ تجارت پیشہ تھے۔ مئی لال نے بمشکل آنکھوں میں درجے تک تعلیم پائی تھی کہ اس کے بعد اپنے والد کے بیروں کے کاروبار میں ملوث نہ بنے۔ جب والد نے نقل مکان کر کے کھنوا میں سکونت اختیار کر لی، تو یہ بھی ان کے ساتھ چلے گئے۔ اس کے بعد نجی طور پر اردو اور فارسی میں کچھ جہادتا پیدائش ہوئی تھی۔

انھوں نے ۱۹۰۶ء میں شعر کہنا شروع کیا شروع میں میر تقی میری سب سے شہرہ مکتے رہے اور ان کے انتقال کے بعد انور حسین آزاد و لکھنوی (ف: اپریل ۱۹۵۱ء) کے حلقہ ملازمہ میں شامل ہو گئے۔ یہ تعلق محض حسن اتفاق سے پیدا ہو گیا۔ سندیلہ میں فنی فضل رسولی واسطی سندیلوی کا سالانہ عرس بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک مجلس مشاعرہ بھی منعقد ہوتی، جس میں شاعر کے لیے دو در سے شہر حضرات بلائے جاتے۔ ایک مثالوں میں تیدا انور حسین آزاد بھی آئے۔ شعر کے اختتام پر تیدا انعامات رسولی ہاشمی تعلقہ داسے ان کا تلمذ اختیار کیا اور انھیں اپنے پاس روک لیا۔ اس کے بعد آزاد و متواتر گیارہ برس تک ہاشمی صاحب کے اہم سے وابستہ رہے۔ سندیلہ میں ان کے قیام کے زمانے میں یہاں کے بہت اہم کام نے ان سے اصلاح لینا شروع کی۔ ان میں جوان بھی تھے۔ ۱۹۲۰ء میں تیدا انعامات رسولی ہاشمی کے انتقال کے بعد آزاد و سندیلہ سے نکلے اور بعض فلسافوں کی دعوت پر مستقلاً مکملہ میں مقیم ہو گئے۔ اس پر جوان نے بھی دہلی کی سکونت اختیار کر لی۔

تاکہ استاد پورے طور پر استفادہ کوسکیں۔ سکتے ہیں بھی انھوں نے تجارت میں کو  
اپنی بسر و قاتل کا ذریعہ بنایا۔ ۱۹۶۱ء میں کلکتے سے لکھنؤ واپس آئے۔

آزاد کی زبان و بیان اور عروض سے اس پر اندازت لہاں خود خاص و عام میں  
علوم میں بھی جوان اپنے استاد کے شاگردِ رشید ثابت ہوئے۔ چنانچہ بعد کو بہت شاگردوں  
نے ان سے بھی فیضان حاصل کیا۔

بروز جمعہ ۲۵ جنوری ۱۹۷۲ء کو شام کے چھ بجے اپنے مکان محلہ حسن گنج، لکھنؤ میں  
انتقال کیا۔

جوان کی شادی شالیمار پور میں شریستی رنج رائے سے ہوئی تھی جن کا ۱۳ اپریل ۱۹۰۰ء  
کو بھارنہ فانیج لکھنؤ میں انتقال ہوا۔ ان کے پانچ اولاد ہیں، لیکن چار تھے ان  
کی زندگی میں فوت ہو گئے تھے۔ ایک بیٹا فری آند بہاری لال گپتا اپنی جہان  
یادگار بھوڑا ہے، بیوی حکومت کے محکمہ مالیات میں ملازم ہیں۔

کلام کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں، کلیاتِ جوان حصہ اول عرف حسین چراغاں  
(۱۹۶۲ء)؛ کلیاتِ جوان حصہ دوم عرف شوخ غنچ (۱۹۶۴ء)؛ کلیاتِ جوان حصہ  
سوم عرف چراغِ قاف (۱۹۶۶ء)؛ سوزِ دل (دس قطعیں)؛ رباعیاتِ جوان؛  
خوشترنگ چلوں (غالب اور آزاد کے اشعار کی تضمین)؛ فرادہ جوابِ فریادِ بھڑکے ہوئے  
شکوہ (از اقبال) مع غزلیات؛ رام بن باس وغیرہ۔

انھوں نے پاد مرثیے بھی کہے تھے۔ شہادتِ امام حسین علیہ السلام؛ دردِ رحِ سفر  
عون و محمد؛ دردِ رحِ حضرت عباس علیہ السلام؛ دردِ رحِ حضرت علی اہل۔ یہ بھی شائع  
ہو چکے ہیں۔

تفصیلِ مصافات اور آئینہٴ بخور (کلکتہ ۱۹۵۸ء) اپنے شاگردوں کے لیے نثر میں  
بھی تھیں۔ اسی سلسلے کی ایک مختصر جہز "حضرت آزاد کی اصلاص" (شاگردوں  
کے کلام پر) ہے۔ بعض چیزیں بچوں کے لیے بھی ہندی اور اردو میں شائع کی گئیں۔  
آخری عمر میں مالی حالت کچھ کمزور ہو گئی، تو حکومتِ یوپی نے ان کا ۶۰ روپے ماہانہ

ادبی و خلیفہ مقرر کر دیا تھا، جمہوریت تک لٹا رہا۔

کلام بختہ اور بے عیب ہے چند شعر روحِ ذیلی ہیں۔ ان کی ذہانت سے ایک خوش خلق،  
ملکسر مزاج اور دصفا، ان شخص اٹھ گیا۔

پروانہ بن کے کام کسی نے نہ آسکا۔ اندر شمعِ رونق محفل نہیں ہوں میں  
کیلیم و طور کا افسانہ سن کر بھی دہی دھن ہے

جو ان! بشارت ہونے پر بھی نادانی نہیں جالت

ابھی تو موسیٰ باغشی کا شکوہ، پلک جھپکنے ہی کا ٹکڑہ ہے

جواب کی پردہ کسی نے اٹا، تو یہ سمجھ لو کہ فیصلہ ہے

جنونِ عشق کی کار فرمائی نہاں ہے خندہ نگل میں

گر بیاں سے عیاں ہوتے گر بیاں ہم نے دیکھا ہے

دیوانہ الفت کی، جواں! شان میں ہے ہاتھوں میں ہے تمہارا، تو ابو بتا ہے سر سے

ادھر یہ فکر، ادھر یہ فکر، ادھر یہ فکر، ادھر یہ فکر، ادھر یہ فکر، ادھر یہ فکر

ہم بھی کسی کے ماتھے بدلتے رہے مزاج چلتا پڑا زمانے کی رفتار دیکھ کر

بازو میں جب سے زور دہائی کا آگیا آتی ہے خرم خود کو گرفتار دیکھ کر

مزا قبول، بات سے پھرنا نہیں قبول آگے بڑھیں گے ہم رسنا دار دیکھ کر

گزر جا اپنی حد سے اس طرح، اے جذبہ الفت

بنائے جو ہیں مجبور، خود مجبور ہو جائے

اس طرح جنوں کی جانچ کرے، نیربایہ نہیں فرزانے کو

سوچو تو ہیں، کیا کرتے ہو، دیتے ہو پھری دلیانے کو

گھٹلے، چمن ہے، بہا دیں ہیں، پھر بھی جو ہم چلتے ہیں، وہ سامان نہیں ہے

عفت کر کے انجامِ محبت پر نظر کیسی! یہ اب کیوں پوچھتے ہیں، کیا کام کیا ہوگا؟

خطا دنیا میں کی تھی، روزِ محشر تذکرہ کیوں ہے؟

کہاں کی بات، چھپی جا رہی ہے، اب کہاں مجھ سے

## قیس کوٹوی، نور محمد

کوٹہ (راہستان) کے ایک غریب گھرانے میں ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ گھر کے حالات بہت نامتلی بخش تھے۔ ان کے والد نے جب دیکھا کہ کوٹہ میں ذرائع بسر اوقات کی بہتری کا امکان نہیں تو ہجرت کر کے موضع "لوڑادیت" چلے گئے، جو کوٹہ سے ۳۴ میل دور نسبتاً خوشحال جگہ ہے۔ یہی اپنے چاروں بچوں کے ساتھ کوٹہ ہی میں مقیم رہیں لیکن خوشنکی گھات میں تھی۔ کوٹہ میں سیفہ دہائی صورت میں پھوٹ پڑا۔ اس میں قیس کی والدہ اور دو بھائی اہلک کر گئے۔ اس وقت قیس بمشکل دس برس کے ہو گئے۔

اس حادثہ کی خبر بوڑھا دیت پہنچی، تو ان کے والد کوٹہ آئے اور بقیہ سیفہ خاندان کو اپنے ساتھ لے گئے۔ یہاں قیس کو ایک مقامی سرکاری ہندی اسکول میں داخل کیا گیا، جہاں انھوں نے ہندی میں کچھ شہرہ حاصل کر لی۔ اس کے بعد وہ ہندی میں دوپے، چوپائیاں وغیرہ کھنے لگے۔ اس زمانے میں وہ فوراً خلیص کرتے تھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے اپنے طور پر اردو پڑھنے کا کچھ انتظام کر لیا۔ اسی دوران میں شادی بھی ہو گئی۔

وہ ۲۰ برس کے تھے کہ بوڑھا دیت سے اپنے مسقط الرأس کوٹہ واپس چلے آئے۔ لیکن اصل مسئلہ دہکا و کا تھا، یہ نہ بوڑھا دیت میں ملا، نہ کوٹہ میں۔

۱۹۳۲ء میں فضل حسین شاہ بہت کھنوی کے حلقہ تلمذ میں شامل ہو گئے۔ ثابت اب زبان اور صاحب فن استاد تھے۔ انھوں نے ان کا خلیص نور بدل کر قیس کر دیا۔ قیس کو ان سے مشورہ کرنے سے بہت فائدہ ہوا۔ ان کی تعلیم ناقص تھی، اور شاعری علم و فن

کے پیغمبرِ مکیں ہے ثابت نے قیس کی یہ کسی دوری کرنے میں جو محنت کی، اس سے انکار ممکن نہیں۔ ۱۹۴۱ء میں ثابت کا انتقال ہو گیا، تو ۱۹۴۲ء میں قیس نے سیاح اکبر آبادی کا دامن تھاں اور ان کی وفات (جنوری ۱۹۵۱ء) تک انھیں سے وابستہ رہے۔ ان اساتذہ کی تربیت پھل لائی۔ ۲۸۔۲۹ اپریل ۱۹۶۵ء کو مقامی ارباب اُردو نے کوٹ میں شاندار پرانے برجسٹن قیس منایا، اُردو کے مشہور و معروف شاعرینِ شہادت آئندہ نائن ملانے اس تقریب کی صدارت کی۔ اس موقع پر گیلادہ سولہ پے کی تحصیل بھی قیس کی خدمت میں پیش کی گئی تھی۔

میر و دھما دی بدستور قائم رہی۔ اس پر دراجتھان۔ اسمتیہ اکاڈمی نے ان کا دھیلہ مقرر کر دیا۔ یہ بھی صرف دس برس کا۔

آخری قیام میں کوثر سے ۲۰۔۲۵ میل دور ایک مقام سکیٹ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہیں بروزِ ہفتہ ۲۶ جنوری ۱۹۷۷ء (۲۱ محرم ۱۳۹۶ھ) کو پیامِ مرگ آ پہنچا۔ ان کے استاد بھائی مفتوح کوٹوی نے قطعاً تا رنج وفات کہا۔

ہوا ہے دل کو بہت بھر قیس کا صد  
بھے جو یہ خبر مرگ پر طال ملی  
شہیدِ عشق خدا "مخزنِ تواضع" بھی  
صفاتِ قیس سے تادریخِ انتقال ملی  
(۱۳۹۴ھ) (۱۹۷۷ء)

خانگی زندگی بھی کچھ امینانِ بخش نہ تھی، بلکہ ایک مرتبہ انھوں نے اسے "نباتِ تلخ" کہا تھا۔ اولاد میں تین بیٹے (محمد اسحاق، فہیم احمد فہمی، ریاض احمد ریاض) اور ایک بیٹی اپنی جانی یادگار چھوڑے۔

قیس خالص غزل کے شاعر تھے۔ اگرچہ انھوں نے کچھ نظمیں بھی کہی ہیں، لیکن سچ یہ ہے کہ ان میں وہ کیف نہیں جو ان کی غزل کا حصہ ہے۔ انھوں نے ان کا مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا۔ بعض رسائل میں جو کچھ ملا اس کا انتخاب پیش کر دیا ہوا۔

قیس میری زندگی دعوت بھی ہے اک مراب

بیتے جیتے، مرتے مرتے، ہی پریشاں ہو گیا

بحود وثوق میں دیر و حرم کے ہیں فنانے در

زہے قسمت کہ میرا ایک سر ہے، آستلے نہ

قیانہ ختم ہوگا وعدہ: فردا پہل اپنا قضاے ناگھانی کو ابھی دو دن تک نہ

نیشیں میں کیا تھا کہ برقی محبت گئی، اور پھر آسمان تک نہ پہنچی

ختم ہے قیس! جنوں کو حشر و سودا پھر کون تو جھٹکا مرے بعد بیا باؤں کو

دیکھا، قیس بھی جنوں نہ کہیں سو جائیں اس کے کوچے میں پھر کرتے ہیں دیوانے سے

جدھر جاتے ہو تم اسے قیس ہنسب جنوں سمجھتے ہیں

زرا اہل نظر کی قد زوالی دیکھتے جاؤ

سوز غم حیات سے اپنا ستا ملا دل کیا ملا کہ محرم را نہ بقا ملا

اسنا عشق بھی یہی، انجام عشق بھی یہی پہلے بھی انتظا تھا اب بھی ہوں انتظا میں

اُنہیں کتنی کتنی پھر اس گلستاں میں بہار جو خزاں آنے سے پہلے ہی بیا ہوا ہر گھبرا

شمس و قمر ہیں، تو کوئے بھرے کاٹھا آتش دگ بوز دا خاکِ بشر میں ہے

یہی اظہارِ محبت کا ہے انداز عجیب میں ادھر خاموش ہوں اور وہ ادھر خاموش

نقشِ قدم نہ نقشِ جبین کا ہے آبیاز اب کیا بتاؤں، کون تری دگدگ میں ہے

کلو کے انوار اب بھی ہیں نگاہِ حسن میں جس طرف دیکھا نظر بھر کر، چراغاں ہو گیا

نہ جانے کیا تھا مرے بعد، جہیں میں تھاں

ہو زرد بکھر رہے ہیں وہ آستانے کو

موت تک بعد مرنے کے پہنچا اُنے قدموں سے یہاں بھی کاش مرے ساتھ محبتِ نادر ساتھ

بکھرے جاتے ہیں جب آئینہِ تقدیر کے ٹکڑے توچن لیتا ہے گردوں حُسن کی تنویر کے ٹکڑے

میں جیوں ہوں کہ تمجا کس طرح کروں سیرِ عشق

ادھر ہیں دل کے ٹکڑے، اور ادھر تیشہ کے ٹکڑے

یہ جو سے گردشِ ایام ہوتی ہے، گزرتی ہے دو رخشاں ہیں فلک پر وہ مری تقدیر کے ٹکڑے

## امجد نجفی، محمد امجد، شیخ

لنگ کے ایک آسودہ حال خاندان کے فرد تھے۔ ان کے والد محمد یوسف صاحب کا لینے زمانے کے عمار میں شمار ہوتا تھا پہلے وہ یکے بعد دیگرے اڑیسہ کن تین ریاستوں نیٹلگری، ڈھکا، مال، تالچر میں نائب دربان کے عہدے پر فائز رہے۔ تالچر کے بعد ریاست پال کھر میں مقرر ہوئے تھے کہ ڈیڑھ ایک سال بعد خانہ کا حملہ ہوا جس سے جسم کھایاں حصہ بیکار ہو گیا، اور دو کام کاج سے محروم ہو گئے۔ بارہ برس بسترِ علالت پر رہنے کے بعد ان کا ۱۹۲۳ء میں انتقال ہوا۔

محمد یوسف صاحب اڑیسہ علاقہ اُردو خاسی اور انگریزی میں بھی اچھی استعداد کے مالک تھے۔ اُردو میں شعر بھی کہتے اور یوسف تخلص کہتے تھے۔ وہ داغ اور اس کے طرزِ کلام کے عاشق تھے۔ تذکوں ان کا کلام دامنِ گلچیں ”اور پیام یار“ میں چھپ رہا ہے جو بھی ”کہت یوسف“ کے نام سے مرتب کیا تھا لیکن آخری آیام کی طویل علالت اور بچھری کے دوران میں یہ ضائع ہو گیا۔

نجفی انھیں محمد یوسف کے دوسرے بیٹے تھے۔ ان کے بڑے بھائی کا نام محمد احمد تھا۔ نجفی ۲۹ اکتوبر ۱۸۹۹ء کو لنگ میں اپنے آبائی مکان (محلہ بخش بازار) میں پیدا ہوئے جو بعد کو ان کے والد کی علالت کے زمانے میں خالی لگ گیا۔ جب سنی شعور کو پہنچے تو حسبِ معمول بڑے لاڈ چاؤ سے لسم اللہ ہوئے۔ پھر مدرسہ اسلامیہ میں گئے اور اس کے بعد مقامی رومن کیتھولک ڈل اسکول میں داخلے کیا۔

دوسرے کے امتحان کے لیے پیارسی مومن اکیڈمی، لنگ میں داخل ہو گئے۔ اسی زمانے میں



طبیعت شہرگوئی کی طرف مائل ہوئی، غاویہ زیادہ تر توجہ غزل پر مرکوز رہی اور اس میں اپنے حلقے کی پلٹن مسجد کے پیش امام محمد حبیب اللہ تیسیم چیلوہی سے مشورہ کرنے کے شہر فرخ میں غفلت اجمہ تھا؛ اب تیسیم کے کہنے پر اسے ترک کر کے کبھی دیکھ دیا۔ کوئی سال بھر بعد تیسیم نے پیش امامت چھوڑ دی اور تجارت کا پیشہ اختیار کر لیا اور اس سلسلے میں دنگوں پہلے گئے۔ انہیں کو اقبال سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ بذریعہ خط و کتابت ان سے اپنے کلام پر اصلاح لیں۔ لیکن اقبال نے حسب معمول مال دیا اور دیکھا کہ سب سے بہتر استاد سائنہ کے کلام کا مطالعہ ہے؛ آپ بھی یہی کریں۔ اب انہیں نے اپنا نام صیغہ ساز میں دیکھ کر اپنے والد سے اصلاح لینا شروع کی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانے میں انہوں نے مولوی رحمت علی رحمت (والدہ کرامت علی کرامت؛ ف: ۱۹۶۳ء) سے بھی کچھ استفادہ کیا۔ بعد کو جب فارسی میں کچھ کا شوق ہوا، اس کو اس میں حافظ شمس الدین احمد میری شمس (ف: ۱۹۷۵ء) سے مشورہ ہوا، جو اس زمانے میں راونشا کا بیج، کنگ میں تھان کے مدرس تھے۔

ان کی تعلیم متحرک مکمل نہیں ہوئی تھی کہ ترک بوالات اور سرکاری اسکولوں اور کالجوں کے بائیکاٹ اور ہڑتالوں کا دور شروع ہوا۔ یہ بھی اسی ویلے میں بہ گئے اور جلیوں میں اپنی اور دوسروں کی سیاسی غلطیاں منانے لگے۔ بکری کے ہاں کتب تک خیر منافی، آخر گر قرار ہوئے اور جیل کی ہو اکھا لہڑی۔ جب رہا ہوئے تو ان کے والد نے انہیں اپنے چھوٹے چھائی شیخ محمد محمود شریف کے پاس رانگی بھیج دیا، جو وہاں کسی دفتر میں میڈیکل کرک تھے۔ اس کے علاوہ ان کی پیشہ شہر کی دکان بھی تھی۔

۱۹۶۲ء میں رانگی سے واپس آئے تو انہیں کنگ میں ریلوے کے محکمے میں ملازمت مل گئی۔ یہاں انہوں نے بزم ادب کی تشکیل کی اور اس کے اہتمام میں شاعرے کرتے رہے۔ پھر دو کو موافقہ خرمہ مراد، جس نے تبادلہ ہو گیا، یہاں بیگ مسلم کلب "تام ک" اور ڈرائے تشکیل کرنے کی طرح ڈالی۔ اس زمانے میں آغا شہر کا طوطی لانا تھا۔ چنانچہ پہلے انہوں نے شہر کے متعدد ڈرائے ایلیج کیے، ان میں ادکاری بھی کرتے اور کھیل میں

چاہیہ۔ ساری کے فرائض بھی انجام دیتے۔ پھر خود دوائے نکلنے لگے۔ انھوں نے چار ڈسٹے نکلے۔ اور انھیں اپنے پیٹ بھی کیا تھا۔ یہ نصیب بادشاہِ دارالامیاب تلوار، کشتور کاٹا، آفتاب کا کوڑا، ہر سببِ خودکشی پر مہیا ہوئے۔

ریلوے کی ملازمت کے سلسلے میں ان کا قیام ۱۹۲۲ء میں گومٹیا میں بھی رہا۔ اسے آج کل گوردی جھانیا کہتے ہیں) اور ۱۹۲۶ء میں راج آٹھ گڑھ میں۔ ۱۹۳۰ء میں ان کا دفتر (لوکوموٹو) آندھرا پھل ہو گیا، اور یوں وہ "الشیر" پہنچ گئے۔ یہاں بھی انھوں نے بعض اصحاب کے تعاون سے "نجم ادب" قائم کی، جس کا نام بعد کو بدل کر "اردو مجلس" ہو گیا (یہ آج تک قائم ہے) وہ ۱۹۳۱ء سے ۱۹۵۵ء تک اس کے صدر رہے۔ اس مجلس کے زیراہتمام باقاعدہ مشاعرے ہوا کیے، جبکہ انھوں نے کل متباددہ کانفرنس بھی کی۔ ڈائریکٹر کے قیام کے دوران یہیں انھیں فائیس میں شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا۔ انھوں نے بھی نکلے اور فرائض مضمون بھی۔ ان کا وائس کے قیام کا زمانہ ان کی ادبی تربیت اور کثرتِ وکیت، غرض ہر پہلو سے بہت اہم ہے۔ اکتوبر ۱۹۵۴ء میں ملازمت سے منسوخ ہو کر وکیت ہوئے۔ منسوخ قلیل تھی؛ اس لیے حکومت اڑیسہ نے انھیں ۵۰ روپے ماہانہ کا ادبی وظیفہ عطا کیا۔ اس زمانے میں انھوں نے "مائب" اور "سینو گرانی" لکھانے کا ایک اسکول جاری کیا، جس کا نام سنی کرشیل کالج رکھا تھا۔ اس سے بھی کچھ آمدنی ہو جاتی تھی۔ تنگی ترشی سے گزر بسر ہوتی تھی۔ لیکن اس صورت میں بھی قناعت اور خودداری کا یہ عالم تھا کہ کبھی کسی عزیز سے مدد لینا گوارا نہ کیا۔

جیسا کہ بیان ہوا ان کی تعلیم ناقص رہ گئی تھی۔ لیکن انھوں نے محنت اور مطالعے سے اس کمی کے پورا کرنے کی کوشش کی۔ بعض بزرگوں کی صحبت سے بھی مدد ملی۔ مشق و مزا دلت سے انھوں نے اپنی ترقی کر لی کہ بالآخر ان کا آؤد کے قادیان کلام شاعروں میں شمار ہونے لگا۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ وہ اس قدر اس آریس کے مسلم اثبات استاد تھے ان کے کلام کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں؛ "طلوعِ بحرِ رنگ" ۱۹۶۱ء جو ۷۰ کہکشاں، "رنگ" (۱۹۶۶ء) نظم و نثر کا بہت سراہا غیر مطبوعہ رہ گیا۔ وہ ۷۰ توں گنگ کے وہابی شاعر

کے مرید بھی بارہا جیسے انھوں نے ۱۹۶۵ء میں جاری کیا تھا۔  
 انھیں ۱۹۷۱ء سے شوقِ انفس کی شکایت تھی؛ یہ بڑی گھلا دینے والی بیماری ہے۔ اس  
 سے بہت خف و خزاں ہو گئے تھے۔ ۲۱ جنوری ۱۹۷۱ء کی شب میں ایک شاعر سے  
 واپس آتے ہوئے سردی لگ گئی۔ جاڑوں کا زمانہ، دمہ کے مریض اور اس پر انفلوئنزا  
 اور دوسرے۔ اسی میں بروز جمعہ کیم فروری ۱۹۷۲ء کی شہیک ایک بچے والی آجمل کو  
 بیک کہا۔ جمہور نماذ شرع ہونے سے پہلے حیطینے حاضرین سے ان کی صحت کے لیے  
 درخواست کی تھی۔ اتنے میں یہ اپنے اللہ کے حضور حاضر ہو گئے، تو نماز کے بعد ان  
 کی مغفرت کی دعا کے لیے کہا گیا۔ ۱۔ اللہ و اتنا ایہ راجعون۔ جمعہ کی فیصلت  
 سے فیضیاب ہونے کے لیے خوری تجیز و کلین کا انتظام کیا گیا، ان کے سب احباب کو  
 اطلاع بھی نہیں دیا جاسکی۔ اس کے باوجود خانہ کے ساتھ بہت بڑا مجمع تھا۔ قدم  
 رسول (دو گاہ بازار) گنگ میں قبل مغرب دفن ہوئے

ان کے کئی احباب نے تادمِ دفات کی۔ ایس ام کے قطعے کا آخری شعر ہے

نہیں کیا کہوں تادمِ پردہ داری دوست  
 ”بڑا ستم ہے حجابِ دل و نظیر ہونا“

(۱۹۷۴)

فیاض گواہیادی کہتے ہیں:

ہے دعاے مغفرت فیاض! تادمِ دفات  
 ”امجد بھی ہو جہز و شاخارِ خلد کہ“

علامہ جمیل مظہری کا قطعہ ہے:

نہی خنوشاں! آخر مطلع کشتک  
 جس سے افق تھا بانگ کل زشالِ تاجوب  
 کہتا ہے اس کی موت پر تیرگی دیا و فن  
 کیے کہ ”آہ کہ آج بختِ وطن ہوا غد“

(۱۳۹۴)

ان کی شادی اپنے منہ بولے حجام شیخ محمد یعقوب کی صاحبزادی (فریب النساء) سے ہوئی تھی، اولاد میں تین بیٹے اور چار بیٹیاں ہوئیں۔ وہ چھوٹے بیٹے (محمد رفیع اور محمد وسیع) ان کی زندگی ہی میں انتقال کر گئے تھے۔ بے شک محمد رفیع اور چاروں بیٹیاں (محمد، زینت، سعیدہ، شادیہ) انا اللہ جانتا ہوں۔

نومنے کے چند شعر ملاحظہ ہوں :-

ہائے، اس ہوش کی جلوہ گسری کل رات کو  
ان کے حسن و خلق پر، اتنی نازاں تھی زمیں  
ہائے، وہ تو رستہ تر شاہو اس کا بدن  
اس کی آنکھوں میں وہ جادو، اس کی پرتو  
انکے تھے گلستاں سے لالہ و سرود دامن  
غلاب ز اطر پے شور و درداہم العبد  
عقل انجم میں ڈھلتی تھی شراب و نگہ نواز  
اس کے نیلے جسم پر وہ خود دھوی کا چاند  
کلبہ اجڑاں مرا، تجا خیرت بزم طرب  
ہو رہی تھی نور کی بادشہ درود و وار پر  
ہائے نازک پر تیس سجدہ و زریاں تجھ طرح  
جذب یوں، پس میراں کر دے ہو گئے تھے حسن و عشق  
دکھائی تھی اس کی خود دھو، ہم گئی تھی اس کی  
صاف میرے کر دیا انکار لینے سے اسے

تھی جنوں آگیاں بہار و بھری، کل رات کو  
کر رہی تھی آسماں سے مہر کی کل رات کو  
ہے حقیقت تھے تباہ آذری کل رات کو  
ہو گیا تھا جامع بحر سامری کل رات کو  
بھاگتی تھی آسماں سے شہری کل رات کو  
اد مذاہن برہیں پر ہے ہری کل رات کو  
لکشاں تھی صورت ماہِ زری کل رات کو  
ہو گیا تھا آسماں نیل پر، کل رات کو  
مٹ گئی تھی میری تیرہ آخری کل رات کو  
صحن تھا آئینہ اسکندری کل رات کو  
میں اہاں بن گئی تھی کاری کل رات کو  
کچھ نہ تھا "من دگر" تو دگر گئی کل رات کو  
تھامے تھامیں چرخ چہری، کل رات کو  
مے رہے تھے مجھ کو تاج قیصری کل رات کو

میر جگر وہ کے یاد آئیگی، لے نہیں اچھے

میری قسمت نے جو کی تھی یاد دہی کل رات کو

آؤ کیوں بیکار نہیں کام کی بات کریں  
یہ اگر چہ ہو کہ ذکر العیش نصفت العیش ہے  
کچھ گزشتہ راحت و آرام کی باتیں کریں  
آؤ، پھر گویے ہوئے ایام کی باتیں کریں

ابتداءے عشق کی وہ سلسلہ جنباںیاں  
اک ذرا انداز زلف مسلسل چھڑ کر  
وہ کسی کے وعدہ جاں بخش پر بچھتی ہیں  
وہ ذور اشتیاق دید، وہ ذوق نظر  
یاد تو کر لیں ذرا سنجھتے جس کی راجتیں  
دمے نہ لگیں، وہ بزم کیف، وہ سرشاں  
جذبہ شوق شہادت کی سنائیں مرگوشہ  
اجرا کچھ کہے اپنے عشق کے آکار کا  
کس طرح ہم نے جلانی تھی یہاں شمعِ امید

یہ جان فانی ہے، بھی ہے یہاں کس کو ثابت  
آؤ، کچھ اپنے نمود نام کی باتیں کریں

جب دل ہی نہیں ہے چلو میں، پھر عشق کا سودا کون کرے  
اب ان سے محبت کون کرے، اب ان کی تمنا کون کرے  
اب بھر کے صدمے پہنے کو، پتھر کا کیلیا کون کرے  
ان ہی بی راغوں کو رر کے سویرا کون کرے  
ہم دہم دغا کو مانتے ہیں، آد اب محبت جانتے ہیں  
ہم بات کی تر پہ جانتے ہیں، پھر آپ کو ر سو اکون کرے  
اے جذبہ الفت، تو ہی بتا، کچھ حد بھی ہے اس ناکا کی  
ایوں نگاہوں سے ان کا محفل میں نظارہ کون کرے  
ہم دیکھ چکے، ہاں دیکھ چکے، دستور تھاری محفل کا  
جب شکوہ ہے یہ پابندی ہے، پھر جرات کو، کون  
بکھڑا ہے تو بندوں کو بیاں نبھو  
تو کیوں نہ مطلق خالی جویر الطیف کو  
ہیں ترے واسطے پیش جہاں جلوہ کیف  
ہے ترے واسطے فطرت بھی گرم دھن سرد

تو کہہ رہا ہے یہاں کہ جس کو جنت لا حاصل  
ملنے میں ٹھنی جس قدر نگاہِ لبشہ  
ہے تیرے سینے میں پوشیدہ مومن جوں جوں  
یہ زندگی کی کشاکش، یہ سوز و آزار جاتا  
تو اس کو پھونک دے، بن کر عمل کی جھلکا  
کئی نہیں ہے جہاں میں آشناسوں کی  
یہاں تو، تو ہی تسلیم و خلیل بن نہ سکا  
ہمہ از دست، سمجھ اس کو، تجھی دیا تیرا دست،

سو اجداد کے یہاں، جو ہے وہ ہے لا موقوف

جھکتا ہی نہ تھا پھر ایسا جھکا، نام اٹھنے کا لیتا ہی نہیں

معلوم نہیں اس کہنے کیا اس غلبہ دو میں دیکھ لیا  
انتفاخِ آولیں کی بات ہی کچھ اور ہے  
بھڑکنے کی نرم میں اب ورجام آیا تو کیا

کیوں یہ کہتے ہو، کوئی چاہنے والا ہی نہیں

چاہنے والوں کو تم نے ابھی دیکھا ہی نہیں

بکا ہے فرطِ جنوں نے ہمیں کیا رہا  
جہاں نہ کچھ ہوا، صحبتِ ایں بری کیا ہے  
گزر گیا میں کروں، نا صحوں کی صحبت

## عزیز جھالا واڑی، محمد عزیز الرحمن قریشی

ان کا خاندان ریاست جھالاواڑ کے باغوت ملازموں میں شمار ہوتا رہا ہے۔ ان کے دادا لٹل علی بہادر منصرم کو کھنٹی و کارخانہ جات تھے۔ ان کے بعد عزیز کے والد لٹل علی لطیف بھی کارخانہ جات کے منصرم رہے۔ عزیز یہیں جھالاواڑ میں بسنت بھجی کے دن جبرائیل ۱۹۔ فروری ۱۸۸۵ء کو پیدا ہوئے۔

خاندان میں تمام سہولتیں میسر تھیں، لہذا تعلیم مناسب طریقے پر لگ رہی ہوئی، اور اس کی تکمیل کے بعد یہ بھی ریاست کی ملازمت میں رہے گئے۔ برقی کونے کرتے بالآخر وہ بھی منصرم کے درجے تک پہنچے، جو انگریزی علاقے کے مکشرف کے سادی رہا ہوگا۔ عزیز نے جھالاواڑ کے چار حکمرانوں کا ہندو حکومت دیکھا: (۱) راج رانا رام سنگھ مان کا زمانے میں ان کا شباب تھا۔ (۲) ہمارا نا بھوانی سنگھ؛ (۳) ہمارا راجندر سنگھ۔ ان دونوں حکمرانوں کے زمانے میں عزیز مقرب خاص رہے۔ (۴) راج رانا ہریش سنگھ جہاں کے آخری رئیس تھے۔ جب راجستھان کی ریاستیں جمہوریہ ہند میں ضم ہو گئیں تو ابتدائی زمانے میں رانا ہریش چندر راجستھان میں وزیر بھی رہے تھے۔ ہمارا نا بھوانی سنگھ خود صاحب علم اور قدردان علم و ادب تھے۔ ان کا انتقال ۱۳ اپریل ۱۹۲۹ء کو جہاز پر ہوا جب وہ علاج کے لیے لندن جا رہے تھے۔ مکش عدن میں پسر و خاک ہوئی، اور بھول جھالاواڑ آئے، جہاں بقیہ رسوم ادا ہوئیں۔ ان کے زمانے میں ادبی اور ثقافتی قسم کی تمام سرگرمیوں کا اہتمام عزیز کے قتلے ہوتا تھا۔ عزیز

کے کلام میں جو متعدد نظمیں ساگرہ کی ہوا کا باد، ہولی، اجن، غسلِ صحت وغیرہ کے عنوان سے ملتی ہیں، وہ انھوں نے اسی عہد میں کہیں تھیں۔

ہمارا نا بھوانی سنگھ نے بھوانی ناٹھ شالہ، ایک اداوارہ قائم کیا تھا، جہاں ڈرامے اور ناٹک اور اسی طرح کی دوسری تفریحی اور کچھ لڑکچڑی تقاریر منعقد ہوتی تھیں، کہاں اداوارہ کے بہتم بھی عزیز ہی تھے۔ ان تقریروں میں داخلہ بہت محدود ہوتا تھا، ان کے جاہلین، ہمارا نا بھوانی سنگھ کے تودہ صاحب خاص اور ہر وقت کے ندیم حاضر ہاں تھے۔ ہمارا نا بھوانی سنگھ شہر بھی کہتے، اور محمود غلص کرتے تھے۔ عزیز جب چمکے پرکرتے تھے، تو ان دونوں حکمرانوں کے عہد کے تھے، یہاں کرتے اور ان کی علم پروری اور ادب نوادی کے واقعات سنایا کرتے تھے، وہ ان دونوں کے ہمیشہ مداع رہے۔

عزیز کے کئی زمانے کے ایک استاد قاضی قطب القرون تھے۔ وہ کبھی کبھی نعت کہتے تھے۔ انھیں کی دیکھا دیگھی عزیز کو کبھی شرگوئی کا شوق پیدا ہوا۔ وہ شعر کہنے لگے۔ لیکن قاضی صاحب بوضوح سے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ سب سے پہلے انھوں نے حکیم عبدالقادر شوق سے اصلاح لی اور انھیں کے کہنے پر شاعرے میں اپنا کلام سنایا۔ یہ سلسلہ کافی دن تک رہا۔ بعد کو عزیز درباری شاعر خباب فقار الشعرانی مولوی عبدالوہید مرنگ کا کوردی کے شاگرد ہو گئے۔ یہ تلمذ انھوں نے ہمارا نا بھوانی سنگھ کے ایسا پر اختیار کیا تھا۔ مرنگ خود غشی عبدالحمید سحر (ابن غلام ساحر علوی) کے بیٹے اور مشہور نعت گو مولوی محمد حسن کا کوردی (ذ: ۱۹۰۵ء) کے شاگرد تھے، مرنگ ۲۷ ستمبر ۱۸۵۶ء کو کوردی میں پیدا ہوئے تھے۔ راجستھان میں اودھ کے فروغ میں ان کی خدمات بہت قابلِ قدر ہیں۔ بہت ذہین اور طبائع آدمی تھے۔ ملائذ کی کثیر تعداد نے ان سے کسب فن کیا۔

عزیز قدیم وضع کے بہت عمدہ سخنگو تھے۔ ان کا کوئی مجموعہ حینِ حیات شائع نہیں ہوا۔ دودویان غیر مجموعہ موجود ہیں۔ ایک میں غزلیات ہیں، دوسرے میں رباعیات، قطعات



نظیس وغیرہ ۔

عزیز بہت وضع و انداز رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے۔ مثلاً گھر سے کبھی شہر والی کے بغیر باہر نہیں نکلے۔ پان کی ڈبیرا دو ہونہ ہمیشہ ساتھ رہتا۔ آخر تک پرانی وضع کا قلمدان استعمال کیا اور نیرب کے قلم سے لکھتے رہے۔ ہاں نوازا اور سپر چشم آدمی تھے۔ لیکن بہت محتاط زندگی بسر کی ہمیشہ اپنی آمدنی اور خرچ کا حساب رکھتے۔ باغبانی کا شوق تھا۔ جھالا دار سے باہر سات آٹھ میل دور کیت کے مقام پر ان کا باغیچہ آج بھی موجود ہے۔ اپنے شہر کے مکان میں بھی ایک پھلاؤ آدمی لگا رکھی تھی۔

ان کا بدھ ۶ فروری ۱۹۷۳ء (۱۲ محرم ۱۳۹۴ھ) کو انتقال ہوا۔ ۸۹ برس کی عمر پائی۔ بیوی سے والہانہ محبت تھی۔ ان کا پانچ چھ سال قبل انتقال ہو گیا اور وہ کچھ سے غمے، اس کے بعد عزیز نے متعدد نظموں میں ان سے اپنی شیغلی اور جدائی پر رنج و غم کا اظہار کیا۔ دہلوی کے (ڈاکٹر محفوظ الرحمن اور محبوب الرحمان) اور دوڑکیاں یاد نگار و جھوڑکی سب اشعار انہ اپنے اپنے گھر بار والے، بلکہ بیٹوں، پوتوں والے اور خوش و خرم ہیں۔

مفتوں کو توئی نے تاریخ وفات بھی :

کرگن زبرد باز بزم خیال	اطلاع انتقال پر مہر طلال
وہ عزیز خوشنوا درخصت ہوا	تھے جو بزم دوتاں میں خوش مقام
جنت الفردوس ان کو ہو نصیب	مغرت فرمئے رب ذوالجلال
ہے یہ مفتوں! ان کی تاریخ وفات	ترب محباں "پاگیا رنگیں خیال"

(۲۲۳ + ۹۷۱ : ۱۳۹۴)

انہوں نے ان کے کلام کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ رسائل میں بھی زیادہ نہیں ملتا۔ کیونکہ انہیں اپنی درباری مصروفیتوں سے اپنی فرصت ہی کہاں تھی کہ اسے چھپنے کے لیے بھیجتے۔ چند شریعتی مسائل سے بے گئے ہیں جو ہدیہ ناظرین ہیں :

تری نظر سے نظر لگئی ہے کیا میری      بلا ہی ہے اشارے سے اب تھا میری

عزیز! فردِ روزہ کئے ذرا حس سے تو پھر بقا میں ہے یہ بھی کوئی بقا میرا!

ہاں کا جس طرح سے کرے میزبان لفظا بے لطف اسی طرح سے کرے یہاں لفظ

بگوئیوں سے تھی دشتِ بزمِ امید بھونکی کو اب لیلیٰ کا چہرہ بردہٴ محل سے نکلیگا  
ہیں وہ لطفِ بزمِ یاد حاصل ہو کر جیتے جی نہ محفلِ دل سے نکلیگا نہ دل محفل سے نکلیگا

ساتھ لایا نہ کر و غیر کو تم محفل میں دریا اک روز یہ جھگڑا اسرِ محفل ہو گا

تری تصدیقِ رری آنکھوں میں ہر دم پھرتی کچھ عجب لطفِ ترا در دُجدا فی دیتا

دل میں رودہ کے یادِ مرثکاں ہے بتلا ہم ہیں در دِ پہیسم میں

جب قلمِ الفت اُٹھا یا شبِ معراج

محبوب کو خالق نے بلا یا شبِ معراج

قدی بھی کہتے تھے، محبوبِ شانِ خدا ہے

یکس کا قدمِ عرش پہ آیا شبِ معراج

مستم کا ایک بندہ

حضرت یوسف و یعقوب و سہج - مریم

حضرت الیاس تھے خوش اسوا، آدم

ہو دو اب تھے موسیٰ بھی تھے شاد و حرم

لو دادا ریس خوشی سے تھے بغلیں، ہم

انبا و سبھی کہتے تھے حوشی سے پیہم

عرش پر کھیلے محبوبِ خدا آج کی دنیا

## ہجور شمس، سید عبدالقیوم

ضلع روتھاس (ہبار) کے تاریخی شہر سہرام کے رہنے والے تھے جسے شیر شاہ سوہی کا مسقط الرأس ہونے کا فخر حاصل ہے۔ ملازمت کی اسناد کے مطابق وہیں ۱۸ اپریل ۱۹۱۵ء کو پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد ”مولوی“ محمد ادیس (ف: ۱۹۳۸ء، ۱۹۳۹ء) پلوے پولیس میں دار و فر تھے۔

ابتدائی تعلیم مدرسہ خانقاہ کبیرہ، سہرام میں ہوئی؛ ثانوی مدرسہ حنفیہ، آردہ میں اور اعلیٰ کی تکمیل مدرسہ شمس اہدیٰ، پٹنہ میں کی۔ یہ مدرسہ شمس اہدیٰ کا تعلق ہی تھا جس کے باعث بعد کو شرگوئی کے زمانے میں انھوں نے اپنے تخلص ”ہجور“ کے ساتھ شمس کا اضافہ کیا؛ بلکہ بعض خرواں میں تو انھوں نے ”شمس“ بطور تخلص بھی استعمال کیا ہے۔

آخر میں پٹنہ یونیورسٹی سے صرف ادب کے مضمون میں امتحان مے کر لی مے کی سند حاصل کر لی تھی۔ اس کے بعد مدرسہ کا پیشہ اختیار کر لیا۔ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۸ء تک ضلع اسکول، گیام میں فارسی اور اردو پڑھاتے رہے۔ اوائل ۱۹۴۸ء میں پلاٹو ضلع اسکول، ڈالٹن گنج میں تبادلہ ہو گیا؛ بقیہ ملازمت کا سارا زمانہ یہیں گزر رہا، اور یہیں سے اوائل ۱۹۷۳ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد مشکل سے ہمدینہ بھر گورڈا ہو گیا کہ جب ۸ فروری ۱۹۷۴ء کو دائمی اجل کو لبیک کہا۔

فنا دم کا عارضہ پرانا تھا، لیکن موت حرکت طلب بند ہو جانے سے ہوئی قیمت

کی تمام ظرفیتیں دیکھیے کہ اکاکی پلاؤن نٹ رائج کینڈر ان کے امور اذین مشب غزل منائے والے تھا کہ بعد نماز جمعہ عین بجے سپر کو اچانک قلب کا دورہ پڑا اور آنا نا انا جان بحق ہو گئے۔ ”جشن غزل“ مجلس عزائیں تبدیل ہو گیا۔ وہ ہزاروی یا رخ اسکول کے نگران مقرر ہوئے تھے۔ سا ان بندہ چکا تھا، اور دوسرے دن بعد روانگی ملے تھے کہ سفر آخرت پیش آگیا۔ فاعترفا ادا دل انا بشار۔ ڈاکٹرنے کچھ کے قبرستان میں آخری آدا لگا دیا۔ نصیب ہوئی۔ ان کے شاگرد مجیب نشر نے تادیب بھی :

حضرت ہجور رخصت ہو گئے      مرد کامل، صاحب فی الفزگو  
روح دل پر کیوں پھر برقع      ”شاعر شیریں سخن کا نام ہو“

(۱۹۷۴ء)

بہت کم عمری میں شعر و سخن کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ کلام پر مختلف اوقات میں سیما ابکر آبادی (ف: جنوری ۱۹۵۱ء) ساغونظائی (ولادت: دسمبر ۱۹۰۵ء) اور آرزو مکھنوی (ف: اپریل ۱۹۵۱ء) سے مشورہ کرتے رہے۔ اگرچہ دوسری اصناف میں بھی کلام موجود ہے، لیکن دراصل غزل کے شاعر تھے، اور وہ بھی رواجی رنگ کے خوش گو ہونے کے باعث شاعروں میں بہت مقبول تھے۔ ان کی زندگی ہی میں ان کے شاگردوں نے ”بزم ہجور“ کے نام سے ایک انجمن قلم کی تھی۔ یہ آج بھی حق القعدہ اردو کی خدمت کو رہی ہے۔ اس کی طرف سے ان کے شاگردوں کا تذکرہ ”نقوش ہجور“ (جینہ ۱۹۷۵ء) بھی چھپ چکا ہے۔

دو محبوس: بردہ ساز ڈاکٹرنے (۱۹۶۶ء) اور ذراے راز (۱۹۷۳ء) ان کی زندگی میں شائع ہوئے تھے۔ ذراے راز محبوس (گل آفر و کلام ہجور) بھی مرتب تھے لیکن شائع نہیں ہوئے۔

اپنی عمر میں دو نکاح کیے۔ پہلی شادی بہسٹرم میں ہوئی۔ ان سے دو بیٹے ہوئے: ایک رز کا محمد محمد ام اور جیتی نرہت جہاں۔ دونوں بچے فوت ہو گئے اور بیوی کا بھی انتقال ہو گیا۔ دوسری بیوی سے دو بیٹیاں زندہ ہیں۔

غنیہ کلام ہے بضمون آفرین کی کوشش ہر ایک شعر سے ظاہر ہے۔ اگرچہ وہ کلاسیکی انداز کے سخنور ہیں، لیکن انھوں نے جدید رنگ سے اجتناب کیا، تہذیبِ سنیت کو قائم رکھتے ہوئے عصرِ حاضر کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی سعی کرتے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں :

ہر چند دیکھتا ہوں یہاں بامِ درد نہیں      آگے چلے جنوں پہرا صحرائیں گھر نہیں  
خونِ دل انوں چکر، خونِ نظر اب رہ گئے      ہر بہک روئے، آنکے، میر کا رواں بختا گیا  
برآشاں سے پہنچنے لگے جہیں کو سپام      چل گیا مرے سجدوں میں کس کا نام ابھی  
یہ کیا جشنِ رہائی ہے، کیسی آزادی      جانِ تکر و نظر ہیں کہ ہیں قلام ابھی  
یہ کیا خبر تھی کہ دستِ وحشت لباسِ سستی پہ جا پڑیگا

کچھ ایسے عالم میں ہوں کہ اکثر خیال آتا ہے پر میر کا  
کچھ غم نہیں بھجور، بکا بنا نہیں کوئی      معلوم ہے میکس کا ہر حال خدا سے  
دو جو عشق، تو ذرا سے میں آدمی ات چلے      جو ہو، تو دستِ کونین میں سناں کے  
پھیلا ہی تری جفا کا قصہ      بات آہیں گئی فری و فدا کی  
کہنے کو ہے تبدلے الف      اس میں بھی تڑپ ہے انتہا کی  
بھجور! ددا کا نام نکلا      اللہ نے زندگی عطا کی  
صبح نہ آیا، شام نہ آیا      آج بھی کچھ پیغام نہ آیا  
دستِ آغا رہ محبت      پیشِ نظر انجام نہ آیا  
سکوتِ افادِ جنتو کا، سکوتِ انجامِ گفتگو کا

حدودِ آدابِ بندگی میرا سکھانے کے حکمران

نہ وہ رشکِ طلعت جو رہے، نہ جوابِ جلوہ طور ہے

مگر ایک بات ضرور ہے، کوئی بات اُس میں ضرور ہے

یہ خار بھی ہیں متاعِ بہارِ گل ہی نہیں      نگاہِ چاہیے اسرارِ گلستاں کے لیے  
جھکا جھکا کے لئے اور پایاں نہ کر      جہیں کو وقف بھی کر ایک آستان کے لیے

و ہر دانِ رحیم کی منزل ہے وہی — آپ کے گھر سے چلے، آپ کا گھر تک پہنچے  
اب شکایتیں بجا، گردشِ منزل کی — اس زمین پر خود ہم سے آسمان جلتے ہیں  
تو رہنے پر اب تک پھر کائناتِ نوحِ اولاد سے

مرے شاد اجڑوں نے تری لطف کو سزاوار  
ہنر تمام ہوا تو زندگی بھی ہو نہیں سکتی — خدائی کرنے والے کر گئے، اہل ہنر ہو کر  
جذ کے سیکوں نے، وقت کے طیبوں سے — لند کی کھاؤں کو سوت کی دوا دی ہے  
سوچ سمجھ کر، سیر چین کر — پھول لگا دیتے ہیں نشیتر  
پھر لیتا ہے ہاتھ میں سانغا! — بھول گیا، سارِ رخ کا پتھر؟

آپ کی بزم میں مستی و نغمہ ہی نہیں — وہ بھی ہیں جو رُخی دوا سے ہو گئے ہیں  
خوش نصیبانِ کرم تھے کہ ملی جا بجا — ہم بھی اک سایہ دیا ار سے ہو گئے ہیں  
تو کھاتے زندہ ہے حقِ دینِ کلام — وہ سادہ دل ہیں کہ مرنے ہیں گنگو کے لیے  
اہلِ دل سے زندہ ہے، رہمِ ناصیہ سالی — درد کیا تعلق ہے ہر کو آستانے سے!  
شرابِ دانشِ حاضر کی سرستی ار سے تو برا — نظر تک روشنی پہنچی، ادوں تک ترگ آئی  
کچھ تو اہلِ وحشت کا حوصلہ ٹرھانا تھا — تم کو اک تبسم سے تیجوں حجاب آتا ہے

## الوداد منوہر سہاسی، ڈاکٹر

داغ کے مشہور شاگردوں میں پروفیسر نراین پرشاد جہرگرو ایسا دی کا بھی شمار ہوتا ہے۔  
 قوم کے سکینہ کا ستھ تھے، قوی لقب و دماغ تھا۔ کس زمانے میں یہاں دلی کے مضافات  
 دادرشاد کے زمانے میں ایک مختصر کاؤسٹھول نام تھا، ان کا خاندان وہیں کا رہنے والا  
 تھا، اسی لیے یہ لوگ "سٹوٹ" کہلاتے تھے۔

خاندان مغلیہ کے عروج کے زمانے میں ان کے بزرگ شاہی ملازم تھے۔ چنانچہ ان کے بزرگ  
 واسے پرانگ داس اکبر کے عہد میں دیوان ہومات کے عہدے پر فائز تھے۔ محو شاہ کے عہد  
 تک ملازمت کا یہ سلسلہ قائم رہا۔ جب سلطنت مغلیہ پر دوال آیا، تو اس خاندان کا شیرازہ  
 بھی بکھرا اور یہ لوگ تلاش معاش میں یونی کے مختلف شہروں میں منتشر ہو گئے۔ کچھ جا کے  
 سہوان (ضلع ہالیون) اور اکبر آباد میں بس گئے، کچھ سرکار دادہ اور حکومت انگریزی  
 کے دامن سے وابستہ ہو گئے۔ جہر کے والد منشی کھیا لال بھی فکریہ دادہ اور گاد میں سرگرداں تھے۔  
 ان کے خوشی چھپ لال بریلوی، اس وقت ہالیون کی کلکٹری میں ملازم تھے۔ بخد کی  
 افراتفری شروع ہوئی، تو وہ اپنے مرشد پنڈت ہرناتھ، نائب دیوان ریاست گویا  
 کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور بعد کو ان کی وساطت سے وہاں مفت مالوہ میں اسٹا  
 کے عہدے پر منتقل ہو گئے۔ منشی چھپ لال کے پانچ بچے تھے، تو انھوں نے اپنے داد  
 منشی کھیا لال کو بھی اپنے پاس بلایا، داد، اپنے آخر سے انھیں ریاست گویا کے ضلع  
 میں گڑھ (موجودہ دھیر پوریش) کی تحصیلدار کی ملازی۔ اس کے بعد خاندان نے

یہیں منتقل سکونت اختیار کر لی۔ چنانچہ زائن پر شادی ۱۸۶۷ء میں مکمل گڑھ میں پیدا ہوئے۔

اپنے خاندان کی روایت کے مطابق ہر کی تعلیم بھی نادری اور دہلی سے شروع ہوئی۔ پھر الہ آباد یونیورسٹی کے تحت بریل کالج سے دسویں درجہ کا امتحان اول درجے میں پاس کیا۔ بدقسمتی سے دورِ شقیقہ کے مستقل عارضے کے باعث اُس کی تعلیم جاری رکھنے سے معذور رہے۔ لہذا انگریزی مڈل اسکول، گوالیار (پولی آبادی) میں مددنی اختیار کر لی مختلف جگہوں پر ملازمت کرنے کے بعد ۱۹۱۱ء تا ۱۹۱۳ء میں عارضی طور پر کوشنر دفتر مردم شماری، گوالیار کے نجی تعاون (ریشنل اسسٹنٹ) مقرر ہو گئے یہاں کی خدمات کے جلد میں کچھ انعام بھی ملا تھا اس دفتر سے فارغ ہوئے تو ریاست کا سب سے معذور اسکول، دکٹوریہ کالجٹ ہائی اسکول میں اونچے درجوں کے پڑھانے پر مقرر ہو گئے یہ اسکول میں ۱۹۳۵ء تک رہے اس اثنا میں عارضی طور پر غالباً ۱۹۳۴ء میں پروفیسر حسن خان ماقب کے انتقال پر انھیں دکٹوریہ کالج، گوالیار میں انستور بنائے گئے اسکول کو نادری پڑھانے کا موقع ملا تھا۔ اسی باعث ان کے نام کے ساتھ "پروفیسر" کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ وہ بالآخر ۱۹۳۵ء میں محکمہ تعلیم کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد زیادہ وقت فراہم مطالعے میں گزرا۔

ہر کو شاعر کی کا شوق ۱۶۔ ۱۷ برس کی عمر میں ہوا۔ ضیا امروہوی کی وساطت سے دہلی کی شاعرہ کی اختیار کی، جوان دنوں واپس میں مقیم تھے۔ ہر کا دیوان (شعاع ہجر) ان کی زندگی میں چھپ گیا تھا۔ (مطبع محمدی، بمبئی: ۱۹۳۷ء) اس کے علاوہ بعض اور کتب

بھی موجود ہیں ان کا دیوان ہند۔ یہ انگریزی کتاب (Prophets of India) کا ترجمہ ہے۔ اسے انجمن ترقی اُردو نے شائع کیا تھا؛ (۲) سفید جوہی، معاشرتی ناول ہے؛ (۳) انگریزیا! یہ چھ مضامین کا مجموعہ ہے؛ (۴) دیبر مضمونی نگار دی؛ دہلی کی کتاب ہے جس کا بے ایک کتاب نمادیات ہجر، بھی قریب کی تھی۔ اس میں اُردو کے نمادیات و دیف دار جمع کر کے ان پر بحث کی تھی۔ یہ ان کی زندگی میں نہیں چھپ سکی تھی۔ نہ جانے، اس کا سکہ



کیا ہوا!۔

پہلے ۲۶ جولائی ۱۹۴۳ء کو بوقت صبح اچانک عارضہ قلب سے انتقال کیا۔ ان کے  
اشاد بھائی نور محمد خاں خاں خاں:

نوح کے دل سے یہ نکلا سال فوت

نکھ: "غروب ہر زردی بارگاہ"

(۱۹۴۹ء - ۶ - ۱۹۴۳ء)

داغ ہی کے ایک دوسرے شاگرد حب لال دھند کی تاریخ تھی:

شاعر خوشن فکر دنیا سے گیا (۱۹۴۳ء)

منوہر سہلے اور انہیں نرین پر شاہ جہر کے خلف رشید تھے۔ یہ سب گودہ کی میں یکم جنوری  
۱۹۰۱ء بوقت صبح پیدا ہوئے۔ ان سے ددہ بڑے بھائی پہلے سے موجود تھے۔ اولیٰ نام مرگ  
حرف رام دیا (۱۸۹۵ء - ۱۹۷۰ء)؛ یہ نوح میں پکتان کے عہد تک پہنچے شکار کے دلدادہ  
اور ہر نشانہ بانٹتے تھے۔ ان کی نگریادہ حصہ آگے میں بسر ہوا۔ دوسرے بھائی ان سرورپ  
۱۸۹۵ء - ۱۹۷۱ء) بھائی میں رہتے تھے۔ موسیقی سے بد بخفا میں شغف تھا۔ ۱۹۲۶ء میں  
کھٹو میں بڑے پائے پر ایک موسیقی کا نفرین منعقد ہوئی تھی۔ اس میں انہوں نے ایک بھیر  
افراد متعارف تھا۔

منوہر سہلے تھا اصل نام بھی گودہ سرورپ تھا، جسے بعد کونا خیاں والوں نے تبدیل کر کے  
منوہر سہلے کر دیا۔ یہ مشکل سات ماہ کے بونگے کو اکتوبر ۱۹۰۱ء میں ان کی والدہ کا انتقال  
ہو گیا۔ اس کے بعد ان کی پورشش اور تربیت ناخیاں میں ہوئی۔ یہ خاندان بھی علم فضل  
اور جاہ و مرتبہ میں ممتاز تھا۔ یہ لوگ یا ست ڈھک کے جاگیردار تھے۔ ان کے پرانا دارو  
نرین سہلے شافقی (ف: ۱۹۰۷ء) اور تانا دیو تی سہلے شفی (ف: ۱۹۱۶ء) دونوں  
خاندان کے شاعر تھے۔ ان کے فارسی سے شغف کا یہ عالم تھا کہ اردو کو حقیر زبان سمجھتے اور  
اس میں معمولی مراسلت تک کو اپنے دون مرتبہ خیال کرتے تھے۔ ایسے ماحول میں ان کی  
تعلیم کس پنج پر ہوئی ہوگی، اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ خود بتایا کرتے تھے کہ حروف

سے بھی قبل مجھے یوسف زینماں بجائی کے ابتدائی تین مہینوں کا بانی حفظہ کرا دیے گئے تھے۔ جب حرف شناس ہو گئے، تو گلستان سعدی سے لہجہ اُردو پڑھائی پھر پاکستان اور دہلی ابتدائی اور درمیانی تہائی اسی طرح گھر پر پڑھیں۔ ۱۹۶۱ء میں پاکستان کے استاد تھے۔ پڑھانے کے بعد ۱۹۶۱ء کے اکیلے پوری کوئٹہ اور دہلی سے نواسے کی تعلیم کی نگرانی جاری رکھی۔

۱۹۱۱ء میں انور باقاعدہ اسکول بھیجے گئے۔ ان کی استعداد کے پیش نظر براہ راست ساتویں درجے میں داخلہ ملا۔ اسکول میں اُردو اور انگریزی پڑھتے، اور گھر پر فارسی۔ بہر حال فارسی کا درس ۱۳-۱۴ برس کی عمر تک ملا۔ اس وقت ہم انھوں نے فارسی کا بیشتر کلاسیکی ادب غنیمت کر لیا تھا؛ اور اس سے مزید واقف ضرورت بھی نہیں تھی خصوصاً جب کہ اس سے اسکول کی تعلیم میں بھی حرج ہونے لگا تھا۔ لیکن یہ فارسی کی وسیع قیامت بعد کے زمانے میں ان کے بہت کام آئی۔

۱۹۱۳ء میں اسکول سے فارغ ہوئے، تو ۱۹۱۵ء میں احمدیہ سوسائٹی میں داخلہ لیا۔ انھوں نے جوانی کی جنگ میں کسی موقع پر ریاست کے نظم و نسق کے بارے میں کچھ اعتراض کر دیے۔ اس زمانے میں اسی بات پر اُردو نہیں دیکھی ریاستوں میں بغاوت سے کم تصور نہیں کی جاتی تھیں۔ چنانچہ ۱۹۱۹ء میں بیکہ میں دو گوش ملازمت سے برطرف کر دیے گئے۔ اس اثنا میں (۱۹۱۶ء) میں ۱۶ سالہ کا بھی انتقال ہو چکا تھا؛ جہاں کے حاجی اور سرپرست تھے۔ چونکہ اندیشہ تھا کہ مبادا ریاست تو بیکہ کے خلاف کوئی مقدمہ قائم کر دے، یہ اپنے والد کے پاس گواہی لے چلے آئے۔ انور کے والد کے انتقال کے بعد مہر نے دوسری شادی کر لی تھی۔ یہ خاتون بھی بہو ان کی تھیں۔ ان سے مہر کے چار بچے پیدا ہوئے۔ ایک بیٹی (ہرنارانی) اور تین بیٹے: بدلی پرشاد سٹھوے (ولادت ۱۹۰۳ء) جگتا تھو پرشاد سٹھوے (ولادت ۱۹۰۵ء) اور سورج پرشاد سٹھوے پلیٹی انفر ضلع دتیا (ولادت ۱۹۱۹ء) تینوں بھائی بفضلہ زندہ موجود ہیں (۱۹۷۷ء)

آؤر کو یہاں گوالیار کا ماحول داس نہ آیا، اس لیے انھوں نے خیرے بعد پھر رنجب سفر باندھا۔ ایک لاکھ پچیس اور پچیس محبوب عالم (دف: مئی ۱۹۳۲ء) کے شہر و سپہ اخبار میں مترجم کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔

اس زمانے کا لاہور صحیح معنوں میں اردو علم و ادب اور صحافت کا محبوب اور اہم تھا۔ انور نے محسوس کیا کہ یہاں کے علمی حلقوں میں برابری کی سطح برپا تھا اور مقام حاصل کرنے کے لیے اشتہور و نامی سے کم نہ صرف اپنی تعلیم کی تکمیل کریں بلکہ یونیورسٹی کی سند حاصل کریں۔ نام کی بنیاد اور وہ بھی خاص مقصود پہلے سے موجود تھی، انھوں نے دفتر دفتر ایم اے اور ایم ایل کی بناء حاصل کر لیں۔ وہ غالباً واحد سندستانی تھے جنھیں تعلیم ملک کے بعد یعنی ۱۹۵۷ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے اپنے مقالے (انگریزی) : "سراج الدین علی خان آردو: جیاد و تصانیف" پر پی ایچ ڈی کی سند ملی۔

دہلاہور کے شاعرین میں شریک ہوتے، شہر کی گونا گوں ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیتے۔ اور مختلف اوقات میں بعض رسائل و جرائد کے دفتر میں بھی کام کرتے رہے۔ چند ٹوی اسے، دی کالج، لاہور میں فارسی اور اردو کے مدرس (ریکٹر) بھی رہے تھے۔ اس طرح جہاں ان کا حلقہ احباب وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ وہیں وہ کہیں ایسے اصحاب اثر و رسوخ سے بھی متعارف ہو گئے جو ان کے اردو اور فارسی کے فاضل کی حیثیت سے معزز تھے۔ اس کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ لاہور میں جہاں اس وقت ان دونوں زبانوں کے عالمان اور استادوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ یہاں سر فضل حسین (دف: جولائی ۱۹۳۶ء) نے انھیں اپنے بیٹے میاں منظم حسین (دف: مئی ۱۹۳۷ء) کو اردو اور چودھری مرثیہ شہاب الدین نے اپنے مبتنی میاں ممتاز محمد خان دودا کو فارسی پڑھانے کے لیے مقرر کیا، یہ دونوں اس وقت ہی اسے کے طالب علم تھے۔

۱۹۳۵ء میں سر سکندر رجا خان کے مشورہ سے انھوں نے پنجاب کے محکمہ تعلیم میں ملازمت قبول کر لی۔ اس زمانے میں مرثیہ شہاب الدین پنجاب کی مجلس وائٹ ٹو این کے صدر تھے۔ ۱۹۳۷ء میں انھوں نے لاہور صائب کو مجلس میں مترجم مقرر کر دیا، تقریباً ایک دو سال تک وہ اس

کام کرتے رہے، بعد ۲۱ سالہ ملازمت کے بعد ۱۹۵۵ء میں سپرنٹنڈنٹ شہر عبدسے سہتی  
پرسبکدوش ہوئے۔ اسی تعلیمی صلاحیتوں کے پیش نظر اس کے بعد وہ پنجاب یونیورسٹی  
کیمپ کالج، نئی دہلی میں شعبہ اُردو، فارسی، عربی کے صدر بن گئے۔

صحت ثمت سے خراب چلی آرہی تھی، نظا زدم (دہائی بلڈ پریشر) کی شکایت تھی۔ مارچ  
۱۹۷۲ء میں پہلی مرتبہ دل کا دورہ پڑا، بارے، دوا دیکھ کر اس سے حالت کچھ سدھ گئی، جنوری  
۱۹۷۴ء میں دوسری مرتبہ بیمار ہوئے۔ ایک پھر چند دن اسپتال میں رہنے کے بعد کھڑا  
ہو گیا اور وہ مکان پر آ گئے۔ یہیں ۱۵ فروری کو طبیعت یکایک پھرنس ہو گئی اور وہ  
بعد ۷ فروری ۱۹۷۴ء کو دوسرے وقت روح فقیر عنقریب سے پردا کر گئی اسی شام  
پوتے فوجی سید خاکی نذر انش کر دیا گیا۔

ان کی پہلی شادی ٹونک کے شری رنگ لال کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ یہ خاتون ایک رُک  
اپنی یادگار چھوڑ کر ۳ مئی ۱۹۳۳ء کو وحلت کر گئیں۔ اس کے بعد دوسری شادی مارچ  
۱۹۳۶ء میں غشی برج موہن لال کی صاحبزادی شریمنی چاندانی سے ہوئی۔ غشی صاحب  
موصوف بن پوری کے بہنے والے اور دیا ست چند میں تفصیل داتھے، اور ان دنوں مگر  
میں تعینات تھے۔ ان کے بطن سے ماشاء اللہ پانچ بچے ہوئے، چار بیٹے اور ایک بیٹی۔  
بفضلِ وہ خود بھی موجود ہیں اور سب اولاد بھی خوش و خرم ہے (۱۹۷۷ء)  
انہوں نے شری رنگی بہت کم عمری میں شروع کی۔ اپنے گرو دیش کے تقاضے سے ان کا سب  
سے پہلا شعر فارسی میں تھا:

چیز نہ احدیث تو بقراں نفروتم

کھڑے کر رہا بہت، بایساں نفروتم

پھر اسی ذلے میں اُردو میں بھی کہنے لگے، تو کہا،

جواب نام لکھا دو سٹے، لیکن خفا ہو کر

ذید زندگی آئی ہے پیغام قضا ہو کر

ان کے ہانا کو منہم ہوا۔ تو فرمایا کہ فارسی کلام میں خود دیکھو لگا، لیکن اُردو کلام اصلا

کے لیے مولانا حالی کے پاس بھیجے۔ وہ مرحوم کہتے تھے کہ حالی نے مشکل و تین غزلیں دیکھی ہونگی۔ پھر لکھا کہ ”مقدمہ شہود شاعری“ کو بغور بار بار پڑھیے، اس سے خلاق سخن بھی دوست ہوگا اور زبان و بیان کے حسن و قبح کی تیز بھی پیدا ہوگی۔ انیس کہ مجموعہء کلام ان کی زندگی میں شائع نہیں ہو سکا۔ یوں بھی تقسیم ہکت تک کا سارا کلام ضائع ہو گیا۔ یہ وہیں لاہور میں رہ گیا تھا۔ بعد کے کام میں سے آجی چاندرا دھر کا انتخاب کیا تھا اور اس کی اشاعت کی فکر میں تھے کہ موت کا بلا دا اٹھ گیا۔

انھوں نے متعدد انگریزی کتابوں کے ترجمے بھی کیے تھے؛ یہ البتہ چھپ چکے ہیں بعض ضائل میں شائع شدہ کچھ غزلوں سے چند شعروں کا کلام کے طور پر درج کر رہے ہیں۔ ان کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ شعر و ادب سے کہیں دماغ سے کہہ رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کسی پرز کے حتمی کیوں رہے کوئی

سمجھنے کے لیے آنا اشارا کم نہیں ہوتا  
مگر کچھ کو طاعت کوئی اپنے آپ سے مانج

گفتا بر کند زلفِ خم در خم نہیں ہوتا  
بار جلوہ دار سے عبت منسوب ہے شور و ش

جنون شورشماں کا کوئی موسم نہیں ہوتا

غلام انگلی مرے تیرے خواب آؤں سے آخر تک  
دی رہتا ہے جو شہر اضطراب لے سے آخر تک  
پند اور کی شکست کا سماں ہے آجکل  
لیکن یہاں تو کفر ہی ایسا ہے آجکل  
سب راؤ گدگدش دوراں ہے آجکل  
وہ جو چاہیں کریں، بیجا ہی کیا ہے!  
ہمارا آپ کا جھگڑا ہی کیا ہے!

وہ آئیے! انہیں کہے، غلط آئیے گا، جیسے  
جنت کی سکون نا آشنائی کم نہیں ہوتی  
یادش بخیر، زائد ہر تماثل کے لیے  
گو کفر ہے پرستشِ خود بان خود پرست  
دورانِ عیش و گدوش ساغر، خوشا نصیب  
روایا نا روا، ہوتا ہی کیا ہے!  
جھگڑے میں بھی ہے اک بطف اور نہ

عسبِ امرد ز ہی میں عمر گزری  
وہ جنس دیتے ہیں، سیری بات سن کر  
"بہت ہے ہر مری سی اک نظر بھی  
دو عالم کے زنے" ہیں میلہ سے میں  
مرے امرد کا فردا ہی کیا ہے  
نہ جو یہ بات، تو رہ نام ہی کیا ہے  
یہ تھوڑا سا کرم "تھوڑا ہی کیا ہے  
یہاں حشمت بھی ہے دنیا ہی کیا ہے

کرم ان کا امید افزا نہیں ہے  
ہمارے پاس جب جوتے نہیں وہ  
ادھر بھی کچھ نہ کچھ ہے، بیقراری  
کبھی ہوتا، کبھی ہوتا نہیں ہے  
کوئی ان کے سوا ہوتا نہیں ہے  
مگر کچھ اس طرح، گویا نہیں ہے

لکھا نہیں نگاہ لانے سے ڈر بھیجے  
دز تک ہزار بار اک اُمید سے گئی  
لے دوستو! تمھاری عنایت کا شکر  
دم بھر کو میری گردن تقدیر رک گئی  
اس رشک ہر دماہ کی زحمت کا بھیجی  
میں خود کو راز دہرے کیوں بجز تمہوں؟  
اُور! اگرچہ عشق بہت کی نیاہ کی  
لگ جائے اے خدا! تہوں کی نظر بھیجے  
گھر ہی میں پیش آگئے کتنے سفر بھیجے  
کب تھے نصیب رنج و اہم، اس قدر بھیجے  
جب اک گئے وہ خاک بسر دیکھ کر بھیجے  
لکھا ہے اس کے نور سے معمور گھر بھیجے  
کیا کم ہے یہ خبر کہ نہیں کچھ خبر بھیجے  
پھر بھی بنا بنے کا نہ آیا ہنر بھیجے

کس بوڑھے گز اور ہاتھ انھیں خیال  
خوش فہم کر دیا تری الفت اس قدر  
مرد مر کے دیکھتے تھے سر و گردن بھیجے  
آرام کا گمان ہے آزاد پر بھیجے

## انظر، احمد الدین (اے، ڈی انظر)

سیالکوٹ (پاکستان) کے تاریخی شہر سے دس بارہ کلومیٹر دو ایک چھوٹا سا گاؤں ہے ڈگراخند نام۔ یہاں نماز قدیم سے لہاؤں کے بہت خاندان آباد ہیں (یا کم از کم۔)۔ جس کو دھرمک تھے؛ اسی لیے بعض اوقات اسے کوٹلی کہاواں بھی کہتے ہیں۔ حریر ۱۹۰۰ میں یہی لگاؤ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد کی تعلیم سے بہرہ ور نہیں تھے۔ لیکن اُن کے دن کا مشاہدہ ہے کہ بعض اوقات بالکل اُن پرچہ آدمی بھی علاء و فضلہ کی صحبت میں رہتے رہتے نہ صرف خود میں اور دینی مسائل سے واقف ہو جاتا ہے، بلکہ اس میں زیادہ علم حاصل کرنے کی اور اپنی اولاد کو بھی تعلیم دلانے کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی صورت حال یہاں بھی پیش آئی۔

احمد الدین کی تعلیم کا آغاز نماز کی مسجد سے ہوا کیونکہ یہاں کوئی کتب خانہ نہ تھا، نہ ان کی مسجد میں بھلا تعلیم کیا ہوتی! پیش امام صاحب نے نماز یاد کروادی۔ وضو اور طہارت کی کچھ ابتدائی باتیں بتادیں۔ اور پھر ناظرہ قرآن پڑھانے لگے۔ البتہ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ وہ اردو کے اتنے حرف شناس ہو گئے کہ جلد ہی اردو درسم الخط میں بھی ہوئی پنجابی زبان کے منظوم قصے اور سی حرفیاں روانی سے پڑھنے لگے۔ ان کے والد نے دیکھا کہ لڑکا ہونیا رہے۔ ڈگراخند سے چند کوس دور ایک دوسرے گاؤں میں ڈسٹرکٹ بورڈ کا پرائمری مدرسہ تھا؛ انھوں نے احمد الدین کو دہاں بھیج دیا۔ یہ اپنی بستی کے پہلے طالب علم تھے؛ جو کسی مدرسے میں داخل ہوئے اور ان کو ۱۰ میٹر اصحاب نے ان کا نام "احمد دین" رکھا ہے، ٹھیک اور پرانا نام "احمد الدین" تھا

نے برائری کے چاروں درجے تو مکمل کر لیے، لیکن اس کے بعد خدا معلوم کیا آفت آ  
 پڑی کہ بھاگ نکلتے۔ ڈیڑھ دو سال تک کھڑکھاؤ چھ باروں میں تھتے سناٹے آدھیر پڑتے  
 پھرتے یا پھر اپنے معصہ دل کے ساتھ کیبل کو د میں مصروف رہے۔ ان کے والد دل  
 متوس کر رہ جاتے کہ بیٹا کس راہ پر چل نکلا ہے۔ لیکن آدمی تھے مڑو بالا و سمجھ دار  
 انھوں نے ڈانٹ ڈھپ کی جگہ نفعیاتی علاج کا راستہ اختیار کیا۔ ایک مرتبہ ان کا  
 کسی کام سے سیالکوٹ جانا ہوا۔ واپسی پر بیٹے کے لیے گلستان سعدی اور عربی کی  
 کتاب اشرف اور کتاب انھو کا ایک ایک نسخہ لیتے آئے۔ احمد قدیم بھانجے  
 کہ والد کی کیا تمنا ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ پڑھنے لکھنے میں محبت گئے؛ اور دم اس  
 وقت لیا، جب مرنے کا رخ، سیالکوٹ سے لی اس کی سند لگی۔

اکول اور کانٹہ میں ریاضی اور عربی ان کے خاص مضمون تھے تعلیم شاغل کے علاوہ  
 لڑنا بھرنانا اور اپنے احباب کے جھگڑوں میں ان کے لیے ہر موقع پر سینہ سپر ہو جانا  
 ان کا طرہء امتیاز تھا۔ اسی لیے اپنے بیشکلف دوستوں کے حلقے میں وہ جوشیل کے لقب  
 سے مشہور تھے (اور اس عرف سے وہ آخر تک پکارے گئے)

مرنے کا رخ، سیالکوٹ کی تعلیم کے دنوں میں انھوں نے شمس العلماء مولانا سید میر حسن (جو  
 دف: خمر ۱۹۲۹ء) سے بھی استفادہ کیا تھا، جن کا نام علامہ اقبال (دف: اپریل ۱۹۳۰ء)  
 کی سوانح عمری میں بہت نمایاں ہے۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد اڈا چندے تدریس کا شغل رہا۔ چونکہ ریاضی اور حساب کتاب  
 شغف تھا، اس لیے انڈین آؤٹ اینڈا کاؤنٹ سرورس کے امتحان مقابلہ میں بیٹھے اور  
 کامیاب ہو گئے۔ اس کے بعد سب سے پہلا تقریر راولپنڈی کے لٹری اکادمیس کے دفتر  
 میں ہوا۔ راولپنڈی کے زمانہ اقامت کا ایک لطیفہ قابل ذکر ہے:

شہر میں مسلمانوں کا خا صا ثرا جملہ نقد ہوا، جس میں تعلیمی، معاشی اور سماجی مسائل پر  
 مختلف اصواب نے تقریریں کیں۔ غلطی کی ضلالت اپنی جوان عمر کے باوجود، (طرح صاحب  
 کے حلقے میں آئی۔ ایک پرانی دفعے کے مقرر کی جو شامت آئی، انھوں نے اپنی تقریر



ہیں مختلف حاعتوں کی مجلس اذیحسی پر اعتراض کرنا شروع کر دیے اور چونکہ خود عربی کے عالم تھے، جہاں تہاں اپنی علمیت کا سنگہ جانے کے لیے عربی کے جملے اور اقتباس بھی تفسیریں کرتے گئے۔ انظر مقررہ کے لیے اذیخا حوا، از علماء کی تنک سے سمت منغض ہوئے۔ جب جلسے کے اختتام پر وہ صدارتی تقریر کرتے کو اٹھے، تو انھوں نے موصوفہ کو آہٹ اٹھوں لیا اور ان کی عربی دانی کی دھجیاں بکھیر دیں۔ انھوں نے جو عربی فقرے کہے تھے یا اقتباس سنائے تھے، ان میں صرف دیکھو کی غلطیوں کی نشان دہی کی اور کہا کہ اگر دسروں نے ملی تعلیم کی طرف سے غفلت برتی ہے، تو آپ نے جو تعلیم پائی ہے، اسی میں کوئی ناسرخاب کا پیر حاصل کر لیا۔

اس کے بعد تو شہر میں اظہار کی دھاک مچھ گئی۔ جدھر ٹیکہ، اٹھلیاں، ٹھیس کہ دیکھو یہ انگریز لباس میں سوٹ بوٹ پہنے، اضر عربی کا اتنا بڑا عالم ہے کہ اس نے فلاں مولوی کی تقریر کی ہر ہر جملہ غلطیاں نکالیں۔

ماد لینیٹری سے تبدیلی ہوئی اور یہ حکومت مند کے پہلائی اور ریلوے کے ٹکٹوں میں ڈیجی ٹائسل میٹر کے عہدے پر مقرر ہو کر دی آگئے۔ یہاں ان کی علمی اور ادبی سرگرمیاں المصاعف ہو گئیں۔ جب ملک تقیم ہوا ہے، تو یہ آٹریلیا میں سندتان کے ٹیڈ کسٹر (مندوب تجارتی) کی حیثیت سے سندانی میں مقیم تھے۔ انھوں نے اپنی تجارتی حکومت پاکستان کو پیش کر دی، اور وہیں اس کے لیے سند دندب تجارتی بنا دیے گئے۔ وہاں سے ۱۹۶۶ء میں وطن واپس آئے جو پہلے مشرق پاکستان میں تعینات ہوئے، قیام چائنگا میں دل نہ تھا جن۔ اب جدو سہ ۱۹۵۲ء میں حکومت پنجاب میں سکڑاں اور پھر مہرئی حکومت پاکستان میں جانشین سکتر مقرر ہوئے۔ یکے آخر ۱۹۵۴ء میں پاکستان کے سفارتخانہ لندن میں میٹر مایاات، وزیر اقتصادیات مقرر ہو کر لندن گئے۔ وہاں سے ۱۹۵۸ء میں کراچی آئے اور جلد بعد ہی یہاں ملازمت سے کشن پر سکہ و کش ہو گئے۔ اس کے بعد کراچی کی ایک تجارتی فرم ڈین اینڈ دیر کے منیجنگ ڈائریکٹر مقرر ہو گئے تھے۔

بچپن کا ابتدائی زمانہ چھوڑ کر صحت ہمیشہ قابل رشک حد تک اچھی رہی۔ لیکن زندگی کی بے اخترا بیوں نے کہیں کا نہ چھوڑا۔ عارضۂ قلب کا پہلا حملہ سن ۱۹۵۹ء میں ہوا۔ بارے علاج معالجے سے بچ نکلے۔ لیکن دل کی بیماری ایسی ہے کہ اگر اس میں پوری احتیاط نہ کی جائے، تو یہ بد بخت کام تمام ہی کر کے پھینچا چھوڑتی ہے۔ اپنی فطرتی لذت آٹار گئی اور لامابالیا زپن کے طویل اظہر سے یہ احتیاط ہو نہ سکا اور بالآخر اسی میں ۲۴ فروری ۱۹۷۷ء کو کراچی میں جان بحق ہو گئے۔ کراچی کے فوجیوں کے قبرستان میں آخری آرامگاہ نصیب ہوئی۔

اپنی عربی فائسی کی تعلیم کی بدولت مکتوں ان کا رہبان تحقیق کی طرف راہ۔ اس نلنے میں انھوں نے بعض بلند پایہ علمی مضامین قلمبند کیے، جو مختلف رسا کل میں بکھرے ہوئے ہیں۔ انھیں جمع کر دینے کی ضرورت ہے۔ لیکن بنیادی طور پر ان کا حراج ودان پر درادشا عرانت تھا۔ رہی سہی کسر ان کی پیش کوششی اور تن پروری نے پوری کر دی۔ ان کے کلام میں ان کے تعلقات حسن و عشق کی بعض طلسمات موجود ہیں، جن سے واقفان حال بخیر نہیں۔ کلام کا مختصر مجموعہ "لذت آوارگی" ان کی زندگی میں پھینچا تھا (لاہور ۱۹۶۱ء) اس میں سب اصناف سخن کا کلام موجود ہے۔ اس کے بعد کا کلام بھی چھپ جانا چاہیے۔ تاکہ ضائع ہونے سے محفوظ رہ جائے۔

عربی فائسی کے بعد ان کا دوسرا موضوع مطالعہ مذہبیات تھا؛ اور اس میں بھی اسلام اور عیسائیت کا تقابلی مطالعہ عیسائیت پر ان کی بڑی گہری نظر تھی۔ اس کے عقائد سے نے کوشش کی کہ عیسائی سرگرمیوں اور دسیہ کاریوں تک اس کی تاریخ کا کوئی گوشہ ان سے مخفی نہیں تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ان اسلام کو ان کے ہر رنگ زمین ام کی موجودگی اور اس کے دور رس نتائج سے خبردار ہوں۔ اسی مقصد سے انھوں نے

انگریزی میں ایک کتاب لکھنا شروع کی تھا: Christianity in History: خدا معلوم، وہ اسے مکمل کر سکے یا نہیں؟ اور اس کا مسودہ کہاں ہے؟ بڑے کلام کی چیز تھی!

نمود کے چند شعر دیکھیے :

اک تری بے دخی سے دوست ! کتنے چہرے بھگتے  
بھول میں رنگ ! کہاں ! چاند میں چاندی کہاں !  
سحر کی ساکھ عارض و زلف سے بیاں نہیں  
لاکھ حیس جاں میں مون تیری سی وبری کہاں !  
تم نے تو جیسے عمر ہی بھر کی شب میں ڈھال دی  
یہی کبھی سن کہاں ! ابھی کبھی کبھی کہاں !

پھوڑے جاتے ہو جسے دیر اندہ پھر اسی دل میں بائٹے تھیں  
کاش ! وہ بھی تو کہیں مجھ سے کبھی دودھ جاؤ ، تو منائے تھیں

ری عاشقی ہے اثر تری دہری نے بھی کیا کیا  
دہی میں دہی بیدی ، دہی رنگیل ، ہمارے  
نہیں خوب کچھ ، نہیں زشت کچھ ، نگاہ و دل کا نام  
کبھی ہے چن کا چن خزاں ، کبھی ایک گل ہی ہمارے  
ہے محبت بھی عجب کھیل کر اس بازی میں  
لطف سے ہے کبھی لذت ، کبھی دشنام سے ہے  
راہ الفت میں اک ایسا بھی مقام آتا ہے  
کہ جہاں کام نہ آخاؤ ، نہ انجام سے ہے  
میں وہ عشق میں پہنچا ہوں وہاں اب کہ جہاں  
حاجت والے خود اپنے دل کا کام سے ہے

تھا جس پناہ کبھی اب وہ آؤ نہ رہی نیاؤ عشق کی پہلی سی آبر و نہ رہی  
تو ایک بار تو آؤں پھر میں تنہا کے مگر چہ اب وہ تنہا کی آبر و نہ رہی  
نہیں اتنا ہے پھر برق و باد سے سرشار نہی ہوا بھی کیا ساؤ گاؤ گزری ہے  
میں اپنے دلوں کی الفت سے آج باؤ آیا گزری ہے ، مگر ترساؤ گزری ہے

وہ کہتے ہیں: اگر تجھ کو جفا راحت نہیں ملتی  
 تو اعلیٰ چھوڑ دے، اس روئے الفت نہیں ملتی  
 اک دیا بھی مقام آتا ہے راہ عشق میں ظہر  
 جہاں انجام ہوتی کے لیے فرصت نہیں ہوتی  
 اس سے تو ہمیں انکار نہیں دنیا کی ساکھ کرم سے ہے  
 لیکن اس اپنی دنیا میں خود ساکھ کرم کی قسم سے ہے  
 تم حسن ہیں لاشانی ہو، تو کیا! سب جو ہے چنگ عشق میں  
 جس حسن کی شان دہاتے ہو، اس حسن کی آن تو ہم سے ہو  
 جب اس ہی توں گئی اپنی پھر کون کرے گا شکوے گئے!  
 اس کھیل کا سارا اطف ترے اک عطف و کرم کے کھلے ہو  
 ہم درانی بات مانتے ہیں، تم دنیا ہمیں جھاتے ہو  
 تم دنیا والے کیا جانو، یہ دنیا دل کے دم سے ہے  
 اگر عالم جب ہم دیکھ آئے، تب جا کے ہم معلوم ہوا  
 سب روئی اپنے دم سے ہے، عالم کا عالم ہم سے ہے  
 ہم جن پر ہر دم مرتے ہیں وہ ہم کو دیکھ کے دہتے ہیں  
 ہے یہ بھی پیاری کی صورت اس حسن کی شان ہی کرم سے  
 تقدیر محبت علم بنی سہی تسلیم ہمیں، افسوس  
 اس غم پہ خزاں خوشی قربان، یہ غم ہے، تو سب کچھ غم سے ہے

انہر کو سجدہ مزاح پر بھی خیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ بلکہ زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ ان کی  
 طبی شگفتگی اور جدت پسندی اور بزرگ بینی کے باوجود جوہران کے فکاہی کلام میں  
 کہتے ہیں۔ ان کے مجموعہ کلام میں کوئی منطقی مانت اس دوسری قبیل کی بھی ملتی ہیں۔ بخوشی  
 کے طور پر ایک نظم دیکھیے جس کا عنوان ہے: ایک وزیر کی دوسری شادی پر۔ اس  
 میں انشائیہ و غزل کا نتیجہ کیا گیا ہے:

کواچی میں کمر باندھے ہوئے سب یاد تھے ہیں  
 جو یہاں جا چکا ایک بار پھر تیار بیٹھے ہیں  
 جسے دیکھو، وہی ہے دوسری، بوی کے چکر ہیں  
 غنیمت ہے، نو قد جو یہاں دو جا رہے ہیں  
 نہ چھڑاے شیخ، ہم یہیں بچے چلے آگیا ہیں  
 تھے تو یہاں سو بھی ہیں، ہم سزا رہے ہیں  
 نہ کریں چار جب تک شیخ، جی کیوں مہنگے لیے  
 وہ دیکھ کے بھی کہتے ہیں کہ ہم بیکار بیٹھے ہیں  
 کہاں اب چین گھر کا، جبکہ بوی دوسری آئی  
 "نظر آیا جہاں پر سایہ دیدار، بیٹھے ہیں"  
 بلاے ناگہانی ہے، ہواے زودجر، شانی  
 جو بوی جیت کر اٹھے، وزارت ہاں بیٹھے ہیں  
 بھلا آپ کی لاشی چین دیتی ہے کسے؟ اظہار  
 بھی شوہر یہاں بھی نہیں بنے، لاچار بیٹھے ہیں

## ساگر نکو دری، بلونت گمار

نہاب کے ضلع جالندھر میں ایک مختصر قصبہ نکو در ہے، وہیں کے رہنے والے تھے۔  
۱۰ دسمبر ۱۹۱۳ء کو ۲۲ سالہ بلونت گمار کے والد سردار لال نکو در منڈی میں چھوٹا موٹا  
کام کرتے تھے۔ چونکہ گھر کے حالات تسلی بخش نہیں تھے، اس لیے بلونت گمار کی تعلیم  
غافل خواہ نہ ہو سکی؛ بشکل پرائمری کے درجے پورے کر سکے۔

جوش بنیوالہ کسی نہ کسی طرح گھر ہی سازی کا کام سمجھ لیا اور ماسی کو بسا وقت کا  
تذلیع بنایا۔ اس سلسلے میں مختلف شہروں میں قیام رہا۔ جب ۱۹۳۰ء میں جہاتما گاندھی  
نے ننگ ستیہ گرو شروع کیا، تو یہ بھی میدان میں کود پڑے، پکڑے گئے اور جیل پہنچے۔  
یہ تجربہ بعد کو بھی دو ایک مرتبہ ہوا۔

جیل خانے کے زمانے میں انھیں وہاں کے کتابخانے سے استفادے کا موقع ملا، جس  
سے استعداد میں معتد بہ اضافہ ہوا۔ اب انھیں شعر گوئی کا شوق تجرایا سدا ہوئے  
تو اپنے بڑوں میں روشن لال روشن لال روشن لال کی خدمت میں جانے لگے۔ ان سے شوق  
کونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں شعر کے حسن و قبح کی تمیز ہونے لگی۔ اس پر روشن نے انھیں  
اپنے استاد حضرت جوش ملیح آبادی (ف: جنوری ۱۹۷۶ء) کے حوالے کر دیا؛ یہ ۱۹۳۷ء

کی بات ہے۔ جوش صاحب کے حلقہ اہلذہب داخل ہونے کے بعد انھوں نے پھر  
کوئی اور در نہیں دیکھا اور آخر تک انھیں کے دامن سے وابستہ رہے۔ انھیں  
جوش صاحب کے طویل استفادے کا موقع ملا۔ شاعری کے علاوہ جوش صاحب کے  
دو شوق اور تھے: حقہ اور شطرنج۔ ساگر جب ان کی خدمت میں ہوتے، تو حقہ تازہ

کرنے کی خدمت اکثر ان کے حصے میں آتی۔ خود ایک شعر میں کہا ہے۔

مری آتش بیانی کیوں نہ پائے داد اے ساگر!

بھری چیں میں نے چلیں جوش سے کان بھند کی

۲۵ فروری ۱۹۷۷ء کو حلق کے کینسر سے جان بحق ہوئے۔ اولاد جسمانی سے کوئی نام بچا  
اپنی یادگار نہیں چھوڑا۔

اُردو ادب ہندی دونوں زبانوں میں معتد بہ کلام موجود ہے۔ خدایے اور افسانے بھی  
لکھے، ہندی میں رامین ڈراما کی شکل میں ”نزیلا“ کے نام سے لکھی تھی۔ ہنگولکا نامک  
بھی ہندی میں ہے۔ ایک پوسٹل ڈراما ”سودا“ نام کا بھی موجود ہے۔ افسوس کہ حالاً  
کی نہاد گاری کے باعث ان کی زندگی میں کوئی چیز شائع نہ ہو سکی۔ اُردو کلام کا  
انتخاب ”تدو جزوے عنوان سے ان کی وفات کے بعد شائع ہوا (نکود ۱۹۷۷ء)۔  
کلام بے عیب ہے جس کی حضرت جوش لیسائی کے کسی شاگرد سے توقع ہو سکتی ہے، لیکن  
اس میں کوئی نمایاں خصوصیت نہیں پائی جاتی۔

چند شعر ملاحظہ ہوں:-

دنیا میں خوشی سے وہ بشر وہ نہیں بھکتا      دنیا کے جو آزاد دستم بہ نہیں سکتا

جس کو نہیں کوئی بھی غم، اس کے ہے غمِ برگ      آرام سے دنیا میں کوئی وہ نہیں سکتا

بھوک کی سمجھانے سے باز آتا نہیں      بھوک کوئی ناصح کہ سمجھاتا نہیں

زند سے کیا نسبت اے ناصح کتے      وہ بھبک جاتا ہے، بھبکاتا نہیں

کس سے پوچھیں حالِ بابرِ نغمہ      خود ہاں جاتا ہے وہ آتا نہیں

اب مصیبت سے غم ہے، شبے شکل کوئی      موت نے آکے دیا خوب سہارا بھر کو

چاند سا ذولِ مضطر ہے، اے ناصح!      کس طرح ترکِ محبت ہو گوارا بھر کو

خود بھبکی تو بھبکی ہی دیواہِ محبت میں      مجھ کو لو انکی بھبکی، تو وہ، منزل پہ جاگ

محبت باعثِ آرامِ جاں معلوم ہوتی تھی      مگر اب باعثِ آزار کیوں ہے، ہم نہیں سمجھ

ذوقِ نظر جس سے، اوسب کچھ چلیں ہے      جب یہ نہیں، تو کوئی بھی صورتِ عین نہیں

جینا تب بغیر، تو زمانا تب حضور  
 آسانی بھی نہیں مجھے دشوار بھی نہیں  
 میری محبت میں اگر جذبہ کامل  
 کہ ہر دم دہی دہی منزل میں رہتا  
 یہ آرزو تھی کہ ہم شرح آلود کرتے  
 زبان چلتی تو آنکھوں کے گفتگو کرتے  
 جیسے آواز کی موت بھی محبت میں  
 حیات کے لیے کیا خاک آلود کرتے  
 اس سے بھی آگے کچھ منزل جین، عشق کی

کعبہ ہی کافی نہیں ہے سر جھکانے کے لیے  
 داغِ لالہ، خونِ لیل، رنگِ گلِ نورِ شفق

سرخیاں آتی ہیں اک دل کے قلم کے لیے  
 مٹ رہے، مٹ رہے، جہن جہن ہے بہار ہے  
 ایسے میں آئیگا زور جان پہاڑ کیا  
 یہ کم ہے کیا کہ ان سے ملاقات ہو گئی  
 لے دل! وہ بات کرتے ہر دم نگراؤ کیا  
 ہے تنہا ہی یہ موقوف مدارِ ہستی  
 یہ جو مرجائے، تو انسان بھی رہا ہمارا  
 کچھ سستی نہا ہے، کچھ نشہِ شراب  
 نظر ہے ان کے پاؤں، سکتا زبان میں  
 میری آنکھوں میں کھٹکتا ہے چمن، تیرے بغیر

ہر گئی ترے مجھے کا شاسا نظر آسمان ہے  
 کیا کھلے مری قیمت میں، خدا خیر کرے

چہرہ اُترا ہوا قاصد کا نظر آتا ہے  
 آپ کرتے ہیں جو منہ پھیر کے اقدارِ وقت

اس میں بھی صورتِ انکا د نظر آتی ہے  
 موت کے ایک ہی جھونکے سے یہ گر حبا نیگی

زندگی ریت کی دیوار نظر آتی ہے  
 چوٹیں بھی سو طرح کی کھا سنا ہڈی  
 صدے بھی شبِ غم کے اٹھا سنا ہڈی  
 تین شیشے سے بھی ۱۰۰ ادا کرتے ہے  
 اک ٹھیس لگے، تو ٹوٹ جاتا ہے دل

حالِ دانی کی، اور مستقبل کی  
 رہتی ہے خبر اسے ہر اک منزل کی



دنیا کے خیالات کا مرکز دل ہے      دنیا سے مگر جدا ہے دنیا دل کی  
 آجائیگی جس وقت اجل کیا ہو گا!      اس قدر بھل کا حل کیا ہو گا!  
 تو آج کی رات کو تو غم میں نہ بدل      ناداں اسے معلوم ہے کل کیا ہو گا!  
 جب غم پہ سر شاخ چنگ جاتا ہے      کاشا سامت کا کھٹک جاتا ہے  
 جو دل پہ گزرتی ہے، نہ پوچھتی ساگر!      منظور سردار لٹک جاتا ہے  
 بدنام کی صحبت کا ہے انجام برا      چوری سے بھی چوری کا ہے انجام برا  
 یہ قول بھی کیا خوب ہے، داناؤں کا      فرماتے ہیں: بد اچھا ہے بدنام بُرا

## محمود احمد عباسی، امروہوی

ان کے خاندان کا سلسلہ بواسطہ خلیفہ عباسی بغداد (امین الرشید) خلف ہارون الرشید (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ ابن عبد المطلبؓ) تک پہنچتا ہے۔ خلیفہ امین الرشید (۸۰۹-۸۱۳) حضرت عباسؓ سے نویں پشت میں تھے جب ۱۲۵۸ء میں ہلاکو خان نے بغداد کو تاراج کیا اور آخری خلیفہ رجبی عباس متعصم بغداد کو تہ تیغ کر دیا، تو اس خاندان کے اکثر اشخاص جان اور ناموس بچانے کی خاطر ترک وطن پر مجبور ہوئے۔ انہیں خلیفہ امین سے دسویں پشت میں مخدوم زادہ محمد یوسف بھی تھے، وہ ہندستان چلے آئے۔ یہ سلطان غیاث الدین بلبن کا عہد حکومت تھا۔ سلطان نے ان کی خاندانی عظمت اور علمی حیثیت کے پیش نظر انھیں بل تھول بل تھو یا "ادشایان شان منصب اور عہدہ عطا کیا۔ یہ خاندان ایک صدی تک آمد آسائش سے دلی میں مقیم رہا تھا کہ آٹھویں قہر خاوندی امیر تیمور کی شکل میں نازل ہوا۔ اب مخدوم زادہ محمد یوسف سے چوتھی پشت میں مولانا شمس الدین بیاباں سے نکل کر پنجاب چلے گئے اور زندگی کے بقیہ ایام انھوں نے وہیں بسر کیے۔ ان کے پوتے مولانا دکن الدین عباسی (ابن مولانا نظام الدین) سلطان سکندروادی کے عہد میں پنجاب سے نقل مکان کر کے امروہہ آئے۔ عباسیان امروہہ انھیں مولانا دکن الدین کے اخلاف ہیں

مولانا دکن الدین کی نویں پشت میں مولانا تیرداد علی شاہ عباسی پھللی صدی کے صاحبِ صورت و سیرت خرد گتھے تھے۔ شہرہ سے خاندانی جاہ و خردت سے سناوٹ

اور یاد اللہ میں مشغول رہے۔ اگرچہ باقاعدہ حضرت حافظ موسیٰ چشتی قادری ماہجوری سے بیعت تھے، لیکن دوسرے سلاسل طریقت مثلاً صابریہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ میں بھی خلافت و اجازت سے سرفراز ہوئے۔ تمام وقت مطالعہ کتب دینیہ میں صرف ہوتا یا عبادت الہی میں۔ پیر کے دن ۲۹ شوال ۱۲۹۷ھ (۴ اکتوبر ۱۸۸۰ء) کو اکیاسی سال کی عمر میں انتقال کیا۔ اردو میں شاہ علاؤل کل درگاہ میں، بلکہ انھیں کے پہلو میں دفن ہوئے۔

یہ احمد علی شاہ کے اکلوتے فرزند سید علی محمد عباسی ۱۲۴۷ھ (۱۸۳۱-۶۱۸۳۲) میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے دینی تعلیم اور درس نظامیہ کی تکمیل مختلف اساتذہ سے کی پھر حکومت انگریزی میں ملازم ہو گئے۔ اسی اثنا میں وکالت کا امتحان پاس کر کے لے بطور پیشہ اختیار کر لیا پہلے مختلف مقامات پر کام کیا، لیکن بالآخر اردو میں مقیم ہو گئے۔ ان کا کا شہر کے اکابر میں شمار ہوتا تھا یہ نہیں ۱۸۹۷ء میں رحلت کی اور اپنے والد کے پہلو میں جو احمد علی شاہ علاؤل میں دفن ہوئے۔

سید علی محمد عباسی نے اپنے زندگی میں دو نکاح کیے۔ پہلی بیوی سے دو بیٹیاں اور چار بیٹے ہوئے۔ سب کا نام کھنکھالوالت سے خالی نہیں۔ البتہ دو قابل ذکر ہیں: سب سے بڑے محمد اذہب عباسی جو کسی زمانے میں علی گڑھ میں طالب علم تھے اور جن کا حالی کے بعض اشعار کی تفسیر کے سلسلے میں بہت لوگوں نے ذکر کیا ہے، انھیں سید علی محمد عباسی کی پہلی بیوی کے بطن سے تھے۔ ۱۸۵۵ء رمضان ۱۲۸۰ھ (۲۹ فروری ۱۸۶۴ء) کو اردو میں پیدا ہوئے۔ ان کا بابتہ تپہ دق ۲۷ جون کو فتح آباد محلہ آگرہ میں انتقال ہوا؛ اور وہیں احاطہ عید گاہ میں دفن ہوئے (مقامہ ماجاویڈ ۲) میں دونوں ناخنیں غلط ہیں۔ ان کی شہرہ "لحم داؤدی" محمد احمد عباسی نے شاہ کی تھی۔ محمد داؤد کے چھٹے بھائی حکیم فرید احمد عباسی کا اپنے والد کے مشہور طبیبوں میں شمار تھا۔ وہ بڑوں طیبہ کلہ، دہلی کے پرنسپل ہیں۔

سید علی محمد عباسی کی دوسری بیوی شیخ غلام محمد مدنی کی صاحبزادی (صغیر النساء)

تھیں۔ ابی بکرم سے ایک میٹ اور جاریٹے ہوئے۔ محمود احمد عباسی بیٹوں میں سب سے بڑے تھے؛ یہ گویا محمود داد و عباسی مذکورہ صدر کے علاقائی بھائی تھے۔ جنگل کے دن ۱۲ جمادی الثانی ۱۲۰۲ھ (۲۱ مارچ ۱۸۸۵ء) بوقت صبح امر وہیں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے وہ اپنے نانا شیخ غلام محمد صدیقی کے زیر اثر آگئے، جو ان کے والد ہی کے ساتھ مقیم تھے۔ ۱۵۰۰ انھیں ادب اللہ کے واقعات سناتے، اگر کسی درویش کی ملاقات یا بزرگ کی زیارت کو جاتے، تو انھیں ساتھ لے جاتے۔ اس سے ان کے دل میں تاریخ اور سیرت اولیاء اور تصوف کا شوق پیدا ہوا، جس سے گویا بعد کے زمانے کے مطالعے کا رخ متعین ہو گیا۔

تعلیم کا زمانہ آیا تو امر دہائی اسکول میں داخلہ ملا۔ یہیں زیر تعلیم تھے کہ ۱۸۹۷ء میں والد کا انتقال ہو گیا۔ اب یہ اپنے دوسرے علاقائی بھائی ڈاکٹر محمد حسن عباسی کے پاس اتناؤ اور وائے بریلی میں رہنے لگے، وہاں میڈیکل افسر کی حیثیت سے تعینات تھے۔ دو سال بعد جب تک تعلیم بھی وہیں پائی۔ اس کے بعد لکھنؤ کا گزریں بھیج دیے گئے۔ وہاں یکایک اقامت گاہ سے باہر ایک ذاتی مکان میں رہتے تھے۔ اور وہی ان کی تعلیم سے بے توجہی کا باعث ثابت ہوا۔ نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین امر دہوی ان کے والد کے دوست تھے۔ اگرچہ انھوں نے لکھنؤ میں اپنے ایک ممتاز دوست کو ان کے حالات کی نگرانی اور تعلیمی رہنمائی پر مقرر کر دیا تھا، لیکن یہ صاحب اپنا فرض بوجہ احسن بجا نہ لے۔ غرض محمود احمد عباسی کی تعلیم نامکمل رہ گئی؛ لیکن ان نگران صاحب کی بدولت ان کا شہر کے متعدد اویسوں اور اکابر سے تعارف ہو گیا۔ انھیں میں شبلی اور شمس الدین تھے، تعلیمی زمانے میں اگر کسی کو مجلس آراپی اور حکماء پروردی کا چسکا ہڑ جائے، تو تعلیم کے لیے اس سے زیادہ ہلک اور کوئی پُر نہیں ہو سکتی۔ یہاں بھی یہی ہوا۔

مولانا شبلی اور شمس الدین کے زیر اثران کا زیادہ وقت تاریخ و سیرت کی کتابوں اور سیاسی اور قومی لٹریچر، رسائل و جرائد کے مطالعے میں صرف ہونے لگا، اور وہ انصاری کی فکر

بے پردا ہو گئے۔ چنانچہ استخوان میں بار بار ناکام رہے، اور سیاحت میں روز بروز زیادہ غور کرنے لگے۔

لکھنؤ میں مزید قیام بیکار بھی تھا اور ذریعہ معاش کے فقدان کے باعث تکلیف دہ بھی۔ چنانچہ مسلم اسکول، بریلی میں مدرس ہو کر چلے گئے۔ اتفاق سے یہی وہ زمانہ ہے جب مولانا حالی اپنے رگی کے رخصت ہوا سے عبدالولی کے علاج کے لیے یہاں مقیم تھے۔ جس طرح قیام لکھنؤ کے زمانے میں ہسپتالی اور شریعتی عمود احمد عباسی کی حوصلہ افزائی کی تھی، اسی طرح حالی بھی ان کے علمی ذوق اور ادبی رجحان کو دیکھتے ہوئے، ان سے لطف و عنایت پیش آئے عباسی صاحب نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا، ان کے معاشی تنگداری کا حقوق و حاصل ان کی اسی حالی سے ملاقات کا مہربان منت تھا۔ یوں رسمی تعلیم کا جو سلسلہ منقطع ہو گیا تھا، اس نقصان کی بھی کچھ تلافی ہو گئی۔

حال ان سے بہت شفقت سے پیش آئے رہے۔ دونوں میں خط و کتابت کا سلسلہ بھی تھا (جبکہ لکھنؤ کی حالت میں شائع شدہ مخطوطات سے ظاہر ہے کہ آخر کار انھیں کی سفاکش پر عباسی صاحب کو ۱۹۰۸ء میں آئی انڈیا مسلم ریکویشنل کانفرنس علیگز کے دفتر میں بطور نمائندگی معاون (پرنسپل اسٹنٹ) ملازمت مل گئی۔ عباسی صاحب یہاں ۱۲ برس رہے۔ ان میں سے تقریباً دس برس انھوں نے صاحبزادہ آفتاب احمد خان حائٹ بکٹر (ف جنوری ۱۹۳۰ء) کے تحت کام کیا۔ وہ ان سے بہت خوش اور مطمئن تھے۔ چنانچہ انھوں نے عباسی صاحب کو درجہ بدو جہرتی کی ادبی معاون اور پھر صدر دفتر کا قائم مقام پرنسپل بنا دیا جب تک وہ ستمبر ۱۹۱۹ء میں وزیر سبکی کوئٹل کے ڈکٹمن بن کر انگلستان تشریف نہیں لے گئے، یہ بے غش و غصہ کام کی تحسین کی مدد دیا (جنگ) مولانا محمد حبیب الرحمان خان شروانی (ف بکٹ ۱۹۵۰ء) بھی اسی زمانے میں حضور نظام دکن کی خواہش پر صدر انقصدور امور ندہی ہو کر حیدر آباد چلے گئے۔ ان کے بعد جن اصحاب کے ہاتھ میں کانفرنس کی

باگ ڈور آئی، ان سے اختلافات پیدا ہو گئے۔ کانفرنس نے صاحب زادہ صاحب موصوف کی سفارش پر انھیں اگلی طاق جا کر تعلیمی امور کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے چھ مہینہ وار پے ویلفیڈ دینا منظور کیا تھا۔ عباس صاحب نے سفر کے تمام اخراجات کھل کر لیے تھے۔ لیکن مخالفین کی ریشہ دوانیوں کے باعث نہ صرف یہ بل منہ سے نہ چڑھ سکی بلکہ انھیں ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اس کے بعد لمبی غیر حاضری کے بعد یہ اپنے وطن اردہ واپس آ گئے۔

یہ طویل قیام علیگر ٹھہران کے دل و دماغ کی صلاحیتوں کی نچنگل کے لیے بہت مفید ثابت ہوا۔ کانفرنس سے جو وقت بچا تو وہ اسے مطالعے میں صرف کرتے۔ کانگڑ اور کانفرنس کے کئی مخالفوں میں کتابوں کی بھی نہیں تھی۔ اس پر افسر سے ملے، جو کام اور علم کے قدردان تھے۔ عباس صاحب کے دل میں بھی انگ انگ اور کام کرنے کا دہرہ موجود تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے مختلف موضوعات کے بارے میں وسیع مطالعے سے اپنی معلومات اور لیاقت میں مقدرہ اضافہ کر لیا۔

اب اردہ میں مقیم ہوئے، تو دواہ عام کے کاموں میں دلچسپی لینے لگے، لیکن انسان وطن کے عدم تعاون، بلکہ عملی مخالفت کے باعث اس میں کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ اسی زمانے میں نولانا محمد علی جو ہر مرحوم (ف: جنوری ۱۹۳۱ء) نے دلی سے اپنا مشہور روزنامہ ”سیدورد“ جاری کیا۔ انھوں نے عباس صاحب کو بھی اس کے حینہٴ اداوت میں کام کرنے کی دعوت دی، جو انھوں نے قبول کر لی۔ اس سلسلے میں کوئی سال بھر دلی میں قیام رہا تھا۔

اردہ کے قیام کے زمانے میں انھوں نے ”تاریخ اردہ“ (جلد اول) اور پھر ”تذکرۃ الکرام“ (دومری جلد) اور تحقیق انساب ”تین کتابیں تصنیف کیں۔ انھوں نے جو کچھ لکھا تحقیق و تدقیق اور روایت و روایت کی تمام شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے، حتیٰ پڑوسی اور حق گوئی میں کسی کی رو رعایت ان کے سہراہ نہیں ہوئی۔

”تاریخ اردہ“ میں اور پھر ”تحقیق انساب“ میں کئی خاندانوں کا کچھ چٹھا تھا، اس

سے قدرتا بہت لوگوں کو رنج ہوا اور انہوں نے سخت مخالفت کی عباسی صاحب نے بکثرت برداشت کی، نقصان اٹھایا، لیکن جو بات صحیح سمجھی، اس کے اعلان سے باز نہ آئے۔ اس پر مقدمہ بازی ہوئی اور بحیثیت مدعی اور مدعا علیہ دونوں میدانوں میں وہ ہر طرح کامیاب رہے۔

انہوں نے ملکی سیاست میں بھی غلبہ حاصل کیا۔ ممکن ہے کوئی اور اثر بھی رہا ہو، لیکن وہ غالباً مولانا محمد علی کی صحبت میں کانگریس میں شامل ہونے۔ بعد کو امر و پاکستان کی کمیٹی کے صدر چنے گئے تھے۔ اور کچھ مدت وہاں کی ریسول کیس کے صدر اور آخر کی بحیثیت بھی رہے۔ ۱۹۳۶ء کے انتخاب کے سلسلے میں جب جو اہر لال منرو وہاں پر امر رہے تھے، ہیں تو وہاں جلسے کا انتظام بناو و نظم و ضبط کا اہتمام عباسی صاحب ہی نے کیا تھا۔

۱۹۴۷ء میں جب ملک کی فضا مکدر ہو گئی اور امر رہے کا قیام غیر محفوظ ہونے لگا تو وہ عارضی طور پر پاکستان چلے گئے، لیکن ان کا ارادہ وہاں مستقل قیام کا نہیں تھا۔ چنانچہ بعد کچھ دنوں حکومتوں کی طرف سے اعلان ہوا کہ اب رہا جرین کو اپنی مستقل حیثیت کا تعین کرنا پڑیگا، فلاں تاریخ کے بعد پاسپورٹ اور ملازمت کے قواعد نافذ ہو جائیں گے، تو وہ خدشہ ان داپس چلے آئے۔ یہاں ان کی خاصی بڑی جاداد وغیرہ بھی کچھ کتابیں بھی چھپ چکی تھیں۔ اس لیے معقول آمدنی تھی اور بسا اوقات کے لیے کوئی تنویرش نہیں تھی۔

ان کا نکاح ملا مان اللہ کے خاندان میں، ابراہیم علی صدیقی کی صاحبزادی (شکیلہ بیگم) سے ہوا تھا۔ اولاد میں صرف ایک صاحبزادی (برجیس فاحمہ) ہوئی، جو جناب سبط رسول فاروقی کے برابر مقدس آئیں۔ پاکستان بننے پر بیٹی اور دادا وہاں چلے گئے تھے۔ جب عباسی صاحب تقاضائے عمر سے زیادہ بیمار رہنے لگے، تو ان لوگوں نے اصرار کیا کہ آپ پاکستان چلے آئیے، تاکہ ہم آپ کی دیکھ بھال کر سکیں۔ یوں بھی اب امر رہے ہیں ان کا گون تھا! ہندو جی کے بلاسنے پر وہ ۱۹۵۱ء میں ہجرت

کر کے مستقلاً کراچی چلے گئے۔ جانے سے پہلے انھوں نے یہاں کی بیشتر جاداد فروخت کر دی تھی، بقیہ کے عوض میں شاید وہاں کچھ باغات وغیرہ لگئے تھے غرض انھیں وہاں بھی مالی پہلو سے کئی شوائی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

کراچی کے زمانہ قیام میں ان کی متعدد کتابیں شائع ہوئیں۔ وہاں ہفتے کے بعد سب سے پہلے "حقیقت خرم کبوتر" بھیجی جو اردو ہے ہی میں مکمل ہو چکی تھی، اور جس کا مسودہ وہ اپنے ساتھ لیتے گئے تھے۔ لیکن جس کتاب نے سب سے زیادہ شگامہ جاکیا، وہ "خلافتِ معاویہ و زید" ہے؛ یہ ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی۔ اس میں انھوں نے اہل معاویہ اور ان کے جانشین زید کو حق بجانب ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ قدرتی بات تھی، شیعہ حضرات نے سخت احتجاج کیا۔ حکومت نے عافیت اسی میں دیکھی کہ کتاب کی اشاعت ممنوع قرار دے دی۔ لیکن وہ عباسی صاحب کے خاموش نہ کر سکی؛ انھوں نے دو سال بعد اپنے نظریے کی تائید میں دوسری کتاب "تحقیق مزید شائع کی (۱۹۶۰ء) مخالفانہ جیسے وغیرہ اب کے بھی ہوئے، لیکن چونکہ انھوں نے جو کچھ لکھا تھا، اس کی تردید محال تھی، اس لیے مخالفین نے خوشی اختیار کی اور یہ کتاب قبیحاً پھینک دی۔

انھوں نے شہر نے اردو ہلکا ایک تذکرہ بھی مرتب کیا تھا۔ واصل یہ ان کی تاریخِ اردو ہے ہی کا ایک حصہ تھا۔ وہ یہ کام مکمل کر چکے تھے اور اس کا مسودہ بھی اپنے ساتھ لیتے گئے تھے لیکن یہ کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی۔ اگر ان کے سامانِ ان کے مسودات کی جھان بین کر کے اسے الگ کریں، اور شائع کر دیں، تو یہ اردو کی مستقل خدمت ہوگی۔

۱۳ مارچ ۱۹۷۴ء کو کراچی میں انتقال ہوا۔ طاقِ رد و کراچی پرسوسائٹی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔



## ہندوستان

مشہور افسانہ نگار، قوم کے کھڑی (چوڑھ) تھے۔ ان کا خاندان دراصل پنجاب میں نزدیک خلیج گوجرانوالہ (پاکستان) کا رہنے والا تھا۔ ان کے والد گوردی سنگھ صاحب بیٹے کے لحاظ سے ٹاکر تھے۔ ان کی اولاد میں پانچ بچے پیدا ہوئے: چار بیٹے اور ایک بیٹی۔ ایک بیٹا صغریٰ میں فوت ہو گیا تھا۔ چاروی زبان کے مشہور افسانہ نویس اور ناول نگار کرشن چندر (ف: مارچ ۱۹۷۷ء) ان کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ ہندوستان سے نو سال چھوٹے تھے۔ ان سے چھوٹے راجندر ناتھ تھے، جن کا بچپن میں انتقال ہو گیا۔ پھر بن سرلادوی (ف: ۸ مئی ۱۹۷۷ء) جو خود بہت اچھے افسانہ نگار تھیں۔ سب سے چھوٹے ایندنا تھا، ماشاء اللہ سلامت ہیں۔

ڈاکٹر گوردی سنگھ اس حیثیت سے ریاست بھارت میں ملازم تھے۔ ۱۹۲۳ء میں وہ دہلی کی ملازمت ترک کر کے کشمیر چلے گئے۔ یہاں وہ کشمیر کی ذیلی ریاست پوٹھ میں سرکاری اسپتال کے انچارج مقرر ہوئے تھے۔ ان کی عمر کا خاصا بڑا حصہ پوٹھ میں گزرا۔ انھیں اس ریاست کی ہر ایک تفصیل میں تین تین چار چار سال قیام کرنا پڑا تھا۔ ہندوستان سے یہیں پوٹھ میں ۱۹۲۳ء میں پیدا ہوئے۔ اس لیے ان کا بچپن بھی کشمیر کی دلغریب وادیوں اور تنگ دوس پہاڑوں، روح پرور نظاروں اور خوبصورت جھیلوں میں گزرا۔ یہیں حال بڑے بھائی کرشن چندر کا تھا۔ ان دونوں کی کہانیوں اور اداؤں میں جو فطرت کی نقاشی اور قدرتی حسن کی بکثرت تصویریں ملتی ہیں، ان کا پس منظر ان کے بچپن کا ہی ماحول ہے۔

جب تعلیم کا زمانہ آیا، تو کرشن چندر کی طرح انھیں بھی معاشی و کمزوریوں میں اپنی اہول  
میں بھیج دیا گیا۔ ہندو ماتھ نے انھیں درجہ مکت میں تعلیم پائی۔ کرشن چندر ان سے  
پہلے دسویں درجے کی سند لے کر فورمین کالج لاہور میں داخلہ لے چکے تھے  
ڈاکٹر گوہری شستری نے خیال کیا کہ اگر ہندو ماتھ بھی لاہور چلے جائیں، تو یہ نہ صرف  
ان کی تعلیم کے لیے بہتر ہوگا، بلکہ دونوں بھائی ایک ساتھ رہیں گے۔ چنانچہ ہندو ماتھ  
بھی لاہور آ گئے، اور ڈی، اے، وی این اسکول میں داخلہ لے لیا۔ دسویں کا امتحان  
انھوں نے ہی اسکول سے پاس کیا۔ اعلیٰ تعلیم انھوں نے بھی فورمین کالج میں ہی  
پائی، جہاں سے انھوں نے بی، اے کی سند حاصل کی۔

کرشن چندر نے ایم اے کے بعد ایل ایل بی کی سند بھی لی تھی۔ لیکن انھوں نے وکالت کا  
میشہ اختیار نہیں کیا۔ بلکہ عمل سیاست ورہ بھی یاری متمر کی (اور تصنیف تالیف  
میں لگ گئے) سیاست کا خاں خاں ان کے بس کی بات نہیں تھا، اس لیے انھوں نے  
بھاری پتھر جوڑ کر چھوڑ دیا، اور تصنیف تالیف کو بقیہ زندگی کے لیے اپنا ادھنا بچھوٹا  
بنالیا۔

اس زمانے میں سید احمد شاہ بخاری (پطرس) آل انڈیا ریڈیو کے مدیر (علی ڈائریکٹر) تھے  
اور وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر مستند اور موہنا اور یوں اور شاعروں کو ریڈیو میں جمع کر  
رہے تھے۔ جہاں کوئی جوہر قابل نظر آیا، انھوں نے اسے ریڈیو کی ملازمت کی پیشکش  
کر دی۔ اس کا نتیجہ تھا کہ اس زمانے میں آل انڈیا ریڈیو واقعی کائن ادب بن گیا، متعدد  
ادیب اس کے مختلف مراکز میں ملازم ہو گئے۔ کرشن چندر بھی اسی سلسلہ میں پہنچے۔ ان کا  
اختیار (برق) ۱۹۳۶ء میں چھپا تھا، جس نے انھیں شہرت کی شاہراہ پر گھڑا کر دیا۔  
اس کے بعد اور دو چادر چڑھیں۔ پطرس بڑے ذہین اور مردم شناس آدمی  
تھے۔ انھوں نے اس زوجہ ان مصنف کو ریڈیو میں آنے کی دعوت دی۔ یہ اپنے سیاسی بلکہ  
اتحادی خیالات کے باعث کچھ دن ٹال ٹول کر نہ دے، لیکن تاکہ احتیاج نے تو  
بڑے بڑے شیروں کو روباہ مزاج بنادیا، بھلا کرشن چندر کب تک اپنے انکار پر قائم

رہ سکتے تھے :- القصہ نومبر ۱۹۳۸ء میں وہ لاہور ریڈیو اسٹیشن میں ملازم ہو گئے۔ سال بھر بعد تبادلوں اور توڑتی پہنچ گئے۔ اور پھر کوئی سال بھر بعد نکھڑے۔

اکشن چندر جہاں بھی گئے، چند دناتھ ان کے ساتھ تھے۔ حق کے قیام کے زمانے میں ہندو ناسیہ بھی شاہد احمد دہلوی سے ملے اور ان کے افسانے بھی ساتھی میں شائع ہونے لگے۔ اگر کبھی اردو افسانے کی تاریخ لکھی گئی، تو اس وقت کھیلکا کر ساتھی نے اردو ناسیہ کے فروغ میں اور خود افسانہ نگاروں کی مدد اور ان کی شہرت میں اضافہ کرنے میں کیا اہم کارنامے کیے، خیر یہ دوسرا موضوع ہے۔ بہر حال چند دناتھ نے اس زمانے میں افسانہ لکھنے، اور ساتھی کے علاوہ اب دوسرے سالوں میں بھی چھپنے لگے۔

ہندو ناسیہ نے یہاں کئی دناتھ بھی لکھے تھے، جو تو ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوئے ایک مرتبہ یہاں کے قیام کے دوران میں دوستوں کے کہنے سننے سے انھوں نے حکومت ہند کے حکام پٹنالی میں ملازمت کا امتحان دے دیا، اور اس میں پاس ہو گئے۔ لیکن جب قومی حاضری کا سوال آیا، انھوں نے جانے سے انکار کر دیا۔

جب کرشن چندر ۱۹۴۱ء میں نکھڑے گئے، تو ہندو ناسیہ بھی ان کے ساتھ گئے، کرشن چندر پر وگرام اسٹیشن مقرر ہوئے تھے، اور خاص طور پر ڈراما کا شعبہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ ان دنوں میں شوکت تھانوی وہاں مضمون (اسکرپٹ) لکھنے پر مقرر تھے، تھوڑے دن بعد انھوں نے پھولی اوٹ پر وڈکشن، لاہور کی نوکری قبول کر لی، ان کی جگہ پر چند دناتھ کا فقرر ہو گیا۔

اب دیکھیے، تھوڑے دناتھ کا کرشمہ! ایک دن راجا ایک کرشن چندر کو مشہور نظم ساڑے بلو زبر احمد کا پونا سے بلایا کہ اگر آپ ہماری فلموں کے لیے مکالمے لکھنے کی خدمت قبول کرنا چاہیں، تو ملے آئے۔ دوستوں نے انھیں بھیایا کہ جی جانی سرکاری نوکری چھوڑ کر ختم، ملازمت قبول کرنا دشمنی نہیں، لیکن وہ اچھی اس سرکاری نوکری جس سے ہزار روپے ملے تھے، انھوں نے مستغنی واصل کر دیا، اور پونا کی رہ لی۔ تصدیق کیا جاسکتا ہے کہ

اس سے اردو ادب کو کتنا فائدہ پہنچا۔ بہر حال، دونوں بھائی ۱۹۴۲ء میں پڑنا گئے اور دو سال احمد کے ساتھ رہے۔ ۱۹۴۴ء میں کرشن چندر نے ممبئی ایمیز سے معاہدہ کر لیا۔ دو ایک سال بعد (۱۹۴۵ء-۱۹۴۶ء) ڈیٹن شل ٹھیکر کے تعاون سے اپنی ایک پرانی کہانی پر مبنی فلم ”سرکے باہر“ بنائی۔ اس میں ہندوستان نے ہر دکان پر لٹ کیا۔ پھر دوسری فلم ”دل کی آواز“ بنی اور اس میں بھی ہندوستان پر دستے۔ (ٹھیکر خاقان نے کچھ دین کا رد لیا کیا تھا)۔

اس کے بعد اس نے جب فلم کہنی قائم کی، تو ہندوستان کوئی چار برس تک اس میں مکالمہ نہیں رہا۔ اس کہنی کی ایک فلم ”لالہ“ میں انھوں نے بطور اداکار بھی حصہ لیا تھا۔ خواجہ احمد عباس کی ایک فلم ”دھڑکے لالہ“ میں انھوں نے ”ساج سبک“ کا پارٹ ادا کیا تھا۔ اب ہندوستان کی بطور مکالمہ نویس اور فضاء نگار کے مسئلہ حیثیت تھی۔ لیکن وہ جو اہم مشاہدہ ہے کہ ہر گز کے دھڑکے کے نیچے اور کوئی چیز آگ یا پب نہیں سکتی، وہی حشر ہندوستان تھا کہ کرشن چندر کی وجہ سے ہوا۔ کرشن چندر کی شہرت اور عظمت کے باعث ہندوستان کو احساس ہو گیا تھا کہ لوگ مجھے میرا جائز حق دینے کو تیار نہیں، اس لیے وہ کچھ بے پردہ سے ہو گئے۔ ان کے بعض افسانوں میں زبان و بیان کچھ نمایاں نظر آتی ہیں، ان کا اصل سبب یہی ہے۔

ان کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ”فلم ڈائریکٹریشن“ کے عالم کی اور غلام آزاد سے فلم لکھنے والوں کے حقوق منوائے اور ان کا حق دلایا۔ وہ زندگی بھر بلا مقابلہ ان کے دشمن کے سمکڑ چکے۔ وہ تو ترقی پسند مصنفین کی تحریک سے بھی وابستہ رہے۔ ہندوستان کے افسانوں کے دس مجموعے چھپ چکے ہیں: (۱) چاندی کے تار، (۲) کہانی، (۳) دارلک پوئل، (۴) گالی، (۵) یہاں سے وہاں تک، (۶) ہندوستان سے ہندوستان تک، (۷) چاں میں رہتا ہوں، (۸) میرات، (۹) نئی بیاد، (۱۰) تہتا، تہتا، (۱۱) داغ میری، ذکر تیرا۔

ان افسانوں کے مجموعوں کے علاوہ ہندوستان میں (۱) آدمی اور گئے، (۲) رات اندھیری

ہے؛ (۳) سورج، درخت اور گناہ؛ (۴) دھواں؛ (۵) پیاد کا موسم؛ (۶) ایک شمع منہزا اور پروانے؛ (۷) منزل ایک، مسافر دو، تیری صورت میری آنکھیں؛ (۸) نیند؛ (۹) روپا؛ (۱۰) بچن؛ (۱۱) نیر سے پیرو؛ (۱۲) درد کا دشت؛ (۱۳) ٹھوکر؛ (۱۴) اور ان کی سچ۔

ان کی متعدد کہانیوں کے تراجم ہندستان کی مختلف زبانوں کے علاوہ روسی اور دہلوی زبانوں میں ہوئے ہیں۔ ان کی کہانیوں پر گوہ کی (روسی، اور موپاساں (فرانسیسی) افسانہ نویسوں کا بہت اثر ہے۔ اور ان ہی کی طرح بھوک اور جنس ان کے خاص موضوع ہیں۔

۲۰ مارچ ۱۹۷۷ء کو بھی میں بجاؤندہ قلب انتقال کیا۔ لاہور فوت ہوئے۔

## حمید احمد خان، پروفیسر

اردو صحافت کی اور جامع ملک کی تحریک آزادی کی کوئی تاریخ الاہور کے رہنما زمیندار اور اس کے مدیر شہیر مولانا ظفر علی خان (ف: نومبر ۱۹۵۶ء) کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ زمیندار ور اصل مولانا ظفر علی خان کے والد مولوی سراج الدین احمد خان (ف: دسمبر ۱۹۰۹ء) نے ہفت روزہ کی شکل میں جادی کیا تھا۔ ان کے زمانے میں یہ دہلی زمینداروں اور کسانوں کے کام کا ذرا حتمی پرچہ تھا۔ اسے سیاسی اور علمی روزنامہ قرار دیا کی وجہ سے بعد مولانا ظفر علی خان نے بنایا۔ لیکن اس وقت مجھے "زمیندار" کی تاریخ لکھنا منظور نہیں۔

مولوی سراج الدین احمد خان کی ساری اولاد اشعار اشعار سے یک بڑھ کر ہوئی۔ انھوں نے اپنی زندگی میں دو کتابیں لکھی۔ بڑی بیگم کے بطن سے تین بیٹے پیدا ہوئے: ظفر علی خان، غلام حیدر خان اور محمد اکبر خان؛ چھوٹی سے بھی تین ہوئے: محمود احمد خان، حامد علی خان اور حمید احمد خان۔ ہر ایک نے اپنے اپنے میدان میں نمایاں خدمات سر انجام دی ہیں اور ہمارے نثر، مضمون، علم و ادب کو الٹا مال کیا ہے۔

یہ خاندان دراصل کرم آباد تحصیل وزیر آباد، ضلع گوجرانوالہ، پنجاب، حال پاکستان، کا رہنے والا تھا، لیکن حمید احمد خان یکم نومبر ۱۹۰۲ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ دہلی درجے تک ان کی تعلیم چرچ آف اسکالرشپ بورڈ میں ہوئی، دہلی میں ہوئی۔ ایک بات قابل ذکر ہے کہ ان کی طالب علمی کے زمانے میں تاریخ ادب اردو (انگریزی) کے مشہور مصنف اور اہرسانیات ریورنڈ ڈاکٹر ٹامس گلکامپلی (ف: ۱۹۴۲ء)

اس اسکول کے منبجرتھے اور طلبہ کو انگریزی بھی پڑھاتے تھے۔ چنانچہ حمید احمد خان بھی ان کے شاگردوں میں سے ہے؛ بلکہ اپنی انگریزی کی قابلیت کے باعث یہ ان کے چہیتے شاگردوں میں سے تھے۔

۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۴ء تک میں بھی وزیر آباد کے وکٹوریہ ڈائمنڈ جوبلی ہائی اسکول کا طالب علم رہا ہوں۔ میں نے اسی زمانے میں ڈاکٹر دیلی کو دیکھا تھا۔ چونکہ ذکر کیا ہے، اس لیے غالباً جیل نہیں ہوگا، اگرچہ اس بطور جملہ معترضہ ڈاکٹر دیلی کا ایک لطیفہ محفوظ کر دوں:

ڈاکٹر دیلی اپنے طویل تیام پنجاب کے باعث بہت اچھی پنجابی سمجھتے اور لیتے تھے۔ اور انھیں اپنے لٹنے والوں اور طلبہ اور طلبہ کے والدین کے ساتھ پنجابی میں گفتگو کرنے میں خاص لطف آتا تھا، بلکہ وہ اس زبان میں بہت کامیاب و سرور کو کر کے بیا فخر عموں کرتے تھے۔ بعد کو انھوں نے ولایت دہلی پر پنجابی زبان سے متعلق متعدد کتابیں شائع کی تھیں۔ اس میں کوئی شہر نہیں کہ مسلسل مشق اور زراعت سے ان کی پنجابی سے واقفیت بڑھنا کہ حد تک وسیع ہو گئی تھی، اور وہ اس کے خاص کامیاب اور بے ہمتی کا دار تھے۔

ایک مرتبہ کیا ہوا کہ وزیر آباد کے مضامین سے ایک دیہاتی اپنے بیٹے کو اس اسکول میں داخلہ دلانے کو لایا۔ داخلے کی آخری تاریخ نکل چکی تھی اور درجے میں جتنی جگہیں تھیں، وہ پُر ہو گئی تھیں۔ طالب علم کے والد نے بہت منت سماجت کی، لیکن ڈاکٹر دیلی جس سے منہ نہ ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ درجے میں جگہ ہی نہیں رہی، ہم داخلہ کیسے منظور کر لیں، لیکن دیہاتی اس کے باوجود اصرار کیے جا رہا تھا۔ اس پر ڈاکٹر دیلی کو غنا کی سوچھی۔ فرمایا: اچھا، اگر آپ مجھ سے پنجابی میں کوئی بات ایسی کہیں جو میری سمجھ میں نہ آئے تو میں لڑکے کو داخلے کی اجازت دے دے گا یہ گویا ان کا اپنے پنجابی کے علم پر اعتماد کا اظہار تھا) اس پر لڑکے کے والد کی ہاچس کھل گئیں۔ اس نے بے اختیار کہا: اوسے تو کون ہوتا اس ایس چھوٹے نوں داخل نا کرن آلا؛ میں گھٹتی مادیرا تھیں بہت دیوٹھا (اوسے تم کون ہوتے ہو اس لڑکے کو داخل نہ کرنے والے! میں گھوٹا مادہ کرتھا اوسے نہ کا چیز توڑ دوتھا) اس فقرے کا پہلا حصہ ایسا مشکل نہیں

لیکن آخری حصہ واقعی مشکل ہے اور جس شخص کو دیہاتوں کے ساتھ رہنے اور ان سے مقامی روزمرے میں بااحتیاط کرنے کا موقع نہ ملا ہو، اس کے لیے یہ عیسر الغم ہے۔ پہلی نے جو یہ فقرہ سنا، تو ان کا منہ کھلے کا کھلا ہوا گیا۔ لیکن زبان دے چکے تھے اب وعدہ خلافی کیسے کرنے! کہنے لگے، اچھا صاحب! روکا تو داخل ہو گیا، لیکن جو کچھ آپ نے کہا، اب اس کا مطلب بتا دیجئے۔ جب دیہاتی نے معنی بتائے، تو بہت دیر بہکتے رہے (یاد رہے کہ یہ سادی گفتگو پنجابی میں ہوئی تھی)۔

تو خیر، دشواری کی منہ لینے کے بعد حمید احمد خان، حیدر آباد (دکن) چلے گئے، جہاں ان کے بھائی جناب محمد احمد خان عثمانیہ یونیورسٹی میں کیمسٹری ڈپارٹمنٹ کے صدر تھے (بعد کو وہ چندے ای یونیورسٹی میں رجسٹرار بھی رہے) حمید احمد خان سے عثمانیہ میں داخلے لیا اور تین سال بعد بی۔ اے آخر کی برہمن سے سند لی۔ وہ اس سال اپنے دے میں پوری یونیورسٹی میں اول آئے اور انھوں نے اول ڈیوٹن حاصل کی تھی۔ ایم۔ اے (انگریزی) کا امتحان انھوں نے بعد کو گورنمنٹ کالج، لاہور کے طالب علم کی حیثیت سے جناب یونیورسٹی سے دیا۔

حمید احمد خان بعد کے زمانے میں عام طور پر کہا کرتے تھے کہ میں حضرت مولانا عبد الباقی (رحمۃ اللہ علیہ) کا بیٹا ہوں۔ مولانا عبد الباقی ندوی (رحمۃ اللہ علیہ) اس زمانے میں جامعہ عثمانیہ میں فلسفے کے پروفیسر تھے اور حمید احمد خان کے استاد۔ ان کے دل و دماغ کی فوجات اس وقت بھی نمایاں تھیں، اور بعد کو وہ جس مقام پر پہنچے، وہ تو ہم حایوں کی برداشتوں سے بھی کہیں بلند تھا۔

حمید احمد خان نے ملازمت کا آغاز اسلامیہ کالج لاہور سے کیا؛ وہ جنوری ۱۹۴۲ء میں یہاں انگریزی کے مدرس (ٹیکر) مقرر ہو گئے۔ بہت کامیاب معلم ثابت ہوئے۔ اپنے ہمکار مدرسین اور اساتذہ اور طلبہ میں وہ یکساں ہر دو عزیز تھے اگرچہ وہ انگریزی پڑھاتے تھے، لیکن اُن سے محبت اور اس کی ترقی اور ترویج کا جذبہ انہیں دوشے میں ملا تھا۔ چنانچہ انھوں نے یہاں کالج میں بنزمِ فروغِ اُردو ”قائم کی“ اور کالج کے رسالے ”کریسٹ



کے ذریعہ اعلیٰ تھی۔

اکتوبر ۱۹۴۴ء میں ادارت تعلیم، حکومت ہند ڈائریکٹ آف ایجوکیشن کے ادارہ دہلی ہائی کنگ میں انگریزی کے مدرس مقرر ہو گئے۔ اگلے تین سال ان کا قیام دہلی میں رہا جب آفادی کے ساتھ پاکستان وجود میں آیا، تو اگست ۱۹۴۷ء میں وہ وزارت تعلیم حکومت پاکستان سے وابستہ ہو گئے لیکن یہاں وہ زیادہ دن نہیں رہے؛ فروری ۱۹۴۸ء میں اسلامیہ کالج، لاہور میں انگریزی کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ جلد ہی انھوں نے محسوس کیا کہ فاکلٹی کی سند نہ ہونے کے باعث ان کی آئندہ ترقی مشتبہ ہے۔ اس پر وہ ۱۹۵۲ء میں کیمبرج راجستھان ہو گئے اور وہاں سے ایم، اے، ڈا سٹری آف لٹریچر کی سند حاصل کر کے وطن آئے۔ ان کے مقالے کا موضوع تھا: دروہ سورتھ کی شاعری میں شہوانی اور مدحانی تصورات۔ پروفیسر آدبری مرحوم (دف: اکتوبر ۱۹۶۹ء) جو ان کے یو تھ بھی تھے اور ایک ممتحن بھی، چاہتے تھے کہ وہ سال بھر اور رک جائیں اور اپنے مقالے کا دائرہ وسیع تر کر کے اسے ڈسٹر فلیٹینڈ کریں، تاکہ انھیں پی ایچ ڈی کی سند دی جاسکے لیکن حیدر احمد خان کے خاکی حالات ان کے مزید قیام انگلستان کے لیے سازگار نہیں تھے؛ انھیں بادل انخواستہ واپس آنا پڑا۔ وہ اپنی پردہ اپنے اصلی کالج میں شعبہ انگریزی کے صدر مقرر ہوئے اور چار سال بعد ۱۹۵۷ء میں کالج کے پرنسپل بنادیلے گئے۔ ان کا پانچ سالہ عہد ادارت اس کالج کی تاریخ کا اترین دور ہے۔

ستمبر ۱۹۶۳ء میں انھیں پنجاب یونیورسٹی کا وائس چانسلر (شیخ الجامعہ) بنایا گیا انھوں نے اپنے زمانہ اقتدار میں پنجاب یونیورسٹی کی کاپی لٹ دی جس بنگلہ انگریزی کے سوسائٹی کوئی اور آواز نہیں مٹانی دیتی تھی، وہاں ایک سٹوڈنٹ دوسرے دوسرے تک سب کام اردو میں ہونے لگا۔ وہ خود اپنا دفتر کا کام اردو میں کرتے، رسلوں پر اپنی یادداشتیں اور حکم احکام اردو میں لکھتے، اور دوسروں کو بھی اسی کی ترغیب دیتے۔ اس امر کو عام اجازت تھی کہ وہ تمام مضامین اردو میں پڑھائیں۔ طلبہ کو کھلی چھٹی تھی کہ زبانے،

بی گدس سی ایم سے تک تمام امتحانات کے پرچوں کے جواب اُردو میں لکھیں۔ اور توادہ  
تلامذہ امتحانات کی اساد بھی اُردو میں چھپنے لگیں۔ وہ سادی زندگی انگریزی پڑھاتے  
رہے اور یہاں سے دلاست تک سب معترف ہیں کہ وہ بہت اچھی انگریزی بولتے اور  
لکھتے تھے۔ لیکن اپنی گفتگو یا اُردو تحریر میں، اصطلاحات کے اسوا، وہ بھی انگریزی کا  
لفظ استعمال نہیں کرتے تھے۔ ان کے دماغ میں دونوں زبانوں کے خانے الگ الگ  
تھے جب ایک بند ہو جاتا، تو دوسرا کھلتا: وہ دونوں کو آپس میں گونڈ نہیں  
کرتے تھے۔

یہ پاکستان کی سیاست کا دہرایا تو بی تھا، اور وہاں ایکسٹنٹ قسم کی نوکر شاہی عالمہ چو  
میں آگئی تھی۔ ہر سرکاری دفتر اور ایریا غیر افسر برادری میں داخل در مقولات دنیا  
اپنا بدامنی حتی سمجھتا: اور حرجید احمد خان ضابطہ قانون کے حدود و پابند۔ ان کا  
اصول یہ تھا کہ تعلیم کا درجہ سب سے بلند ہے، اور کبھی "بیر دلی" کا پینورٹی کے معاکا  
میں ان کی اجانت کے بغیر، دخل دینا کفر کے مرادف۔ وہ خود کسی وزیر یا تدبیر تک کی  
حالات کو تو جانتے نہیں تھے، سکتے، "نائب سکرٹری" کا کیا ذکر ہے! ابھی ضرورت پیش آ  
گئی، تو ضابطہ کا خط پرچہ کچھ کو متعلقہ دفتر میں بھیج دیا۔ جہاں بنیادی اصولوں میں  
اور طریقہ کار میں یہ بعد المشرقیین ہو وہاں، بھلا کتنے دن "انٹیمٹ" سے گزرتی تھی یا  
کمال تو یہ ہے کہ اس پر بھی انہوں نے چھ برس گزار دیے۔ یہ حال اور باب حکومت کو  
ان کی آزادہ لکھی اور بقول شخصے "اکرہ" کھلنے لگی چنانچہ ان کے خلاف طرح طرح  
کی ابشر ددائیاں ہونے لگیں۔ اولاً طلبہ کو ان کے خلاف بھڑکانے کی کامیاب  
کوشش کی گئی۔ پھر ان سے کہا گیا کہ وہ طویل رخصت پر چلے جائیں۔ حمید احمد خان  
نے دیکھا کہ اس ماحول میں عزت باعز اور خود اداری کی قربانی دیے بغیر گزارا ممکن  
نہیں۔ اس پر انہوں نے "مطلے تو، بلفاسے تو" کہتے ہوئے، ۱۹۶۶ء  
میں استعفاء دے دیا۔

ابھی وہ اسلامیہ کالج کے پرنسپل تھے کہ حکومت نے مارچ ۱۹۶۶ء میں ان کی نشی اور

تعلیمی خدمات کے اعتراف میں انھیں ستاؤ و امتیاز کا اعزاز دیا۔ پھر یونیورسٹی کی خدمت کے دوران میں اگست ۱۹۶۸ء میں اس سے بھی اعلیٰ شادہ پاکستان کا نشان عطا کیا۔ جون ۱۹۶۴ء میں جاکارتا (دارالخلافت) اندونیشیا میں ایک بین الاقوامی اسلامی کانفرنس منعقد ہوئی تھی، اس کے اگلے برس مارچ ۱۹۶۵ء میں باندونگ میں ہونے والی اس دور پاکستانی وفد کے سربراہ تھے۔ ۱۹۶۵ء میں اس کے مستقل ادارے کے نائب صدر بھی چنے گئے تھے۔ اکتوبر ۱۹۷۰ء کی باندونگ کانفرنس میں بھی شریک ہوئے۔ یہ حقیقت ہے کہ یونیورسٹی کی داس پائلری کے دوران میں انھوں نے جس فرض شناسی کا ثبوت دیا اور جس محنت اور دلسوزی سے وہ فرائض انجام دیے، ان کی تندرستی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ ۱۹۶۹ء میں یہاں سے سبکدوش تو ہو گئے، لیکن اس کے بعد صحت کے پہلو سے بھی اہمیان نصیب نہ ہوا اس کے باوجود جب حکومت نے انھیں جولائی ۱۹۶۹ء میں ادارہ ثقافت اسلامیہ کا اضافی ڈیر (ایڈیشنل ڈائریکٹر) بنانے کی پیشکش کی، تو انھوں نے اسے اس خیال سے قبول کر لیا کہ اس سے ملک و ملت اور زبان کی خدمت کا ایک موقع پیدا ہو گیا تھا۔ سال بھر بعد یہ امتیاز اعلیٰ تاج کی ذمہ داریاں ۱۹۷۰ء پر وہ چلائی۔ ۱۹۷۰ء میں مجلس ترقی ادب کے ناظم مقرر ہو گئے۔ اپنی وفات پہلے ہی جہد سے پریشان تھے۔

انھیں فشار دم کا عارضہ تھا۔ اس کا سب سے پہلا حملہ جون ۱۹۷۲ء میں ہوا۔ اس کے بعد طبی حراست کے تحت وہ کچھ عرصہ تو رہنے لگے، لیکن کام کی وہ بھراؤ تھی کہ کچھ منقود تھا۔ ۲۲ مارچ ۱۹۷۴ء صبح دفتر جانے کے لیے تیار ہوئے تھے کہ رکت ہوئی۔ جذبات آدم کرنے کے بعد پھر جانے کو اٹھے گھر کے لوگوں نے بہت مسخ کیا کہ آج دفتر نہ جائے اور ڈاکٹر کو بلا کر اس سے مشورہ کیجیے۔ لیکن ان کا اصرار تھا کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اتنے میں دوسری مرتبہ رکت ہوئی اور ساتھ ہی یہوش ہو گئے۔ ڈاکٹر آیا، معلوم ہوا کہ دماغ کی رگ پھٹ گئی ہے۔ اسی حالت میں انتقال پہنچائے گئے۔ جہاں اسی دن شام کے چھ ماٹھے چھوٹے اپنے خانی حقیقی سے جا ملے۔

اُنٹا شہزادہ ایلیز کراچہ کوئی۔ خالہ اگلے دن سہفہ ۲۳ مارچ ۱۹۷۴ء کی صبح میں  
اتھا اُنہ انھیں کلنگ کے قبرستان میں (غالب روڈ اور سرشید روڈ کے مابین) سپرد خاک  
کیا گیا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے غفور و کریم کا سلوک کرے۔ آمین !

ظاہر شادانی نے اہ کے تخریج سے تادم بھی ہے :

ظاہر: اس کے سن رملت پر گھو کھینچ کے آؤ

”اہر و حبیب فردوس“ حید احمد خان

(۱۹۸۰ء - ۶ - ۱۹۷۴ء)

ان کی شادی ۱۹۴۲ء میں ہوئی تھی۔ اولاد میں چھ بڑے اپنی یاد گار چھوٹے سب سے  
بڑے سعید احمد خان ایم اے ایس سی ازم (س (امریکا) کیمیکل انجینیر ہیں۔ ان سے چھوٹے  
بیٹے خلیل احمد خان بھی انجینیر ہیں، جیل میاں بک میں ملازم ہیں، رفقا، منصور اور  
مناز بھی طالب علم ہیں۔ سلم اللہ تعالیٰ۔

جس طرح وہ بات چیت میں بہت کم گو تھے، اسی طرح کھنے میں بھی بہت محتاط اور  
سست رہتے۔ انھوں نے بہت کم کھاتے اور اس میں سے بھی بہت کم کتابی صورت  
میں جمع ہوا۔ لیکن چار سوال مقدار کا نہیں، بلکہ معیار کا ہے۔ ۱۹۷۲ء میں انھوں نے  
ایک انتخاب ”سیفۃ ادب“ و نظم و نثر شائع کیا تھا، جو نصاب کے لیے بہت موزوں  
ہے۔ لیکن وہیں ان کی اپنی سب سے پہلی کتاب حضرت رسول کریم صلعم کی مختصر سوانح  
ہے جو ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی تھی۔

اپنی علم جانتے ہیں کہ دیوان غالب کا نسخہ بھوپال، جو بعد کو نسخہ حمید یہ کی بنیاد بنا، ایک  
مرتبہ سے غائب اور قلمی دنیا اس سے استفادہ کرنے سے محروم ہو گئی ہے۔ خوش قسمتی  
سے حیدر احمد خان نے اسے اگست ۱۹۳۸ء میں بالا سیٹاب دیجا تھا، اداس سے  
یادداشت لے لی تھیں۔ انھیں کو مرتبہ کر کے غالب صمدی کے وقف پر جولائی ۱۹۶۶ء  
میں نسخہ حمید یہ شائع کر دیا اور اس طرح یہ دیوان دوبارہ ایک زیادہ حکم طور پر حمید  
کے نام سے شوب ہو گیا۔

ان کی تیسری کتاب ارمغانِ حالی ہے (لاہور، ۱۹۷۰ء) اس میں حالی کی نظم و نثر کا انتخاب ہے۔ اس کے دیباچے کا مطالعہ حالی کے سمجھنے اور اردو ادب میں ان کا مقام متعین کرنے کے لیے ناگزیر ہے۔ ان کی وفات کے وقت دو کتابیں زیرِ طبع تھیں، تعلیمِ تہذیب اور اقبال کی شخصیت اور شاعری؛ یہ بعد کو شائع ہوئیں۔

ان کی کئی کتابیں کم و بیش ترتیبِ تدریس کے آخری مرحلوں پر تھیں۔ ان میں غالب اور اقبال کے بارے میں بہت کام ہو چکا تھا۔ غالب سے متعلق مضامین مختلف رسائل و جرائد میں منتشر ہیں، ان کا ایک مجلد شائع ہونا چاہیے۔ انھوں نے اپنے معصروں اور بزرگوں کے حالات میں متعدد مضامین قلمبند کیے تھے، جو ۱۹۷۱ء میں چھپے تھے، انھیں بھی جمع کرنا چاہیے۔ غرض کہ شش کر کے ان کی تمام اردو اور انگریزی تحریریں کو منظرِ عام پر لانے کی ضرورت ہے۔

## افسر میرٹھی، حامد اللہ

میرٹھ میں سفیٹوں کا خاندان بہت مشہور ہے، بلکہ وہ محلہ جہاں ان اصحاب کی سکونت ہے، "محلہ سفیٹ صاحبان" کے نام سے موسوم ہو گیا ہے۔

اس خاندان کی تاریخ جیت پرانی ہے۔ شاہان مغلیہ کے عہد میں ان کے بزرگوں کو ضلع میرٹھ میں معافی کے چند ٹکڑے عطا ہوئے تھے جس سے انھوں نے میرٹھ میں سکونت اختیار کر لی۔ اس آخر زلے میں ان کے ایک فرد مفتی محمد عصمت اللہ ہوئے ہیں۔ وہ بھی اپنی خاندانی روایات کے حامل اور ذریعہ علم و فضل سے آراستہ تھے۔ اور طویل مدت مقامی گورنمنٹ اسکول میں اردو فارسی کے مدرس رہے۔ ان کے چھ اولاد ہوئیں: (۱) بلقیس، شعر بھی کہتی تھیں اور مقامی طور پر کافی مشہور ہوئیں؛ (۲) شفقت اللہ، (۳) حامد اللہ، (۴) مطیع اللہ۔ انھوں نے گورنمنٹ اسکول میرٹھ سے دسویں درجے کی سند حاصل کی اور اس کے بعد جیپو میں سکونت اختیار کر لی؛ وہاں اسکول میں معلم ہو گئے تھے۔ مئی ۱۹۴۷ء سے بالآخر ایم اے پاس کر لیا اور اسی اسکول میں ہیڈ ماسٹر مقرر ہو گئے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان چلے گئے تھے؛ غالباً راولپنڈی میں مقیم ہیں۔ شعر بھی کہتے ہیں؛ قرآن مجید ہے (۵) مبشرہ؛ (۶) ہوسنا۔ حامد اللہ ۲۹ نومبر ۱۸۹۷ء کو بننے خاندانی مکان (محلہ سفیٹ صاحبان) میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کمازما نہ آیا، نور الدین نے انھیں خود فارسی اور اردو پڑھانا شروع کی جیب کافی مستعد ہو گئی، تو حکم ہوا کہ روزانہ کسی اپنی پسند کے موضوع پر ایک مضمون اردو میں لکھ کر دکھایا کرو۔ موضوع کی قید نہیں تھی؛ یہ کسی برتن، پھول، چارپائی، بکائے بھینس

پر جو سکتا تھا۔ روزانہ نماز مغرب کے بعد وہ میضون دیکھتے، ادنیٰ آواز سے اسے دہڑھتے اور ہمیشہ اس کی تعریف کرتے۔ سال کے آخر میں یہ ۳۶۵ صفحات مجلد کرا لیے جاتے۔ اب آٹھ سال سے دو کام اُن کے ذمے ہو جاتے، ایک نیا میضون حسب معمول لکھنا، اور دوسرے پچھلے سال کے اسی تاریخ کے میضون کی شرح و سنائی سے اصلاح کرنا۔ مغرب کے بعد وہ یہ دونوں چیزیں والد کی خدمت میں پیش کر دیتے۔ وہ ہمیشہ کی طرح انھیں پڑھتے، تعریف کرتے اور لٹا دیتے۔ یہ سلسلہ برسوں تک رہا۔

یہاں ایک بات قابل ذکر ہے:

اگر کسی دن کسی وجہ سے میضون نہیں لکھتے تھے، تو والد ناراض نہیں ہوتے تھے، نہ زبردستی منع کرتے، بلکہ انھوں نے تنبیہ کا ایک انوکھا طریقہ اختیار کیا تھا شب کا کھانا باپ بیٹے دونوں روزانہ دیا اُٹھنے میں ایک ساتھ کھاتے تھے جس دن یہ میضون نہ لکھتے، وہ اندر بھلا بھگتے کہ آج کھانا صرف حامد اللہ کے لیے بھجا جائے، ہم کھانا نہیں کھا سکتے اور کھانا آج بھانے پر انھیں حکم ہوتا کہ کھانا کھاؤ۔ یہ ایسی سخت سزا تھی کہ ان کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتی۔ یہی وجہ تھی کہ تیز سے تیر بخا دمک کی حالت میں بھی وہ ایک صفحے کا یہ میضون ضرور لکھ لیتے تھے۔

رات کو یہ اپنے والدی کے پاس دیا اُٹھنے میں سوتے تھے۔ سونے سے پہلے وہ انھیں لوگوں کے بے بے لوگوں کے، خاص طور پر تاریخ اسلام کی برگزیدہ اور ممتاز شخصیتوں کے حالات اور قصے سنایا کرتے تھے۔ جب تک یہ انگریزی اسکول میں داخل نہیں ہوئے، وہ پہلا دستہ و ایک صفہ روزانہ لکھنے کا جادوی رہا۔ اس کے بعد اس میں ترمیم ہو گئی کہ اب موضوع اپنی پسند کا نہیں بلکہ پچھلی رات جو مذاہر کے واقعات سنائے گئے تھے، ان میں سے کوئی واقعہ ایک صفحے میں لکھا جائے۔

مفتی محمد عصمت اللہ بیٹے کو فارسی اور عربی کا عالم بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ انھیں مدرسہ اسلامیہ میرٹھ میں داخل کرایا گیا۔ لیکن جہاں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ سال بھر بعد اٹھایا ہو تو کسی میضون میں محنت نے انھیں پچاس ہجرت کے پرچہ میں پچیس ہجرت دے دیے۔

جب یہ بات مفتی صاحب کے علم میں آئی تو جیسا متعجب ہوئے۔ کہتے ہیں پاس تک تو خیر غیبت تھا، یہ بچپن کیسے ہو گئے؟ پانچ فاضل کہاں سے آئے؟ اس پر وہ کچھ بدظن ہو گئے، حامد اللہ کو مدرسہ عالیہ سے اٹھا کر دیوبند بھیج دیا، جہاں کے اکابر سے ان کے ذاتی تعلقات تھے۔ لیکن یہ وہاں سال بھر سے زیادہ ذرہ سکے۔ ایسے ہمارے پرے کر سب کچھ چھوڑ چھاؤ کو علاج کے لیے میرٹھ آنا پڑا۔ علاج سے اچھے تو ہو گئے۔ لیکن پھر دیوبند واپس نہ جاسکے۔ اب مفتی صاحب نے خود ہی پڑھانا شروع کیا۔ فارسی کا لغت اب ختم کیا، بلکہ اسی زمانے میں یہ فارسی شاعری کرنے لگے۔ پھر ان کے دو بزرگوار نے یہ فیصلہ کیا کہ انھیں عربی کی اعلیٰ تعلیم کے لیے جامعہ اندلس، قاہرہ بھیج دیا جائے۔ چنانچہ اس کا خرچ پورا کرنے کے لیے اپنا ایک مکان بیچنے کی تیاریاں کرنے لگے۔ اور ساتھ ہی سفر کے لیے پاسپورٹ کی درخواست دی۔ لیکن عربی کی تکمیل قسمت میں نہیں آئی تھی۔ پاسپورٹ کی درخواست منظور نہ ہوئی اور یہ مصر نہ جاسکے۔

اس اثنا میں ان کے ایک مکان میں آگ لگنے کے ایک نقشہ نویس کو یہ وار آگئے۔ ان کا ایک بیٹا اسکول کے ساتویں درجہ میں فارسی میں فیل ہو گیا۔ انھوں نے اپنے بیٹے کو انگریزی اور ریاضی کے مضامین گھر پر ہی پڑھانے کا انتظام کر دکھا تھا، لیکن فارسی کا کوئی معقول انتظام نہیں ہو سکا تھا۔ انھوں نے مفتی صاحب سے مشورہ کیا، تو انھوں نے حامد اللہ کو بلوایا اور پوچھا کہ انھیں پیشکش ہے، کیا آپ کوئی مدد کر سکتے ہیں؟ یہ اس طرح کے کو فارسی پڑھانے پر آمادہ ہو گئے۔ ایک دن اس لڑکے نے حامد اللہ صاحب سے پوچھا کہ کیا آپ انگریزی نہیں جانتے؟ ان کے نفی میں جواب دینے پر اس نے پیشکش کی کہ میں آپ کو انگریزی پڑھا دیا کروں گا۔ مشکل یہ تھی کہ وہ خود سادیس درجے میں پڑھتا تھا، اس لیے وہ زیادہ دن تک ان کا ساتھ نہ دے سکتا تھا۔ بہر حال یہ انگریزی پڑھنے لگے۔ جب ان کے والد مفتی محبت اللہ کو ان کے نئے شوق کا علم ہوا، تو انھوں نے جو صلاح فرمائی کی اور کچھ ابتدائی کتابیں بھی منگوادیں۔ استاد ی شاگردی کا یہ



سلسلہ دو برس تک جادی رہا۔ اس کے بعد بعض حسن اتفاق سے ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے ان کی زندگی کا رخ ہی بدلا گیا۔ اپنے ڈپٹی نذیر احمد کے دل کا رخ میں داخلے کا قصد تو پڑھا ہو گا کہ کیونکر داخلے والے دن پھر میں ان کا بالوڑیا تھا، جس سے وہ گر گئے، اور پرنسپل نے ایک کمر انھیں اٹھایا اور مفت صدقہ مالین آزادہ کے حوالے کر دیا اور مفتی صاحب نے ان کا امتحانی لے کر انھیں کالج کے عربی درجے میں داخل کر لیا۔ اور یوں وہ کسی مسجد کی پیش امامت سے بال بال بچ گئے۔ حامد اللہ کے ساتھ جو کچھ گزری وہ اس سے کم دلچسپ نہیں۔

ان کا وہ خاص کامیابی کا شاگرد اب کچھ نہیں تھا امتحان پاس کر کے مقامی گورنمنٹ ہائی اسکول کے نویں درجے میں داخلے لینا چاہتا تھا۔ جس دن داخلے کا فیصلہ ہونا تھا، یہ بھی اتفاقاً ٹھٹھے پہنچتے اس کے ساتھ اسکول چلے گئے۔ جس نے بتایا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب سب میڈارڈ کا خود امتحان لینگے، اور داخلے کا فیصلہ کریں گے۔ اسی سال نئے ہیڈ ماسٹر ویرم فریئر صاحب ولایت سے تشریف لائے تھے۔ سب میڈارڈ ان کے کمرے کے باہر جمع ہو گئے لیکن فریئر صاحب بنگلے سے برآمد ہوئے اور حکم دیا کہ سب طلباء ایک قطار میں کھڑے ہو جائیں۔ اس پر اسکول کے کوئی اور معلم آگے بڑھے، اور بچوں کی قطار بنونے لگے۔ جب میں نے حامد اللہ کو بھی قطار میں کھڑا کرنا چاہا تو انھوں نے کہا کہ میں داخل ہونے کو نہیں آیا۔ استاد نے ان سے پھر کہہ کر کہا: خاموش رہو اور چپ چاپ قطار میں کھڑے ہو جاؤ۔ اس معلم نے غالباً ابھی نہیں تھا کہ حامد اللہ نے کیا کہا ہے۔ طوعاً و کرہاً یہ قطار میں کھڑے ہو گئے۔ اب ہیڈ ماسٹر صاحب نے آگے بڑھ کر قطار میں سے لڑکوں کا انتخاب شروع کیا۔ وہ جس لڑکے کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتے تھے وہ قطار سے الگ ہو جاتا۔ یہ دونوں استاد شاگرد قطار میں ایک دوسرے کے برابر کھڑے تھے۔ پھر صاحب نے حامد اللہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور ان کے شاگرد (یا استاد) کو بھوڑ دیا۔ اب اسکول کے اسی استاد نے اس سے نام، تہذیب و چھٹا شروع کیا۔ یہ پھر امتحان کوئے لگے کہ میں نویں درجے میں داخل نہیں چاہتا۔ میں اس کے لائق ہی نہیں۔ لیکن وہ استاد

ہوئے کہ جب نو، ہیڈ اسٹر صاحب نے تھا داداؤں کے لیے انتخاب کر لیا ہے، تو تم کون جوتے ہو ان کے لوگوں کے لئے تو صاحب، یہ گورنمنٹ ہائی اسکول کے نوں دو جہیں داخل ہو گئے۔ خیر، یہ داخل ہونے کو تو ہو گئے، لیکن اس نعمت خیر منتر قبہ کے باعث اچھی خاصی مصیبت میں بھی گرفتار ہو گئے۔ انھوں نے تاریخ، جغرافیہ، ریاضی، حساب، الجبرا، آئیلوئس، وغیرہ کا کچھ نام بھی نہیں سنا تھا۔ پہلی سالہ کے اخیر میں اردو فارسی اور انگریزی میں تو کسی طرح پاس ہو گئے، بقیت مضامین میں صفر۔ اس پر والدین ان کے پڑھانے کے لیے خاص مشاہد کا انتظام کیا۔ ہشتاویں میں، ریاضی کے علاوہ دوسرے مضامین میں بھی بھلے بڑے پاس ہو گئے۔ پاس سے کچھ حوصلہ بڑھا۔ بہر حال سال کے آخر میں ششم پشتہ چل نکلے۔ غرض انھوں نے ۱۹۲۰ء میں میرٹھ کالج سے بی۔ اے کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد ایم اے اور وکالت کی تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیجے گئے۔ لیکن مین امتحان کے زمانہ میں انھیں تب عہدہ سنے آدو جا۔ میرٹھ چلے آئے اور امتحان میں شریک نہ ہو سکے۔ اس کے بعد تعلیم کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے منقطع ہو گیا۔

علی گڑھ کے قیام کے زمانے میں (۱۹۲۲ء) میں انھوں نے یونیورسٹی بورڈ مانگ باؤں میں رہنے کے بجائے شہر میں ایک کمرہ کر لیا۔ یہ کمرہ شہر بھر کے شاعروں کی آماجگاہ بن گیا۔ باہر کے شاعر بھی آکر ان کے وہاں قیام آواں دیتے۔ جٹو اور فانی کئی مرتبہ ان کے وہاں رہے۔ انھوں نے ایک پرچہ ”نوبہاد“ کے نام سے جاوی کر دیا جس کے لیے وہ خلیفہ حنون خود ہی تجویز کر کے دستوں سے مٹھنوں لکھوائے رہے۔ اس سلسلے کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس کا ایک حصہ دوسرے ہندی اور اردو کے مسائل میں چھپنے والے تمام مقالات کے لیے وقف تھا۔ اس زمانے میں ڈائجسٹ کا یہ تصور بالکل ناوارد تھا۔

جب وہ علی گڑھ سے واپس آکر میرٹھ میں مقیم ہوئے، تو معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں انھوں نے ایک مقامی اخبار ”انلیل“ کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے۔

ان کے دوستوں کی سند لینے کے بعد ہی سے والد ان کی ملازمت کے لیے کوششیں کرتے رہے۔ اس مشاوری میں پہنچا رہے تھے۔ ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ حامد اللہ صاحب نائب تحصیلدار

کے لیے نامزد ہو گئے۔ جب انہیں معلوم ہوا، تو انہوں نے والد سے احتجاج کیا کہ میں اپنی تعلیم جاری رکھنا چاہتا ہوں۔ اس وقت یہ میرٹھ کالج کے انٹرمیڈیٹ کے سیکرٹری تھے۔ والد نے ان کے شوق کے پیش نظر اصرار تو نہ کیا، لیکن یہ کہ اب ان کی مالی حالت اتنی اچھی نہیں تھی کہ وہ اتنے بڑے کیمپس کی پڑوشش کے ساتھ ان کی تعلیم کا خرچ بھی برداشت کر سکتے۔ کالج کے پرنسپل مسٹر جیمس کو جب معلوم ہوا کہ اس طالب علم نے سرکاری ملازمت پر تعلیم کو ترجیح دی ہے، حالانکہ اس کے گھر کی مالی حالت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ ملازمت قبول کر لیتا، تو وہ بہت خوش ہوئے۔ اس کا اظہار انہوں نے منجملہ ادب سہولتوں کے اس طرح سے کیا کہ انہیں ایک انگریز مسٹر نکسن کو اردو نصابی پڑھانے پر مقرر کر دیا۔ مشاہدہ چالیس روپے مقرر ہوا۔ لیکن ایک مہینہ بھی شکل سے گزرا جو حکام انہوں نے مسٹر نکسن سے کہا کہ میں آپ کو اردو نصابی پڑھاؤنگا، آپ مجھے انگریزی پڑھا دیا کیجیے! اس صورت میں آپ کو مجھے تنخواہ دینے کی ضرورت نہیں۔ تھوڑی سی جیس جیس کے بعد مسٹر نکسن اس انتظام پر راضی ہو گئے، جس سے دونوں کو بہت فائدہ پہنچا۔ چنانچہ ہمدان سے واپس جانے کے بعد نکسن صاحب فائدہ لیا۔ یونیورسٹی میں نصابی پڑھانے پر مقرر ہو گئے تھے۔ انہوں نے جامعہ اشرفیہ کی کئی نظموں کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا تھا۔

۱۱۔ اے کا امتحان پاس کر لینے کے بعد ڈاکٹر ضیاء الدین (ف: دسمبر ۱۹۳۷ء) نے گوش کی تھی کو یہ سرکاری ملازمت میں لے لیے جائیں۔ لیکن اصرار جتنے کہا کہ میں یا تو کتابوں کی اشاعت کا کام کر دوں گا، یا پھر تعلیمی محکمے میں پڑھانے کا۔ ۱۹۲۶ء میں ان کے والد مفتی محمد عصمت اللہ کا انتقال ہو گیا۔ تعزیت کے لیے آٹھ دنوں میں ان کے والد کے ایک دوست کا یونیورسٹی میں اچھا خاصہ اثر و رسوخ تھا۔ ان کی وساطت سے دسمبر ۱۹۲۷ء میں وہ گورنمنٹ جونی کالج، لکھنؤ میں اردو پڑھانے پر مقرر ہو گئے۔ یہیں سے ۲۳ برس بعد ۱۹۵۰ء میں سبکدوش ہوئے۔ ملازمت کے آخری زمانے میں وہ کالج کے کانسپرنسپل کے عہدے پر فائز تھے۔

ان کے آخری ایام بہت تکلیف میں بسر ہوئے۔ آمدنی تقریباً مفقود، اسباب میشت کی دولت فراوان گرانی، کجبر سنا۔ ان سب کے ترنٹنے نڈھال کر دیا تھا۔ تب وقت ہو گئی۔ یوپی حکومت اور یوپی اڈو کا ڈپٹی نے کچھ مال امدادی، لیکن حالت خرابہ خواہتر ہوئی چلی گئی۔ آخر کا بغرض علاج ٹھنڈی ٹیکل کا طرح کے تب دق کے شعبے میں داخل ہو گئے تھے، لیکن اب حالت علاج کی حدود میں نہیں رہی تھی۔ وہیں ۱۹ اپریل ۱۹۰۸ء سپرینسنتال ہو گیا۔ تجیز و تکفین اگلے دن ۲۰ اپریل کو ہوئی۔ تدفیم اطباء نے ٹھنڈی کے خاندانی قبرستان محلہ جھوانی ڈولر کی مٹھت میں بھی تھی۔

افسر نے شروگی بہت جلد شروع کر دی تھی۔ اول اول انھوں نے لوریاں اور گیت لکھے۔ یہ آج سے ۳۰ سال پہلے کی بات ہو، جب اڈو دواؤں کو ان باتوں کا علم بھی نہیں تھا۔ ان کی یہ لوریاں یوپی کے دیہات میں لڑیں اور بڑی بڑھیاں آج بھی اپنے بچوں کو سنا تی ہیں، اگرچہ یہ کسی کو معلوم نہیں کہ ان کا کھینے والا کون ہے۔ ان کا ایک مختصر مجموعہ "بچوں کے افسر کے عنوان سے لورائیں لکھی نے چند سال پیشہ شائع کیا تھا۔ افسر کا نام خاص کر بچوں کے شاعر کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہوا، لیکن انھوں نے نظم و نثر میں خاصا بڑا ذخیرہ اپنی یادگار چھوڑا ہے۔ ان کی سب سے پہلی کتاب "چاند چاند ہے جس میں چاند کہا نیاں ہیں۔ یہ کتاب جب پہلی مرتبہ چھپی ہے، تو وہ اثر کے پہلے سال کے طالب علم تھے۔

اس زمانے میں یہ گود کو ذیل انعام ملا، تو سٹرکسن نے انھیں مشورہ دیا کہ میگور کی کتاب کو سینٹ مون (سٹشو) کا اڈو ترجمہ کر دیں۔ چنانچہ انھوں نے ترجمہ کیا اور اس کا نام "ماوڑو دکھا (سٹرکسن) نے "چھوٹی چھوٹی کرنیں" نام تجویز کیا تھا۔ یہ ترجمہ بہت مقبول ہوا اور اس کے ساتھ "چاند چاند ہے جس میں چاند کہا نیاں ہیں" نام گیتام تھی، منظر عام پر آگئی۔ دونوں کتابوں کے سال بھر میں کئی ایڈیشن نکل گئے اور ان سے افسر صاحب کو اتنی یاقت ہو گئی کہ وہ اپنے تعلیمی اخراجات کی طرف سے مفکر ہو گئے۔

ماوڑو کے ترجمہ کا شاخسانہ ایک اور طرح نمودار ہوا۔ انگریزی کتاب کے ناشر (پابلیشر) نے

نے انھیں ہرجانے کا نوٹس دیا کہ تم نے عبادی اجازت کے بغیر ہادی "کاپی رائٹ" میں  
 کا ترجمہ کیوں چھاپا ہے؟ یہ بچہ سیدھے سادے آدمی سمجھا ان قانونی موٹر گاڑیوں  
 کو کیا جانیں؛ سکتے کا ٹکٹ لیا اور خود ٹیگ روکی خدمت میں جا بیٹھے۔ ٹیگ روکنے انھیں اس  
 ضلع سے نکلنے کی راہ بھائی۔ کتاب کا ہندی ترجمہ بعنوان "ششویہ" بھی چھپ چکا تھا  
 اور اس کے جملہ حقوق خود ٹیگ روکے پاس تھے۔ ٹیگ روکنے ان سے کہا کہ تم میک سیلن کمپنی  
 کے نوٹس کے جواب میں لکھ دو کہ میں نے اردو ترجمہ انگریزی سے نہیں بلکہ ہندی سے کیا  
 ہے۔ یہی انھوں نے لکھ دیا جس پر انگریزی ناشر خاموش ہو گئے اور یوں یہ جلال  
 گئی۔ اس کے بعد سے ٹیگ روکے عمر بھر کے لیے ذاتی تعلقات قائم ہو گئے۔

ان کی تصانیف کی مختصر فہرست یہ ہے:

۱۔ نظم: پیام روح (الہ آباد ۱۹۲۷ء)؛ جوئے ڈان (لکھنؤ ۱۹۵۳ء) دونوں میں  
 نظمیں اور غزلیں ہیں۔ دوسری کتاب پر حکومت ہونے لے ۵ روپے انعام دیا تھا۔ جنگ  
 آزاد (لکھنؤ ۱۹۴۲ء) دوسری جنگ عظیم سے متعلق نظمیں۔

۲۔ افسانہ: چار چاند (میرٹھ ۱۹۱۷ء)؛ ڈال کا جوگ (الہ آباد ۱۹۲۷ء)؛  
 آنکھ کا نور (لکھنؤ ۱۹۴۰ء)؛ پرچھائیاں (لکھنؤ ۱۹۴۵ء)

۳۔ ڈراما: مفت منظر (لکھنؤ ۱۹۴۲ء) ایک ایکٹ کے ڈرامے۔

۴۔ تنقید: نقد الادب (لکھنؤ ۱۹۳۵ء) تنقید کی تاریخ اور اس کے اصول؛  
 کتاب کی جنگ (لکھنؤ ۱۹۳۸ء)؛ ندرس (لکھنؤ ۱۹۳۸ء) تنقیدی اصول  
 اور نظریے (ادارہ فروغ اُردو لکھنؤ)

۵۔ ترجمہ: مامو (میرٹھ ۱۹۱۸ء) ٹیگ روکے کریسنٹ مون کا ترجمہ

۶۔ توہیات، ہارا جھنڈا (لکھنؤ ۱۹۵۸ء) پندرہ اگست (لکھنؤ ۱۹۴۷ء)

۱۰۔ تاریخ تحریک آزادی؛ گاندھی جی کے ساتھ (لکھنؤ ۱۹۶۰ء) گاندھی جی کے اقوال؛  
 حکایات گاندھی دستلم، دلی گاندھی جی کی روزمرہ کی زندگی کے سبق آموز واقعات۔

۷۔ متفرقات: آسمان کا ہمایہ (الہ آباد ۱۹۵۴ء) اور سٹ کی کہانی؛ ترقی

کی دایں ہر عملی نصیحت (بچوں کے لیے) جانوروں کی عقلندی کو سنگم، دلی، گلیوہ کا سفر نامہ (بچوں کے لیے) سوفٹ کی مشہور کتاب کا ترجمہ، مکانوں کی کھانی ان کے علاوہ انھوں نے بچوں کے نصاب کی متعدد کتابیں بھی لکھی تھیں۔ جو برسوں یوپی کے مدراس میں پڑھائی گئیں۔ بغیر مطبوعہ کتابوں میں ایک طویل مشنری ڈومسٹک ایسے ہیں انسان کی آفرینش کا مقصد بیان کیا ہے۔ ایک مڈس "ردم آخریہ" بھی ہے پاس کا موضوع اور ذمہ زب۔ اور دارا اشکوہ کی جنگ ہے۔ ایک اور کتاب "ذوق ادب کی تربیت" بھی لکھی تھی۔ ۱۹۶۷ء میں انھوں نے اپنی سوانح عمری لکھنا شروع کی تھی۔ خدا معلوم یہ مکمل ہوئی تھی یا نہیں۔

اب آخر میں چند شعر ملاحظہ کیجیے۔ بچپن کی ان کا طرہ امتیاز ہے۔ حسن فطرت کے دلدادہ اور رجائیت کے علمبردار ہیں۔ محب وطن اور دینی نوع انسان کے سداورد۔

ہزارینر بچوں کے مالک! مجھے بتا دے کہ کب تیرے  
کہ تیرے کعبے میں رہنے والا ابھی خدا کو بھی علم ہو  
مجھے بتانا تھا حال کچھ تو وہ دیکھتے تھے کہ حال کیا ہے  
مگر میں بے اختیار افسردہ رہ گیا تھا، آپ کا کرم ہے۔

چاہتے ہیں اب تو یہ سودا میان جستو کاش، منزل پر کوئی کہہ دے کہ یہ منزل نہیں  
آروں کا گوشہ دار میں آنا محال ہے۔ لیکن کسی کو نیند نہ آئے، اذکیا کرے

جب دل پہ نہ ہو قابو اپنا، کیا ضبط کریں کیا صبر کریں!  
مجھ جیسے کاش وہ ہو جائیں جو آؤ کو سمجھاتے ہیں

سب خوشی کا خیال آتا ہے دل ماؤس کا سب جاتا ہے

صدائیں آتی ہیں دھیمے نغموں میں گانے کی۔ ایکن پھر نہیں امید نیند آنے کی  
کیا پڑھتے ہو، کیا حالت ہے؟ جو پڑتی ہے وہ سکتے ہیں

پھر شام ہوئی، پھر رات ہوئی، یہ دن بھر دھوکے کی سی  
فطری ہنس خاموشی لیکن کچھ چوٹ بھی دل پر کھائی ہے  
یہیں لے کر دکھایا ہے، کچھ افسردہ چپ رہتے ہیں

یہ بھی اک نماشا ہے کا وہ بار الفت میں      دل کسی کا ہوتا ہے، بس کسی کا چلتا ہے  
اس قدر بھی الفت میں جو نہ کوئی بے قابو      دل میں سوچتا کیا ہوں منہ سے کیا نکلتا ہے  
انسان وہ ہے جو اے افسر! تھکرائے مصائب کو بہیم

ساحل جہ کہتی ہے دنیا، مہیا یہ ہے طوفانوں کا  
حسن ہستی کے اندر نقاب      حسن پھر بھی ہے حجاب اندر حجاب  
دیر کعبہ پر حقیقت تو کھلے      اب اللہ ہی دیکھے رخ سے نقاب  
جب سفر، افسر! کبھی کہتے ہیں      دیکھتے پھر کیوں تو تم منزل کے خواب  
موت ہے وہ ماز جو آخر کیلک ایک دن      زندگی ہے وہ معا جس کا کوئی حل نہیں  
جو جینا ہو تو پہلے زندگی کا مدعا سمجھے      خدا تو فیق ہے، تو آدمی خود کو خدا سمجھے  
پسندہ، جس کی امیدیں ہیں خزاں پر موقوف

شاخ گل سوکھ کے گر جلے، تو کا شا دبے  
کیف سا ان کوئی بھڑ سا بھی نہ ہو گا، افسر!

آنکھ جس بھول پڑا لی، وہی چاند بنے  
شعبے نہیں کم ہجر کے بارہ کی سحر بھی      یعنی وہی فطرت ہے، وہی بھڑی ہے  
اب آپ آئے دل کہیں، یاد دل کی تمنا      اک لگ سی افسر! مرے سینے میں بھڑی ہے  
جو علم حد سے زیادہ ہو، خوشی نزدیک ہوتی ہے

چمکے ہیں مسائے رات جب تاویک ہوتی ہے  
ہے زندگی عالم کی عمل ہی سے سراسر آزاد      فطرت کے برائے اسے اغشا ہے ہی راز  
پردہ از سے مل جاتی ہے جگمگ کو ترے تاب      تار یک ہے جگمگ کا جہاں، مگر نہ ہو پردہ از  
بے ادج کا، بے جان کی پھر آج ہے دنیا      دیران ہے، برباد ہے، تاراج ہے دنیا  
اب منہ نہیں یزدان سے گئی سننے کا، افسر!      انسان سے گئی سننے کی محتاج ہے دنیا

## اثر حیدر آبادی، صدیقی احمد

حضرت امیر مینائی (ف۔ اکتوبر ۱۹۰۷ء) کے شاگرد رشید فصاحت و بلاغت جلیل مانچوہری کے نام نامی سے کون اور دو ان واقعات نہیں ہو گا: وہ امیر القلعات کی ترتیب سے دسویں امیر استاد کے دست راست تھے۔ ۱۸۹۹ء میں جب نظام دکن میر محبوب علی خان شہنائی شہزادہ کی سرکے لیے قسریہ لگے، تو استاد داغ (ف۔ ۱۹۰۵ء) نے امیر مینائی کو، جنہیں وہ اپنے قیام واپس لے گئے، جاننے سے جانتے تھے، نادان کے مقام پر حضور نظام کی خدمت میں پیش کیا۔ اعلیٰ حضرت نے ایما فرمایا کہ امیر مینائی حیدر آباد میں رہا ہو، لیکن باطاعت چکے تھے، اور امیر بہت پریشان حال تھے۔ یہ سمجھ کر اس سبب لے کر انہوں نے برائے نام اور گونا گونی جہانپوری کو اس کے باوجود طوعاً و کرہاً دکن کا سفر لے کر انہوں کو سونپ دیا۔ لیکن یہ سفر حیدر آباد کا نہیں بلکہ ان کا سفر آخرت ثابت ہوا۔ جہاں حیدر آباد سے دیکر جانا ان کے مقدّم میں لکھا تھا۔ وہ ان پٹنپے کے چند ہی ہفتے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

امیر اس سفر میں اپنے چچے شاگرد جلیل مانچوہری کو بھی ساتھ لیتے گئے تھے۔ استاد کی وفات کے بعد جلیل حیدر آباد میں ہی مقیم رہے، اور انہوں نے بقیہ زندگی وہیں بسر کر دی۔ داغ نے ۱۹۰۵ء میں رحلت پائی تو ان کے بعد میر محبوب علی خان مرحوم جلیل سے مشورہ کرنے لگے اور جب ۱۹۱۱ء میں خود ان کی رحلت کے بعد اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خان نظام ہنوم ان کے جانشین ہوئے، تو انہوں نے بھی جلیل کی شاگردی اختیار کی۔ اس عہد میں جلیل کو بہت عروج حاصل ہوا۔ قدر دان شاگرد نے جاہ و منصب کے نوازے میں



کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ جلیل نے ہمیں حیدرآباد میں ۶ جنوری ۱۹۴۶ء کو سفر آخری اختیار کیا۔ رحمت اللہ تعالیٰ۔

صدیق احمد اختر انھیں جلیل کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے۔ وہ ۲۴ اگست ۱۹۴۱ء (۲۴ ذی الحجہ ۱۳۶۰ھ) کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی اور اس کی تکمیل (اعلیٰ تدریجہ العلماء لکھنؤ میں کی۔ یہ وہی زمانہ ہے، جب علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم (دفتر نمبر ۱۹۵۳) میں وہاں طالب علم تھے، ان دونوں کا یاد نہ بھی تھا لکھنؤ سے فارغ ہوئے تو یہ بھی والد کے پاس حیدرآباد چلے گئے۔ وہاں وکالت اور عدلیہ کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا۔ (۱۹۶۱ء) ملا لگا کچھ مدت پایگا، وقار الہام میں عہدہ داد عدالت کے طور پر کام کیا، بعد کو ۱۹۶۵ء میں ریاست کی باقاعدہ ملازمت مل گئی اور منصف دیوانی مقرر ہوئے۔ بعد میں ترقی کو کے ناظم ضلع عدالت کے عہدے تک پہنچے اور بالآخر یہیں سے ۱۹۷۳ء میں وظیفہ حسن خدمت (پنشن) پر سکد و شش ہوئے۔ وظیفہ پانے کے بعد حضور نظام نے اول بہتر تشریف خاں مقرر کیا، پھر محکمہ صرف خاص (دیوبند پریس) میں منصف بنا دیا۔ وہاں کی ایجاد پوری کر کے بعد بھی فراغت اور فارغ البالی کی زندگی بسر کی۔ چونکہ مکھن پڑھنے کا شوق تھا اور اب کوئی دفتری ذمہ داری حائل نہیں رہی تھی، اس زمانے میں انھوں نے ایک گلدستہ فصاحت (دہلی) جاری کیا۔ اس میں مشاہیر عہد کا کلام شائع ہوتا تھا۔

جلیل کے انتقال (۱۹۷۶ء) کے بعد حضور نظام میر عثمان علی خان مرحوم اپنی وفات (۲۴ فروری ۱۹۶۷ء) تک اثر سے مشورہ سخن بھی کرتے رہے۔ انھوں نے اپنے کلام کی ترتیب و تدوین اور اشاعت کی نگرانی بھی ان کے سپرد کر دی تھی اور اس سلسلے میں احکام بھی جاری ہو گئے تھے۔ ان کی وفات کے بعد نظام ٹرسٹ قائم ہوا، تو محکمہ جاہ جہاد و نواب میر برکت علی خان بالہا نے اثر کو ادبی ٹرسٹ کا صدر نامزد کر دیا۔ چنانچہ نظام بہتم مرحوم کا کلام مرتب ہو گیا اور اب شاید زیر طباعت ہے۔

وفات سے قبل دونوں آنکھوں میں بو تیا بندہ تر آیا تھا، جس کا آپریشن نہیں ہو سکا تھا۔

فہرستِ قریبیائی بالکل زائل ہو گئی۔ اس کا اثر ان کے دماغ پر بڑا اور تو اذن قائم نہ رہا؛ سو جو بوجھ بڑھ سکتا نہیں تھا۔ دماغ کا علاج، خوردقوت تک جاری رہا۔ اسی حالت میں اپنے مکانِ جلیل منزل، حیدرآباد میں بیٹھے کے دن ۲۷ اپریل ۱۹۷۳ء (۱۲ ربیع الثانی ۱۴۱۳) فجر سے پہلے چار بجے انتقال کیا؛ عہد برس کی عمر پائی۔

خطا صالحین (نام پکی حیدرآباد) میں پسر درخاک ہوئے یہ سرکاری قبرستان ہے۔ اعلیٰ حضرت پیر عثمان علی خان مرحوم کے عہد میں یہ قبرستان مخصوص بزرگ شخصیتوں اور عمائدِ مملکت کے دفن کرنے کو استعمال ہوتا تھا، اب یہ بھی نظامِ چہرلی ٹرسٹ کی نگرانی میں ہے۔ ان کے والد حضرت جلیل بھی اسی قبرستان میں آسودہ خواب ہیں

کتبہ مزاک کے لیے ان کے برادرِ خورد جناب علی احمد جلیلی نے جیسوی میں تادخہ کیں؛  
 وہ جو تھے صدیقی احمد خوش بسیر کر گئے اس دارِ فانی سے سف  
 باے بسم اللہ سے مصرع ملا فاتحہ پڑھ کر اشر کی قبر

(۲۱۹۷۳ + ۲۱۹۷۳ = ۲۱۹۷۳)

رحوم صاحب فن تھے جلیل کی قدرتِ کلام اور اہماتِ فن ان کے متعدد نظم و نثر کے مجموعوں سے عیاں ہے۔ اٹھاپنے والد کے شاگرد اور شیخ تھے۔ انھیں کی طرح دمو و بشر اور کلماتِ عروض گویا ان کی گھٹی میں پڑے تھے جلیل کی ذات کے بعد ان کے اکثر کلاموں نے اثر سے رجوع کیا۔ اثر کا ضمیمہ دیوان ان کی زندگی میں مرتب ہو چکا تھا، لیکن انھوں نے کہ آج تک اس کے شائع ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ چند شعرا خط پوں، جوان کے برادرِ خورد جناب علی احمد جلیلی نے غایت فرمائے ہیں:

جہل منظور ہو یا قتل نہیں اس سے غرض	جان دیتا ہوں میں اس پر کہ مجھے یاد کیا
اس سے ظاہر ہے کہ بے شاق جدائی میری	بال دہر بانہ کے حیا دے آؤاد کیا
ترسے دامن کی ہوا بھی کہ صبا کے جھونکے	مجھ کو نہوا صفتِ نہجیت بر باد کیا
وہ دل بیٹے کو آئے ہیں، مگر فردِ تماشہ ہے	ہجومِ حسرت و رنجِ دالم میں دل نہیں
تیری تصویر کا رازِ غموشی کما کوئی جانتے!	وہ چپ لیں ہو کہ کوئی بات کے قابل نہیں

کہاں کھو یا کہاں بھولا، خدا جانے کہاں چھوٹا  
اُٹا اشعار تیرے سن کے اہل ذوق کہتے ہیں  
مشرکانشکا کہتے ہیں مجھے  
گھٹا کی آنکھوں میں بھی آنسو آئے

دچھو سیکلی جہنم کی آگ دندوں کو  
پھر ایسے دیکھنے والوں سے تنگ آئے ہیں  
ادائیں مست، نظر مسخ، چال میں سستی  
دل جلوں سے بڑھ گئی مدنی تھادی بزم کی  
تقی لڑا سنی نے، مگر تیرے کرم سے ساقیا!  
کہتا ہے پیانہ از گیل د سرو و کسن کا  
دیر یہ خنداے دہ بخاند ہوں ساقی!

موسم گل میں چمن گزشتہ میخاند ہے  
دہا اچھا ہے جو ہے بزم و چمن میں آواز  
دی صدا آہ نے، جب نازک جلا دیا  
ادراک تیرے کہہ کو مجھے اس نے مارا

کیا تو وضع ہے جو ہم کو چڑھتا کو چیلے  
جام و خم دینا سے ہر دم ہے سنا ساقی  
کرتا ہے دہ عالم میں وہ مشربیا، لیکن  
ترا بھی وکدو کیا، لے باغبان ہے

خیال زلف میں بہتے ہیں آنسو  
کہاں پہنچی ہے، مشق خاک آؤ کو  
بر منزل پہنچ کر پوچھتا ہوں  
چمک اٹھیل اب قفس آخر کی

مجھے کوچے میں کبے ڈھونڈتا ہوں دل نہیں لٹا  
غنیصہ ہے یہ ناقص، جب کوئی کال نہیں لٹا  
وہ ہے میری داستانِ دردِ دل  
سُن رہے تھے جو بیانِ دردِ دل

جو میکے میں ہے دوبا، جوا شراب میں ہے  
کر آئند بھی وہاں آج کل عتاب میں ہے  
جو میکے میں ہے عالم، وہی شباب میں ہے  
آہ کی چنگاریاں شمعِ شبناں میں بھیجیں

پیا س میں وہ چند بوندیں آبِ چوہاں ہو گئیں  
کیا رنگ ہے جو بن ہے عروسانِ چمن کا  
ساغر ہو عنایت کوئی صبا سے کہن کا  
ہر طرف خندہ گل، خندہ پیمانہ ہے

گل کا بلبل، نکسی شمع کا پیر دان ہے  
کے تجھے اب تو قرار لے دلِ نازا دیا  
ہو گیا دل جو نفاذ، تو جگر یاد آیا  
پیشوئی کے لیے نازک جلا دیا

میں ہوش میں کب ساقی بیگناہ نہیں ہوتا!  
پرفے سے حیاں رقصے جانا نہیں ہوتا  
ففس آباد، دیراں آستیاں ہے  
اندھیرے میں دواں یہ کاروں ہے

زمین نیچے ہے، اوپر آسمان ہے  
یہ تبتلا دد، مری منزل کہاں ہے  
جہیں اس کی ہے، تنگ آستیاں ہے

نئے چائے نگہ مست ، رہیں ہم بشار  
 طرف آتنا ترے قربان کہاں سے تائیں !  
 ہاں لی بات آن کی دھوکا ہو گیا  
 ہفت میں خونِ تنہا ہو گیا  
 حشر کا دن بھی ترے خوف کا دن ہے ، لیکن

منہ دکھانا نہ ، اہی ! شب تنہائی کا  
 حوصلہ دل کا ، زلزل سے زلزلے کا  
 آنکھ بن بن کے مرے دید کا ترے نکلا  
 بھاڑنا جیب و گریباں کا بہار آنے پر  
 عاشقوں کا یہ طریقہ گل تر سے نکلا  
 اتنی نسبت مری بخشش کو بہت کا ہے  
 تیرا بندہ ہوں ، ترانا نام یا کرتا ہوں

## حضرت مکی، مولابخش

کسی زمانے میں چیونٹ، ضلع جھنگ، پاکستان، میں قصابوں کی برادری ٹری باڈر اور متمول تھی؛ شاید اب بھی ہو۔ مولابخش اسی خاندان کے نو ذر نظر تھے۔ چنانچہ وہ بھی کبھی لادار و لطفن کہا کرتے تھے۔

دولتِ دودمانِ قصا بیم

اگرچہ سرکاری اسناد اور کاغذات میں ان کی تاریخ ولادت ۱۱ مارچ ۱۹۰۹ء درج ہے لیکن دراصل یہ یکم جنوری ۱۹۰۸ء تھی۔ خود بگھتے ہیں:

ما دینچ پیدايش (دودخ، برگردن دادا) یکم جنوری ۱۹۰۸ء ہے۔ باری

پیدايش کے عزاد و احترام میں اس روز کسی اور پارسی دنیا میں تعطیل

منان جاتی ہے۔ (شعراے پنجاب ۲۵۰)

ابتدائی تعلیم اپنے وطن چیونٹ میں پائی۔ انٹر کا امتحان گورنمنٹ کالج، لائل پور آل

فیصل آباد میں ادا کیا۔ اس کے بعد لاہور سے پاس کیا۔ چونکہ طبیعت میں شعر و ادب کا مذاق

تھا، اس کے بعد لاہور کے مختلف روزناموں اور ماہانہ پرچوں میں لکھنے لگے۔ چنانچہ

اس زمانے میں انھوں نے روزنامہ احمد اور حریت (۱۹۲۶ء - ۱۹۳۱ء) اور

آخر شیرانی مرحوم کے ماہانہ رسالوں خیالستان اور دودان میں کام کیا (۱۹۳۱ء - ۱۹۳۳ء)

اس کے بعد ۱۹۳۶ء میں ایم اے (فادری) کے سند پر انبوت طور پر حاصل کی۔ اس زمانے

میں پنجاب یونیورسٹی میں شام کے وقت کالان دلا کی تعلیم کا انتظام کیا گیا تھا، تاکہ

دفتر دن کے ملازم وغیرہ اپنے کام کاج سے فارغ ہو کر کالان کے درجوں کی تعلیم

جمل کر سکیں۔ رنجود میں نے وہاں سے ۱۹۳۳ء میں اسی طرح ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا تھا، مولابخش نے بھی اسی سے فائزہ اٹھایا اور یوں ایم اے، ایل ایل بی ہو گئے، اب انھوں نے چیونٹ میں وکالت شروع کر دی۔ اور وقت رفتہ رفتہ زیادہ حرائر و روزی کی پشت پناہی اور اثر و رسوخ سے، اور کچھ اپنی محنت اور دیانت کی بدولت، ان کا وہاں کے اچھے وکیلوں میں شمار ہونے لگا۔

چیونٹ کے اسی قیام کے دوران میں انھوں نے اپنا ذاتی مفتہ دار پرچہ "جہاں نما" جاری کیا تھا۔ وکالت اور ادبی پرچے کی ادالت، دونوں ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ خاصاً سال بھر کے اندر پرچہ بند کرنا پڑا۔ لیکن ہے یہ کہ درحقیقت کسی مرحلے پر بھی دست انھیں لاس نہیں آئی۔ شاید چیونٹ کا دیہاتی ماحول بھی مستردا رہا ہو گا۔ کچھ ہو، ۱۹۳۶ء میں وہ گورنمنٹ کالج، دھرمسالہ میں اردو فارسی کے مدرس مقرر ہو گئے۔ شکل

سے سال بھر وہاں گزر رہا ہو گا کہ مستعفی ہو کر اب کے لاہور میں وکالت شروع کر دی جہاں لاہور میں حکومت وقت اور ریڈیو نے ان کی صلاحیتوں کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ فکر دیہات سدھار و بنیاد نے انھیں اپنا تعلیمی احسن مقرر کر دیا۔ اس میں جہاں انھیں پنجاب کے دیہاتی علاقے کی خاک چھاننا اور تقریباً ہی کرنا پڑی، وہیں ٹھکے کے انجاء بنیاد کی ادارت بھی ان کے سپرد ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ جرائع خاص جہت

رفت (جون ۱۹۵۵ء) کے مفتہ دائرہ شراذہ "اور مجید لاہوری (ف: جون ۱۹۶۵ء) کے "نگران" میں مزاحیہ مضامین اور نقیص بھی لکھتے رہے۔ سیاسی نوعیت کے مضمون "قائد کے قلم" نام سے "روزنامہ" "نواسے وقت" میں لکھے جاتے تھے۔ یہ سلسلہ ۱۹۵۶ء تک رہا۔ اسی دوران میں ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۷ء تک وہ مجوزہ فن طور پر رونیورسٹی کالج لاہور میں لکچرر بھی رہے۔

آخر میں سب طرف سے فارغ ہو کر پھر لاہور واپسی کو رٹ میں وکالت شروع کر دی تھی اور اچھے وکیلوں اور قانون دانوں میں گنے جاتے تھے۔

اپریل ۱۹۷۰ء لاہور میں انتقال ہوا۔

ادب اور موسیقی گویا ان کی گھنٹی میں پڑے تھے۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ وہ طالب علم کے زمانے میں بھی جلد بجانے میں لاہور سے چوں کے جلد قازند میں سے تھے، یزید بن ابیہر نے سبقتاً سبقتاً استادہ دلت سے سیکھا تھا۔ شعر میں زیادہ توجہ طنز و مزاح اور سپردی پر مبذول رہی، اگرچہ عبیدہ کلام بھی مقدار میں کچھ کم نہیں ہے۔ انھیں مکالمہ لکھنے میں خاص مہارت تھی۔

اس انداز کی ایک نظم، مناظرہ سازنگی و طلبہ، ملاحظہ ہو، جس میں چودھری خوش محن ناظر کی نظم، جوگی و شاعر کا اثر نمایاں ہے، بھر بھی دی ہے:

دنیا بھر کے بیٹکروں نے کل بزم سرور سجائی تھی

کیا دل کو سنا تھا طلبہ، کیا سازنگی رنگ لائی تھی

بسل کی دگ جان تھی تھیں، ہاؤس کی ماریں رزش سے

چائے کا پیالہ دہریں تھا، حق نے دھوم بچائی تھی

زندوں نے جھنڈے گاڑے تھے، آواز دے دیرے لائے تھے

اس دیر و حرم کی محفل میں، موسیقی سنانے آئی تھی

یاں شوکے سے پڑھا دنگی، دواں بیچ داب میں تھا طلبہ

مگر بھر کی زباں یاں چلتی تھی، دواں ہاتھوں کی بنائی تھی

دواں تھا کچے اور گرجتے تھے، نمنوں کی پٹھیاں پرتی تھیں

یاں ہروں پر موسیقی کے گھر سے نکلتے تھے

اڑتی تھیں نضا بھر میں تائیں، تھی چال صبا کی سناٹ

اس حال میں بیچ میں دونوں کے جا بیٹھا شاعر مظاہر:

سازنگی بول جلا سے، تم یوں ہی شور مچاتے ہو

مے منہ پھٹ طلبہ، دیوانے آبیوں کاں پہ کھاتے ہو

آواز تھا دہری کوئے سی اور شکل چھلا دے سی تیری

ای بیشی بیشی تالوں سے، تم رنگ میں بھگ لاتے ہو

لعلت ہے تمھارے سینے پر آگام نہیں عزت بھی نہیں  
 میں گو دوں شہی طہی ہوں، تم سراپا ہوتے ہو  
 ہے خام بھی، تک عشق ترا، کچھ صبر نہیں کچھ تاب نہیں  
 یاں تان اڑی اک شہی سئ داں تمھام کے دل جاتے ہو  
 میں راج دلا دی ایل ناری ہوں، پر ہم کھنیا ہوں  
 تم نو نڈی کانے مردک ہو، ہر جا پردے کھاتے ہو  
 تہذیب تمھیں منظور نہیں، اور عقل ترا دستور نہیں  
 تم بھیم کتاؤں میں باہر کیوں آپے سے ہوتے ہو  
 نالوں سے پل شہزادی ہوں، میں ناری کلون والی ہو  
 تم جس دوا کے قیدی ہو خند توں میں ڈٹ جاتے ہو  
 جب سادگی نے جیلے سے یوں دشمنی کا کلام کیا  
 کچھ دیر تو وہ خانوش رہا، پھر بھائی جان کو سلام کیا  
 یوں کہنے لگا سادگی سے: جلتی پر تیل گھواقی ہو  
 ہم رخ دالم کے مارے ہیں، تم آگرا دستاقتی ہو  
 عشاق سے یوں منہ پھیرا کیوں، پھر قہر میں گھیرا کیوں؟  
 دینے دے چپ، مجھو دایکوں میری زبان کھلاتی ہو  
 میں زنجبار کا شہزادہ، میدان میں آکر ضیفم سا  
 جب ایک دھاڑ لگا تا ہوں، تم پردوں میں ڈھاتی ہو  
 پیان دغا جس سے باندھوں میں پاس آئی کے ہوتا ہوا  
 تم ہر جا ہو، ہر اک کے پہلو میں دل بہلاتی ہو  
 کچھ لطف ہے بیٹھنے کو بی میں پرچوٹے میں ہم ستوں کو  
 بی! یہ تو عشق کے دیور ہیں تم یونہی ہمیں بناتی ہو  
 عزت پر ہماری حرف لڑی؟ اللہ غنی، اللہ غنی



وہ وقت بڑی بی اہول گئیں، جب تک اپنے کھواتی ہو  
 تو پریم کھنیا، غل میں کس بیباکی سے جلاتے ہے  
 گویاں تم بھول بھال ہو، کچھ کہتے بھی شرماتی ہو  
 میں سیری شمسیم نغمہ کو، مانندہ نسیم اڑاتا ہوں  
 یہ سیری تھاپ کی برکت سے دل بزم میں مٹے جاتی ہو  
 جب لٹکے تل کر گاتے ہیں، عرفان کی تائیں اڑاتے ہیں  
 ہاتھوں سے میز بجاتے ہیں، تم یاد کب ان کو آتی ہو!  
 میں آذرخش کی تابش سے دل محفل کے محرم ہوں  
 طاؤس کو، طینورے کو، تنجے، دل میں تائے دکھلا ہوں  
 یہ سن کو سنس الدین ڈرے، تلوار بباد اہل جائے  
 اور طبلہ سسکتا رہ جائے، سازنگی روتی رہ جائے  
 چمکا دے سازنگی سے، تم سیدھی سادی بھولی ہو  
 زینبا نہیں، مگر منگو میں ترے گنواروں کی سی بولی  
 گلے کے وکیل مطلق نے، داں ہاتھ سے اس کو سمجھایا  
 اچھا نہیں، خوں کی ہنروں سے مگر محفل بھر میں بولی ہو  
 تم زنجیبا دے شہزادے، سازنگی، سازنگی ٹھہری  
 پھبتی نہیں، مگر شہزادوں کی ایسی بولی بھولی ہو  
 خاموش ہو میں بی سازنگی، اور طبلہ صم بکرتا تھا  
 یوں جیسے کسی نے زباں، اپنی آب کو خرمین دھولی ہو  
 القصد بھیرت دہست ملے، از جھگڑا تھا، از گھوہ تھا  
 نے تن تنائے، تن تن تھی، نے سا کٹر سا کٹر دیتا تھا

## نشار اٹاوی، نثار حسین

یکم مارچ ۱۹۱۳ء کو اٹاوا میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد داد لال حسین صاحب عطر فروش تھے، اٹاوا کے محلہ مقصود پورہ میں ان کی دکان تھی۔ اس سلسلے میں ایک لطیف بھی ہے۔ کیٹی کے رجسٹر میں ان کے نام کے ساتھ دلوریت کے خانے میں کپھراج (عرق پتھو) لکھا ہے۔ یوں پال ہوتا ہے کہ کوئی آن پڑھ عودت اندراج کر لے لگتی، اسے ان کے والد کا نام معلوم نہیں تھا، اس نے ماں کا نام لکھوا دیا۔ ترقوں بعد خود شاد صاحب نے اس کی اصلاح کر لی۔

ابتدائی تعلیم انہیں ہدایت الاسلام جوئیرائی اسکول میں پائی۔ آٹھویں درجے تک یہاں پڑھے۔ اس کے بعد چونکہ حالات کی عدم موافقت کے باعث مزید تعلیم ممکن نہیں تھی، اسے اسکول ہی میں بارہ دسے شاہرے پر بدھسی قبول کر لی۔ اسی زمانے میں انھوں نے شعر کہنا شروع کیا اور اسکول کے ہیڈ ماسٹر شیدا اٹاوا سے اصلاح لینے لگے ایکٹوبر ۱۹۳۳ء میں مقامی اسلامیہ اسکول رجال انٹر کالج، میں ایک کل ہند شاعرہ ہو تھا۔ حضرت سیاب اکبر آبادی (ف: جنوری ۱۹۵۱ء) بھی اس میں مدعو تھے۔ شاد نے بھی غزل پڑھی۔ سیاب مرحوم اسے سن کر چونکے۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ شیدا کے شاگرد ہیں۔ انھوں نے شاد کو جو ہر قابل پاکر انھیں اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ اس کے بعد یہ آخر تک سیاب کے حلقہ تلامذہ میں شامل رہے۔ استاد نے بھی ان کی تہذیب تربیت میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا۔ ان کا شمار سیاب کے ممتاز فارغ التحصیل شاگردوں میں ہوتا تھا۔

اس واقعے کے فوری ہی دن بعد وہ نوکری سے الگ ہو گئے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ ان کے پاس ٹرننگ کی سند نہیں تھی، اس لیے جب اسکول کا سالانہ معائنہ ہوا تو سر کی انکسز مدرس نے یہ بات اپنی دلچسپی میں دینے کر دی۔ اس سے اسکول کی ادارتی رقم میں تخفیف ہو جاتی۔ لہذا اسکول والوں نے انہیں نوکری سے برخواست کر دیا۔ اب یہ پریشان حال تھے۔ بارہ بیہوش شاہ دارلش نے کچھ سہا دایا۔ وہ خود مفکروں کی مانند تھے، کشتی عروے سکتے تھے، بہر حال اس سے سر چھپانے کا اوسرا ہو گیا۔ اس زمانے میں انہوں نے کچھ رقم حاصل کرنے کے لیے ایک ڈراما "سوداگر بیچ" لکھا اور اسے بیس روپے میں فروخت کر دیا۔ اس سے انہیں کچھ جرأت ہوئی اور انہوں نے ایک طویل نظم "سیر پرستان" کہی اس میں بازار احسن اور اس کے کینڈیوں اور اس سے وابستہ لوگوں کا طنزیہ انداز میں خاکا اڑایا گیا ہے۔ اس پر شہر کی طوائفوں نے بہت شگامہ برپا کیا، جس سے واقعہ ہے کہ خاں صاحب کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ اس زمانے میں انہیں کچھ عشق بازی کا بھی تجربہ ہوا۔ تحصیل میں جانے کی ضرورت نہیں اگرچہ میں پورا واقعہ جانتا ہوں، اسی کے اس زمانے کے کلام میں اس کے نام تک کی تلمیحات موجود ہیں۔ بہر حال یہ طوفان بحیرہ خوبی گزر گیا، بعد کے زمانے میں وہ اس پر توجہ کیا کرتے تھے۔

بیہوش دارلش صاحب ان کے لیے کوشش کر رہے تھے۔ ان کی دساطت سے جرمحورہ تحصیل میں زائد امن کی جگہ پر تقریر ہو گیا۔ لیکن چونکہ اس اسی کے لیے کچھ زبردستی بطور ضمانت جمع کرانا پڑتا ہے، اور اسی کا انتظام نہ ہو سکا، وہ اس موقع سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ اس کے بعد بیہوش صاحب نے سفارش کی اور انہیں دوبارہ لینے اسی پرانے انجمن ہدایت الاسلام اسکول میں عارضی جگہ مل گئی۔ اٹا دہ کا اسلامیہ ہائی اسکول اپنے زمانے میں بہت مشہور تھا۔ اس کے فادرغ تحصیل طلبہ میں بعض مشاہیر کے نام ہیں (ذکر ذرا کر حین مرحوم سابق صدر جمہوریہ ہند بھی ان میں سے تھے) یہاں کے ہذا آج اب الطاف حسین مرحوم خدا بخیر، بڑی خوبیوں کے لرستہ صفت بزرگ تھے۔

انہوں نے شمار کی ہے بس کا اندازہ لگایا کہ اگر انھیں سہارا نہ ملا تو بے با دبان کی کشتی کی طرح طوفان بمصائب کا شکار ہو جائیگی۔ انہوں نے دستگیری کی اور انھیں اسے اسکول میں جگہ دے دی۔ یہ گویا ان کے لیے شاہراہ ترقی پر پہلا قدم تھا۔ ہمیں سے انہوں نے ملازمت کے دوران میں کچھ بعد دیگرے انٹر، اور بی اے، اور ایم اے وہ دھکے امتحان ناگبورہ یونیورسٹی سے پاس کیے۔ اسکول کے زمانے میں بھی وہ اردو کے صدر مدرس رہے اور جب یہ ترقی کر کے انٹر کالج بنا، تو صدر شعبہ اردو مقرر ہو گئے۔ اپنی وفات تک وہ اسی عہدے پر قائم رہے۔

انہوں نے ۶ مئی ۱۹۷۲ء کو گلے کے کینسر سے انتقال کیا۔ ایک مرحلے پر ان کے کان کے فریقوں اور دستوں نے چندہ جمع کر کے ان کے علاج کی پیشکش کی، لیکن مرحوم نے اسے قبول نہ کیا۔ کہا: یہ مرض لاعلاج ہے صحت تو بچے اب نصیب ہو نہیں سکتی، آپ حضرات کیوں اپنے کاٹے پیسے کی کٹائی برباد کریں! ڈیڑھ برس بیمار رہے اور آخر اس میں جان بحق ہو گئے۔ انہوں نے دکن کالج کیے تھے پہلی بیوی موضع بلجور کی تھیں۔ ان سے ایک لڑکا ہوا لیکن نامعلوم کس بات پر اختلاف ہو گیا اور انہوں نے اس بیگم سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس کے بعد دوسرا نکاح ۱۹۴۳ء میں جالون کے ایک معزز گھرانے میں ہوا۔ اس سے چھ بچے ہوئے: چار بیٹیاں اور دو بیٹے۔ ان میں سے صرف بڑی بیٹی (درا فدا) کی شادی اپنی زندگی میں کر سکے تھے۔ یہ بیگم اور ان کی اولاد ماشاء اللہ اب موجود ہے۔

اگرچہ خاں صاحب نے شاعری ۱۹۳۰ء میں شروع کی تھی، لیکن ان کا اصل دور شعر گوئی سیاب کے تلمذ کے بعد شروع ہوا۔ اب تک وہ صرف غزل کہتے تھے، اس کے بعد شاد کے کہنے پر انہوں نے نظم پر بھی توجہ کی۔ مندی بھی اچھی جانتے تھے رانہوں نے ۱۹۳۵ء میں مندی کا پیش یوگیتا، امتحان پاس کیا تھا (اسی لیے انہوں نے اردو میں مندی پینٹل کے تجربے کیے۔ ان کا ایک مجموعہ مندی میں دھرتی میرے پیاد کی شائع ہو چکا ہے۔ مدت ہوئی، اردو کلام کا ایک مختصر انتخاب، ماہِ داغجم کے عنوان سے شائع ہوا تھا (دئی ۱۹۵۲ء) یقیناً بہت کلام غیر مبلوہ مدہ گیا ہو گا۔ کس زمانے میں کلام

بڑے دلکش انداز میں بڑھا کرتے تھے۔ ذلت و ذلت وہ پہلا اندازِ رخصت ہو گیا، جلد تھک جاتے تھے کسے معلوم تھا کہ یہ گلے کے کنیسر کا آغاز ہے۔

کلامِ نخبہ اور خوش پہلو سے بے عیب اور بیامیز پر وہ سیما پ کے ارشد تلامذہ میں گنے جاتے تھے، نونے کے چند شعرِ ملاحظہ ہوں:

کس گوشہِ خلعت میں ہاں ہے دنیا ہے بھی کہ فقط وہم دگاں ہے دنیا  
چمائی میں تھوڑی سی جگہ ہے اب بھی لانا تو زور کوئی کہاں ہے دنیا  
ذہاد کی تسبیح ریا جھوٹ بڑی آنکھوں سے امیدوں کی کرن پھوٹی  
گھونگھٹ سے جو منکر کے جھانکا اس نے آکاش سے شرما کے دھاک ٹوٹ بڑی  
سوچتے ہیں سہ منزل، یہ مٹا کیا ہے! جس سے گزرتے تھے اسی راگنڈ ریکہ پہنچے  
جو لوگ جاں کچھ کر دے، دیکھینگے دامن کیا کرتے ہیں

امروز بہ جن کا زور نہیں، اندیشہ فردا کرتے ہیں

ناہید و قرنے راتوں کے ماحول کو روشن سو تو دیا

وہ دیپ کسی سے جل نہ سکے جودل میں جالا کرتے ہیں

بادِ عشق کو ہے جنتِ شرطا لہتمہ اگر کا نپتا ہو، جامِ نلے  
شوق کہتے فریبِ دنیا ہے مسکرا کر ہمارا نام نلے  
یہ بھی بجا کہ دردِ نزار کے تلاش یہ بھی ہوا کہ سم ترے در سے گز دگئے  
مبتلا نہیں عقل کی منزل فریادیاں گمراہ بن گئے راگنڈر سے گز دگئے  
نلے مہاے عرش پہ پہنچے تو تھے، مگر نکج کر زما مقامِ اثر سے گز دگئے  
رگِ رخ میں ہے سردِ محبت کا انبا اب تم دردِ قلب و نظر سے گز دگئے  
آنکھوں سے دل کا کام نہ لیتا تھا لے لہم جلوے تڑپ کے دامِ نظر سے گز دگئے  
سرلم بڑھ رہی ہیں مرے دل کی دھڑکیاں جیسے ابھی آہیں، وہ ادھر سے گز دگئے  
حریفِ جاں ہیں وہ، لیکن اس کا کیا کرے کوئی کمر اس کی ڈھائی دوستی معلوم ہوتی ہے  
لٹا ہے دل کو تیری گلی میں سکون سا کیا اس زمین پر ٹھک بیگدوں نہیں!

اے عقل! ساتھ رہ کہ پڑ گیا تجھی سے کام | ماہِ طلب کی منزل آ خر جنوں نہیں  
بہر کو انشاء! ذکرِ نظر نے کیا محراب | جلوے تو ہر قدم پہ نکالے کر وں نہیں  
ہمیں بول گئے ہیں کہو، کہ مہلتاں مل گئی | دس دس، ٹھک دہی، مگر ساٹ ل گئی

موجِ نینل، گل کا تبسم، پر تو شبنم، بجلی کا سایہ

دھوکا ہے دھوکا عہدِ جوانی، اس کو جوان کوئی نہ سمجھے

اُن کی ہنسِ منت، میری بھی منت، دونوں میں لیکن کتنا افتاد

ان کے اشارے دنیا سمجھے، میری کہانی کوئی نہ سمجھے

ماتہِ ہم نے دنیا ہے فانی، فانی سمجھنا ہے نادانی

جیسے کی دل میں گر جوتا، دنیا کو فانی کوئی نہ سمجھے

دامنِ تو یہ دم، مگر اے موسمِ بہار! | میں سوچتا یہ ہوں کہ مری آستیں بھی تھی

زندگی کی بارے، وہ باتیں بھی کیا ادا ہیں ہوئیں

ان سے جب چپ چپ کے کوٹھے پر ملاقاتیں ہوئیں

مگ گئی جب چپ! تو گھنٹوں بُت بنے بیٹھے رہے

چہرہ چھپیں باتیں، تو پھر دود پر باتیں ہوئیں

یاد ہے اب تک رملتے کا پسینا، یاد ہے

اُن سے جب پہلے پہل میری ملاقاتیں ہوئیں

وہ گئے وہ اپنے دانتوں میں دو چا داب کر

آنکھوں آنکھوں میں خدا معلوم کیا باتیں ہوئیں

ایک بجلی آسمان پر ایک بجلی گود میں

زندگی میں بار بار ایسی بھی برساتیں ہوئیں

اے خارا! اب تک مرا ہر سانس ہے بکا ہوا

تو تو اس لطف کے سایے میں برساتیں ہوئیں



## امجد (محمد امجد) عبدالمجید

۲۹ جون ۱۹۱۴ء کو پنجاب (پاکستان) کے شہر جھنگ گلیاڑ میں پیدا ہوئے۔ جب ان کے والد میاں گل محمد نے دوسری شادی کر لی، تو عبدالمجید کی والدہ اپنے کسے بیٹے کو ساتھ لے کر چلے گئیں۔ ان کے ماما میاں نور محمد فارسی عربی کے عالم تھے۔ انھیں کی نگرانی میں ان کی تعلیم شروع ہوئی۔ فارسی عربی کے علاوہ کچھ طب بھی پڑھی۔ اس کے بعد وہی تعلیم شروع ہوئی۔ ۱۹۳۰ء میں مقامی اسلامیہ بانی اسکول سے دسویں کی سند لی۔ پھر گورنمنٹ انٹر کالج، جھنگ میں داخلہ لیا، اور یہاں سے ۱۹۳۲ء میں انٹر کا امتحان پاس کر کے لاہور چلے آئے۔ ۱۹۳۴ء میں اسلامیہ کالج، لاہور سے بی اے میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ کسب روزگار کا مسئلہ پیش آیا، تو سب سے پہلے ایک قافلوں کو صاحب کی زیر نگرانی اسے دھندکان کی فہرستیں بنانے کا کام ملا۔ جو ۱۹۳۵ء کے ایچٹ کی روش سے انتخاب کے لیے تیار ہو رہی تھیں۔ یہ کام عارضی تھا، اور چند مہینوں میں مکمل ہو گیا۔ اس کے بعد وہ لاپاڑ آتے اور انشورنس کمپنی کے ایجنٹ بن گئے۔ لیکن اس کام کے لیے جس محنت مشقت کی ضرورت ہے، وہ ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس میں متواتر سفر ناگزیر تھا۔ صبح کہیں، شام کہیں، غرض سال بھر کے اندر اندر وہ اپنے پیسے سے دست بردار ہو گئے۔

کچھ پڑھنے کی عادت شروع سے تھی، اور جھنگ کے ادبی حلقوں میں بھی وہ غیر معروض نہیں رہتے۔ اسی زمانے میں وہاں ایک نیم سرکاری رسالہ "قرونچ" جاری ہوا۔ اصحاب مجاز



کی نظر امجد صاحب پر پڑی اور وہ اس کے مدیر مقرر ہو گئے۔ یہاں تقریباً دس برس ۱۹۴۵ء تک رہے۔ یہ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ حکومت دقت کئی تحریر پر عروج سے ناراض ہو گئی، نذر ردائی عضو ضعیف پر گرا، اور مجید امجد کو دوسری سے جواب دل گیا۔

صحافت کے اس تلخ تجربے کے بعد وہ مسٹرٹ بورڈ ہنگ میں بطور وکیل ملازم ہو گئے۔ یہ تعلق چار برس تک رہا۔ ۱۹۴۹ء میں پاکستان کے محکمہ خودی (فوڈ ڈیپارٹمنٹ) میں جگہ مل گئی۔ وہ ملازمت کے اختتام تک اسی محکمے سے وابستہ رہے، اور ۱۹۷۲ء میں اسسٹنٹ فوڈ کنٹرولر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔

ان کی زندگی کے آخری ۲۷-۲۸ سال ساہیوال (مابقا منگڑی) میں بسر ہوئے۔ ملازمت کے اختتام کے بعد بھی انھوں نے یہاں کی سکونت ترک نہیں کی۔ ان کے والد کی دوسری شادی سے خاندان کا شیرازہ تو بکھر رہا تھا، مجید امجد کی زندگی شفقت پروری کے فقدان کے باعث محرومی اور غمی کا منہ دیکھ گئی۔ بد قسمتی سے ان کی اپنی ازدواجی زندگی بھی بالکل ناکام رہی۔ ان کی شادی اپنے ۱۷ کی جیت سے ہوئی تھی، لیکن نبھو دسک، اور وہ رطلاں لیے بغیر ان سے الگ ہوئے۔ ان سے کوئی اولاد بھی نہیں تھی۔ وہ محکمہ تعلیم میں لازم تھیں اور کسی ہائی اسکول کی ہیڈ ماسٹری سے ریٹائر ہوئیں، آخری زمانے میں ان کی بنیادی بالکل ضائع ہو گئی تھی۔

مجید امجد بالکل اکیلے رہتے تھے۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا اور بڑی تنگی ترشی سے گزر بسر ہوتی تھی۔ ایسے جانگزا حالات میں کئی انھوں نے اپنی خودداری کی حفاظت کی، اور کسی کے سامنے دست سوال دہا نہیں کیا۔ جو روکھی سوکھی میسر آگئی، ہبشہ کو سے اسی پر گزارا کیا۔ آخر ان کے بعض دوستوں کے توجہ دلانے پر حکومت پاکستان نے اپریل ۱۹۷۳ء میں ان کا پانچ سو روپے ماہانہ ادبی وظیفہ مقرر کر دیا، لیکن اب سیٹھ کنارسے آگیا تھا۔ دو بیٹے مجدان کا انتقال ہو گیا۔ یہ حادثہ بھی بڑے المناک حالات میں

ان کے ساتھ ان کی ملازمت کے زمانے کا ایک پرانا چھوٹا (علی محمد) رہتا تھا۔ وہ بازار سے سودا سلفے آتا اور وقت بوقت ان کا چھوٹا موٹا کام بھی کر دیتا۔ صبح جب وہ اپنے کام پر جاتا تو عید الجود کی حرامیت کے مطابق باہر سے تالا وال دیتا اور وہ اس پر اسے کھول دیتا۔ ۱۱ مئی ۱۹۷۴ کو بھی یہی ہوا۔ ۹ بجے صبح تالا بند کر کے وہ چلا گیا۔ لیکن سب دو بجے واپس آیا، تو اسے ان کی جگہ امجد کی لاکش زمین پر چڑھی ملی۔ لاش بھنگ گئی اور اگلے دن (۱۲ مئی) وہیں سپرد خاک ہوئی۔

زمانے کی شتم ظریفی دیکھیے کہ زندگی میں تو کسی نے یہ تک نہ پوچھا کہ کہو بھئی، کیسے بسر ہو رہی ہے؟ مرنے کے بعد ساہیوال کے مشہور باغ "کستان پارک" اور ساہیوال ہال کا نام بدل کر علی المرتضیٰ "امجد پارک" اور "امجد ہال" رکھ دیا گیا۔ مانے، اس زور و پشیمان کا پشیمان ہونا۔ کسریٰ منہاس نے قطعوں تاریخ وفات کہا :-

موت ہر حق ہے، مگر اک جو ہر حال کی موت	والے بر محفل، مجدا ہم سے جمید امجد ہوئے
کیسے کیسے دوست کسریٰ چل بیٹے منہ بھر کر	دوستی کے جتنے دعوت تھے وہ سارے دوست
چن لیا دوست قضائے ہر محفل شاد اب کو	زندگی پر اسے تلک تیرے کرم بید ہوئے
عجز و ایثار و خلوص دے ریائی کے قصو	ایک شخص ایسا تھا جس سے عمر بھر نر ہوئے
نغمہ جس کا ہر نفس، ہر بات تھی سحر حلال	وہ نشان زندگی بھی زینت مرقد ہوئے
ایک روشن طبع تھا جس کی بدولت کتنے دوست	محفل شعرو ادب میں زینت مسند ہوئے
جس کے فن میں دولت کیسے، دل کی آخر تک	اس کے گیتوں میں ڈھلے جتنے بھی جہاد ہوئے

سیوی میں فرد مکمل مصرع سال وفات

"داخل باغِ جاں عبد الجید امجد ہوئے"

(۲۱۹۷۴)

وہ بہت کم عمری میں شعر کہنے لگے تھے۔ لیکن حالات کی مجبوری نے اشاعت سے محروم رکھا۔ ایک مختصر انتخاب شب رفتہ کے عنوان سے ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا تھا۔ بقیہ کلام کا مہبوط مجموعہ اسی کی فوت کے بعد ۱۹۷۶ء ۱۹۷۷ء میں منظر عام پر آیا۔

اگرچہ انھوں نے غزلیں بھی کہیں، لیکن وہ اصل وہ نظم کے شاعر ہیں۔ ان کا کلام بہت پرہیزگار ہے۔ جبریل دلال کی زیریں ہر تو مونا ہی چاہیے کہ خود ان کی اپنی زندگی کہاں کی آزادانہ آسائش اور مشرعا و سرود کی زندگی تھی! لیکن جس انداز سے وہ زندگی اور اس کے مسائل کو دیکھتے ہیں، وہ سرا سرائی کا اپنا ہے۔ انھوں نے زبان اور اسلوب میں بھی کئی تجربے کیے۔ انھوں نے زندگی میں انھیں وہ مقام نہ ملا جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔ اب نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

### حسین

وہ شام صبح وہ عالم تھی جب بسر حد شام  
کہ کا تھا آ کے ترقا قافلہ، ترے خیام  
مناج کون و مکان تجھ شہید کا سجدہ  
زمین کرب و دک کے فزا زیوں کے امام  
یہ کھٹے تھے تباہ، جہان دانوں کو  
کہ ہے فرات کے ساحل سے سلسیل تک غلام  
سوار مرکب و شیش و سول، پودہ بول  
چراغِ عقلِ ایماں، ترا نقد سنام

### ارباب

وہ قتل گاہ وہ لاشے، وہ بکیوں کے خیام  
وہ ملت جب تری آنکھوں کے سامنے لڑی  
یہ کون جان کے، ترے دل پہ کیا گزری  
ستم کی رات کی کالی قنات کے پیچھے  
تری ہی برقی صدا کی کوئی کانٹے  
یہ ذہر چتر مطلقا، شہنشاہوں کے خیام

جہاں پر سایہ کناں ہے ترے شرف کی بردا

اکھر دیکھے ہیں ترے خیمہ افکنوں کے خیام

کیا کہیے کیا حجاب چیا کا فساد تھا  
سب کچھ میں اک نگاہِ کرم کا بہانہ تھا

یہ کون اور سے غم، دا، میں سمجھا حضور تھے  
 اک چہرہ، اس پر لاکھ سخن تاب رنگین  
 لے غم! میں دل! یہ تری دل لڑا لڑیاں  
 لے، وہ دھڑکنوں سے بھری ساحتیں بید  
 اس جلتی دھوپ میں یہ گھنے سایہ دار پیر  
 ابدا طریقے میں ہے یہ احتیاء شرط۔  
 اک بوڑا دروازے کے جو دیکھا، رانا تھا  
 لے جرات نگہ! تری قسمت میں کیا تھا  
 ہم کو تری خوشی کے لیے مسکراتا تھا  
 میں ان کو دیکھتا تھا، کوئی دیکھتا تھا  
 میں اپنی زندگی انہیں دے دیا، جوں پر  
 اک داغ بھی کہیں نہ سر پر ہوں پڑے

## بہار

ہر بار، اسی طرح سے دنیا  
 سونے کی ڈال سے ڈھالتی ہے  
 مسروں کی کلی کی زرد موت

تھا ہے جسے غم ہوانے

ہر بار، اسی طرح سے شاخیں  
 کھلتی ہوئیں کوئلیں اٹھائے  
 رستوں کے سلاخیوں سے لگ کر

کیا سوچتی ہیں، یہ کون جانے!

ہر بار، اسی طرح سے بوندیں  
 پھولوں بھری بدلیوں سے چھن کر  
 آتی ہیں مانتوں پہ پھیلے

مانے کے دوق کو ٹھن ٹھنلے

ہر سال، اسی طرح کا موسم  
 ہر بار، یہی ممکنہ دودی  
 ہر صبح، یہی کشتور آسنو  
 رونے کے کب آئیں گے دمانے !

## توسیع شہر

میں بس سے کھڑے جو اس گھاتی نہر کے دوا  
 جھوٹے کھیتوں کی سرسبز بان کے پہر یدار  
 گھنے، سہانے، چھانڈ چھڑکتے، پودوں سے چھتا  
 میں ہزاروں میں بک گئے سادے ہرے بھرتے اتحاد

جن کی سانس کا ہر جھونکا تھا ایک عجیب طلسم  
 قاتل تیشے چیر گئے ان سادہ دنتوں کے جسم

گری دھڑام سے گھائل پیڑوں کی نیل دیوار  
 کتنے ہیکل، جھٹنے پنجر، جھڑتے برگ دبار  
 بھی دھوپ کے درد مغلن میں لاشوں کے انبار  
 آج کھڑا میں سوچتا ہوں اس گھاتی نہر کے دوا

اس عقل میں صرف اک میری سوچ ہکتی ڈال  
 اس بڑھی اب اکادری ضرب اک المے آدم کی آل

اب یہ مسافت کیسے طے ہو، لے دل تو ہی بنا  
 کتنی غرور دھڑکتی غاصے، پھر بھی وہی صحرا  
 چیت کیا، چیتا ملے بھی، اپنا دھن بھنا  
 بہت جھڑائی، پتر بکھے، آجیوں بیت چلا

خوشیوں کا کچھ چوم کے دکھا، دنیا ان بھری  
 اپنا پکیرا، اپنا سایہ، تاکے کوں کھن  
 اپنے گرد، اب اپنے آپ میں گھلتی سوچ بھل  
 کا پخ کی اک دیوارِ زمانہ، آنے سامنے ہم  
 راہیں دھوکے، شاخیں کو دیکھ، اکا اک ٹہل  
 دکھتے کہتے لاکھوں مکھڑے، کس کس کی تینے  
 جنوں عشق کی رسم عجیب، کیا کہتے!  
 آخر کوئی کنا را، اس سیل بیکراں کا  
 شاید ادھر سے گزرتے پھر بھی ترا سینہ  
 یہ کیا عجیب دان ہے، سمجھ سکوں تو بات ہے  
 مری تباہیوں کا بھی فائدہ کیا فساد ہے!  
 چراغ بھڑکے، پتنگے مل چکے، سحر مونی  
 دل سے، ہرگز وہی بات گزری ہے  
 چاندنی، نیم دا در پچھ، سکوت  
 دکھ وہ کتنی کھنور کو جس کو رنج کوئے سجدہ  
 دودھ کی جب شگفتہ ٹوٹی، کوئی قریب تھا  
 کس کے دست اور کیسے دشمن، سب دیکھ لیا  
 نظروں سے نظروں کا بندھن، جسم سے جسم جدا  
 کتنی تیر چلی ہے اب کے دھول بھری دھنکا  
 بولی تو اک اک کی دہی، بالی سب کی جلا  
 میں ان سے دور وہ مجھ سے قرب، کیا کہنا  
 آخر کوئی مددوار، اس دردِ زندگی کا!  
 بیٹھا ہوا ہوں ساحل پر نے بلب کبھی کا  
 نہ اب وہاں کی برقی نہ اب وہ اتفاقیہ  
 دہیلیوں کا تذکرہ، آسٹیاں کی بات ہے  
 گنگا بھی مری جدائیوں کی رات، رات ہے  
 کس قیامت کی رات گزری ہے  
 آنکھوں آنکھوں میں رات گزری ہے

## ریاض الفارسی، ریاض الدین، قاضی

ان کا آبائی وطن ضلع بلندشہر دیوبند کا قصبہ جیوڑ تھا۔ انیسویں صدی میں اس علاقے میں نیل کی کاشت بڑے وسیع پیمانے پر ہوتی تھی، اور یہ بیت نفع مندرکارو بارستھا۔ وہاں کے قاضی رفیع الدین صاحب باسینی نیل کی آٹھ کوٹھیوں کے مالک اور اپنے علاقے کے معمول زمیندار اور رئیس تھے۔ لیکن یورپ نے مصنوعی نیل کی درآمد شروع ہوتی تو اس ذریعہ تجارت کو بھی ٹھن لگنا شروع ہو گیا۔ کساو بازار سی کے باعث رفتہ رفتہ ان کی حالت خراب ہونے لگی۔ چنانچہ جب ان کے بیٹے قاضی حسام الدین ان کے وارث ہوئے تو خاندان کی شان و شوکت میں بہت کمی آچکی تھی۔ لیکن وہ منہ میں روایتی چاندی کا چھوٹے پیدا ہوتے تھے، اس لیے ان کے لیے بدلے حالات سے سمجھو سنا کر نا ٹھن نہ ہو سکا۔ رہی سہی کسر شاعری نے پوری کر دی، آزاد و تخلص کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حسام الدین کا سارا وقت یارباشی میں گزرتا اور ان کی اولاد نے خاندانی عظمت کے افسانوں کے سوانے اور کچھ نہ پایا۔

قاضی ریاض الدین انھیں قاضی حسام الدین کے دوسرے بیٹے تھے۔ یہ ۱۸۹۷ء میں جیوڑ میں پیدا ہوئے۔ عربی اور فارسی کا ابتدائی نصاب وطن میں نجی طور پر پورا کیا۔ گھر کا جو رنگ ستھا، اس میں ان کی مزید تعلیم کی طرف کسی کو توجہ نہیں تھی۔ عموماً قسمتی سے ان کے بڑے بھائی قاضی عزیز الدین رشتاں جو پہلے سے نقل مکان کر کے اپنے ماموں کے پاس گوالیار چلے گئے تھے، جیوڑ آئے اور چھوٹے بھائی کو اپنے

ساتھ بولے گئے۔ اس وقت ان کی عمر ۱۳-۱۴ برس کی ہوگی۔

گوالیار میں انھوں نے ۱۹۱۶ء میں دسویں کی اور ۱۹۱۸ء میں انٹر میڈیٹ حاصل کی۔ پہلی عالمی جنگ کے اختتام کے بعد ۱۹۱۸ء میں اس ملک میں انفلوئنزا وبائی شکل میں پھیل گیا تھا۔ بلا مبالغہ لاکھوں جانیں اس مرض کا شکار ہو گئیں تھیں۔ اسی میں تانہی عزیز الدین رشتہ بھی خدا کو پیارے ہو گئے۔ والد کا انتقال اس سے تین چار سال قبل ہو چکا تھا؛ اب بڑے لہجائی کی دائمی مفارقت کے بعد وہ بالکل بے بار و مددگار رہ گئے۔ اس لیے آٹھ تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنے کا کیا امکان تھا، بلکہ مرحوم بھائی کے اہل و عیال کی دیکھ بھال کی ذمہ داری بھی ان کے ناتوان کندھوں پر آ پڑی، جس نے انھیں ملازمت تلاش کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس پر انھوں نے مقامی گورنمنٹ ہائی اسکول میں اردو فارسی پڑھانے کی ملازمت اختیار کر لی تین چار برس کے علاوہ ان کا سارا زمانہ ملازمت اسی اسکول میں گزرا۔ وہ ۱۹۵۴ء میں سبکدوش ہوئے۔

تعلیم کا سلسلہ انھوں نے حالات کی مجبوری سے منقطع کیا تھا، نہ کہ اپنی خوشی سے۔ جب حالات موافق ہوئے تو انھوں نے اس کی مکمل پورا کرنے کی از سر نو کوشش کی۔ ۱۹۳۰ء میں بلا تنخواہ رخصت لی اور چار سال علی گڑھ یونیورسٹی میں رہ کر بی اے سے گریجس ہوئے (اردو فارسی) اور بی ٹی تک کے امتحان پاس کئے۔

۱۷ برس کی عمر تھی، جب انھوں نے ۱۹۱۴ء میں شعر گوئی شروع کی۔ ان کا پہلا شعر تھا:

بوجھ قسم سے جب سنبھل سکتا نہیں تلوار کا

بکبارو گے خون تم دس بیس کا، دو چار کا!

یہی زبان کی طرف رجحان ان کی شاعری کا طرہ امتیاز ہے۔ اسی نے انھیں نوح نادر (۱۹۶۲ء) کا تمنا اختیار کرنے پر آمادہ کیا۔ ۴۰ برس کی مشق میں بہت کچھ کہا، لیکن کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا۔

اردو کے عاشق تھے۔ بزم اردو، گوالیار گویا انھیں کے دم سے زندہ تھی، ۱۹۱۹ء



۱۹۷۲ء تک اس کے سکتر رہے۔ اس بزم کے اہتمام میں جو شاندار کل ہندو مشاعرے ہوتے، وہ ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ ان کا انتظام مرحوم خود ہی کیا کرتے تھے۔ ان کی اردو دوستی کا ایک اور واقعہ قابل ذکر ہے۔ ان کی طویل اور کامیاب مدد سی کے اعتراف میں ۱۹۷۴ء میں ریاست نے انھیں انسپکٹر مدارس کی اسامی پیش کی مرنو نے یہ پیشکش قبول کرنے سے اس لیے معذرت کر دی کہ ان کے چلے جانے سے تو رکھیں اسکول میں اردو پڑھانے کا کوئی انتظام باقی نہیں رہے گا اور ممکن ہے کہ اس پر یہ درجہ ہی بند کر دیا جائے۔

ان کی بیوی کا جو ان کے اپنے خاندان ہی کی تھیں، ۱۹۷۱ء میں انتقال ہو گیا۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اولاد سے نہیں نوازا تھا، لیکن میاں بیوی میں مثالی محبت تھی۔ ان کی دائمی جدائی کے بعد بچہ کے رہ گئے۔ مختلف امراض نے آگھرا۔ دل کا پہلا دورہ ۱۹۷۲ء میں پڑا، اس سے تو بچ بچلے؛ مگر تا جگہ ۲۷ جون ۱۹۷۴ء کو اچانک فالج کا حملہ ہوا، اور بایاں حصہ بیکار ہو گیا۔ فشار دم کا عارضہ پہلے سے تھا، دماغ کی نس سمٹ گئی۔ بارہ دن تک مقامی بے آروغیہ اسپتال میں پرہوش رہنے کے بعد ۹ جولائی ۱۹۷۴ء علی الصبح تین بجے جان بحق ہو گئے۔ اسی دن ظہر کے وقت کرخیل حسن خان دہلے قبرستان، کمپو لشکر غوالیار میں اپنی مرحومہ بیوی کے قریب دفن ہوئے۔

فیاض احمد خان فیاض غوالیار سی کے قتلے میں تاریخ کا شعر ہے:

کہا ہاتھ نے سینہ چاک کر کے  
ریاض خلد ہے جاگیر ان کی

(۱۹۷۵ - ۱ - ۷ - ۱۹۷۴ء)

ان کا کوئی مجموعہ ان کی زندگی میں شائع نہیں ہوا۔ یہ چند شعر مختلف رسالوں میں مطبوعہ غزلوں سے انتخاب کر کے دیے رہا ہوں۔ زبان کی شاعری ان کا طرہ امتیاز ہے۔

انہیں دیکھے زمانہ ہو گیا ہے یہ قصہ اب فائدہ ہو گیا ہے

محبت نے ہماری جان لے لی قضا کا تو بہانہ ہو گیا ہے

ہجوم غم نے یوں احساس کو میرے مٹا ڈالا

مصیبت بھی مصیبت اب نہیں معلوم ہوتی ہے

کہانہ متناکہ محبت کا ہے بڑا انجام میں اب تو لے دل خانہ خراب دیکھ لیا

نہ وہ میں، نہ دل ہے، نہ قسمت نہ دنیا محبت میں کوئی ہمارا نہیں ہے

خدا کی بھی ان کی، زمانہ بھی ان کا نہیں ہے تو کوئی ہمارا نہیں ہے

وہ ہوں نامراد فنا جہاں میں جسے موت کا بھی سہارا نہیں ہے

کہاں کی دوستی کہیں کی محبت، کیسی غمخواری

یہ انداز غلو میں درد منداں دیکھنے کیا ہوا!

نہ کیوں دیکھو غلو میں باہم اربابِ میخانہ

یہ ترسودہ نزاع کفر و ایمان دیکھنے کیا ہوا

جیاتِ علیوں کی تلخیوں کو اسی طرح خوشگوار کروں

خوشی نہیں سازگار مجھ کو، تو غم ہی کو سازگار کروں

ارادۂ تری عشق و الفت تو ہمیشہ میں ہزار کروں

جو یہ میرے اختیار میں ہوا تو میں اسے اختیار کروں

آہِ گھر سے مرے کون ہوا ہے رخصت! کیوں نسرودہ دردِ دیوار نظر آتے ہیں

تیری جنت میں، نہ واعظ ہیں نہ زلیخا! یہ تو دنیا کے گنہگار نظر آتے ہیں

کسی کا سنگِ در ہے، اور میں ہوں بہ میرا دردِ دوسرے، اور میں ہوں

محبت دیکھ لی، اہلِ وطن کی ریا عن! اب اپنا گھر ہے اور میں ہوں

یہ دو جہلوں میں ہے رد و اہم بیمارِ الفت کی

جودن ہے وہ مصیبت کا، جو قیامت کی

بجائے تونے چراے ناصح مشفق ! نصیحت کی  
مگر جب چین بھی صے بیگلی، دردِ محبت کی  
کوئی کجنت ہی اب رکھ سکے گا دل کو فنا ہو میں  
جوانی، وہ کجا ان کی ! اور وہ بھی اس قیامت کی !

ریاض ! اس کا چھپا نامحال ہے کر عیشِ نہ راز بن کے رہیگا، نہ راز ہو کے سزا  
دنیائے الگ اوروں کی، مرے فن کا جہاں اور  
رنگ اور روش اور، بیاں اور، زبان اور  
بے اُن کے نہ رُت وہ، نہ سماں وہ، نہ فضا وہ  
وہ تھے تو فضا اور تھی، رُت اور، سماں اور  
اقرار میں انکار ہے، انکار میں اقرار  
ان شوخ حسینوں کی نہیں ور ہے، ہاں اور  
ویدان کی سہل ہی سہی ممکن مگر کہاں !  
ذوقِ نظر بھی ہو، تو جمالِ نظر کہاں !  
ہر چیز میں ہے پُر قوسن و جمالِ دوست  
لیکن ہر اک نگاہِ حقیقت مگر کہاں !  
جا تو رہا ہوں جوشِ جنوں میں کہیں، مگر  
لے جا رہا ہے جوشِ جنوں، کیا خبر، کہاں !  
محوِ طلب کو جوشِ طلب میں کہاں یہ ہوش  
منزل کہاں ہے، راہِ کدھر، راہبر کہاں !  
یہی دنیا رہی دنیا کے عیشِ بیخراں ہونگے  
یہ سب ہوگا مگر اے عمرِ فانی ! ہم کہاں ہونگے !  
اب آئے ہو تو میٹھو بھی ذرا، کل کی خبر کیا ہے  
نہ جانے تم کہاں ہونگے ! نہ جانے ہم کہاں ہونگے

غم ہستی، غم الفت، غم دوراں ہو کر  
 غم بہر رنگ رہا از لبست کا عنوان ہو کر  
 کر یا ضبط غم عشق بھی بالفرض، ریا من  
 رہ سکو گے غم دوراں سے گریزاں ہو کر؟

غم دل کا نگہبان ہوا جاتا ہے ہر وقت کا جہان ہوا جاتا ہے  
 اس دور کی کشمکش! الہی! توبہ انسان، پریشان ہوا جاتا ہے

کوئی ہمدوم نہ رہا کوئی یگانہ نہ رہا  
 کوئی مسکن نہ رہا، کوئی ٹھکانہ نہ رہا  
 دن وہی رات وہی صبح وہی شام وہی  
 ہم وہی ہیں، مگر اپنا وہ زمانہ نہ رہا  
 نہ انگلیں، نہ ترنگیں، نہ مسرت، نہ امید  
 یہی جینا ہے، تو اس جینے میں کیا رکھا ہے!  
 یہی کہنا ہے، ہر اک دیکھ کے صورت میری  
 تو نے کجخت! یہ کیا حال بنا رکھا ہے!

## محمد حسین حسان

ان کا خاندان دراصل سہسوان کا رہنے والا تھا، لیکن خود ان کی پیدائش ۱۹۰۷ء میں پہلی سمیت میں ہوئی۔ والدین کا بچپن میں انتقال ہو گیا تھا۔ والد کا نام محمد بنی جان تھا۔ اردو فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ پھر مدرسہ اسلامیہ بریلی میں عربی پڑھی اور اس کی تکمیل وارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں کی۔ ۱۹۲۷ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں چلے آئے۔ اسی زمانے میں انگریزی کی طرف توجہ کی۔ لیکن ۱۹۳۰ء۔ ۱۹۳۱ء میں کانگریس کی نمک سازی کی تحریک میں شرکت کے باعث جلد ہی یہ سلسلہ منقطع ہو گیا، اور پھر اس طرف توجہ دے کر کہہ سکتے ہیں کہ اتنی قابلیت پیدا کر لی تھی کہ انگریزی کتابوں سے با آسانی استفادہ کر سکتے تھے۔ اسی زمانے میں دہلی کانگریس نے اردو، ہندی، انگریزی کی تینوں زبانوں میں خبر نامے شائع کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ اردو کے نگراں اور ذمہ دار شفیق الرحمن قدوائی مرحوم (فدائے پہلی ۱۹۵۳ء) تھے اور انگریزی کے رگھونندن سرن، بی۔ اے (کینب) (ف: دسمبر ۱۹۵۳ء)۔ قدوائی مرحوم نے اردو خبر نامے کی ترتیب و تدوین میں محمد حسین حسان کو اپنا معاون مقرر کیا۔ یہ خبر نامہ کوئی سال بھر شائع ہوتا رہا تھا۔ جب قدوائی صاحب گرفتار ہوئے، اور قید خانے بھیج دیئے گئے، تو چندے بعد خود حسین حسان صاحب بھی گرفتار کر لیے گئے۔ حوالات کے زمانے میں پولیس نے ان پر بے پناہ مظالم توڑے۔ مطالبہ یہ تھا کہ بتاؤ، یہ خبر نامے کس چھاپے خانے

میں چھپتے ہیں ۹ (یہ ایک الگ دلچسپ داستان ہے کہ رگھوناتھ سرن صاحب ان کی طباعت کے لیے کیا کیا پاڑ پیلے تھے۔ کیونکہ کوئی مطبع ان کے چھاپے کا خطہ مول لینے کو تیار نہیں تھا)۔ حسان صاحب نے سب سختیاں برداشت کیں، لیکن منہ سے ایک لفظ نہیں بولے۔ بالآخر قید کی سزا ہوئی۔

قید سے رہائی کے بعد وہ مکتبہ جامعہ میں ادبی معاون مقرر ہوئے اور بعد کو ”پیام تعلیم“ کی ترقیب ان کے سپرد کر دی گئی۔ ”پیام تعلیم“ شروع میں بچوں کا رسالہ نہیں تھا۔ اسے مسیح الملک حکیم اجمل خان (ف: دسمبر ۱۹۲۷ء) اور عبدالحیید خواجہ بیرسٹر (ف: دسمبر ۱۹۴۲ء) سمیت دیگر صاحب مرحوم (ف: مئی ۱۹۴۹ء) اور ڈاکٹر سید عابد حسین مدظلہ نے ۱۹۲۶ء میں جاری کیا تھا۔ ڈاکٹر سید عابد حسین ہی اس کے اڈیٹر مقرر ہوئے تھے۔ اس کا مقصد عوام کو جامعہ ملیہ کے کاموں سے باخبر رکھنا اور انہیں نئے نئے تعلیمی مسائل اور تجربات سے مانوس کرنا اور ان کی طرف توجہ دلاتا تھا۔

جب محمد حسین حسان مدیر معاون ہو کر آئے، تو انہوں نے بہت خاموشی سے اسے آہستہ آہستہ بچوں کا پرچہ بنا دیا۔ اس زمانے میں خالص بچوں کے لیے اچھے معیار کا قابل مطالعہ مواد بہت کم تھا۔ نوکر صاحب مرحوم کو بچوں کی تربیت سے جو دلچسپی تھی، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ حامد علی خان (ف: ۱۹۴۳ء) مکتبہ جامعہ کے منبر تھے۔ ان کی تجارتی سوجھ بوجھ بلا کی تھی۔ انہوں نے اس خوشگوار جدی ملی کو مالی مفاد کے پہلو سے جانچا۔ غرض دونوں نے محمد حسین حسان صاحب کے کام کی تحسین کی، اور ”پیام تعلیم“ نے بہت جلد اس صنف کے صفِ اول کے پرچوں میں اپنی جگہ بنالی۔ حیدر آباد اور کشمیر کے محکمہ تعلیم میں یہ منظور شدہ فہرست میں شامل ہو گیا اور ان دونوں ریاستوں کے مدارس کے لیے اس کی سرکاری خریداری منظور ہو گئی۔ ۱۲۱ سے اس کی اشاعت کہیں سے کہیں پہنچ گئی؛ اسی کی حامد علی خان مرحوم کو توقع تھی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس دور میں اس

کے معنوں نگاروں میں خود نوکر صاحب کے علاوہ پروفیسر محمد حبیب، پروفیسر  
 بشید احمد صدیقی، ڈاکٹر سید عابد حسین کے نام بھی ملتے ہیں۔ شفیع الدین نیر کا بچوں کے  
 شاعر کی حیثیت سے نام اسی زمانے میں چمکا۔ آج کے بعض مشہور لکھنے والوں نے  
 خنوں نگاری کی ابتدا پیام تعلیم ہی سے کی تھی۔ اس کے سالناموں اور خاص  
 نمبروں کا بھی اس دور میں بہت شہرہ تھا، بلکہ اس کی یہ خصوصیت تو آج تک  
 قابلِ ملاحظہ ہے۔

محمد حسین حسان صاحب نے لکھنا دارالعلوم ندوۃ العلماء کی طابع علمی کے زمانے میں  
 شروع کیا، بلکہ شاید اس سے بھی کچھ پہلے۔ مدتوں ان کے مضامین المناظر (مکثوتوں)،  
 نقیب (بدایون)، زمانہ (کانپور)، شمع (آگرہ) وغیرہ میں شائع ہوتے رہے شروع  
 میں زیادہ توجہ عربی مضامین کے تراجم پر رہی۔ ان کا ایک طویل معنون "عمود  
 غزنوی کی بزمِ ادب" بالانتساب جامعہ میں شائع ہوا تھا۔ لیکن ان کے اصلی جوہر  
 پیام تعلیم کی ادارت کے زمانے میں کھلے۔ انھیں پہلی متغیہ اور سلیس زبان اور  
 روزمرہ پر حیرتناک قدرت حاصل تھی۔ بچوں کی نفسیات اور ان کی پسند اور  
 ناپسند کا انھیں گہرا شعور تھا۔ اس لیے انھوں نے بچوں کے لیے معلوماتی مضامین  
 اور کہانیاں لکھیں۔ یہ بہت مقبول ہوتیں۔ ان کی سب سے پہلی کتاب آنحضرت  
 صلعم کی سوانح عمری "سرکارِ دو عالم" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ اس کی  
 مقبولیت کا کچھ اندازہ اس سے لگا بیٹے کہ اب تک اس کے ۱۸-۱۹ ایڈیشن بچپ  
 چکے ہیں، یہ کسی زمانے میں ریاست میسور کے عدارس کے نصاب میں شامل تھی۔  
 ان کی دوسری کتاب "ونیا کے بچے" کا بھی یہی حال ہے، اس کے بھی ۱۵-۱۶  
 ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ ایک اور کتاب "نامورانِ اسلام" بھی، اس پر انھوں  
 نے بہت محنت کی تھی اور اس کا مواد بڑی تحقیقی سے فراہم کیا تھا۔ چھپنے سے  
 پہلے مسودہ ڈاکٹر نوکر صاحب مرحوم اور علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم (مذہب  
 ۶۱۹۵۳) کو دکھایا تھا، تاکہ اس میں کوئی قابلِ اعتراض بات نہ رہ جائے۔

یہ تقسیم سے کچھ قبل (غائباً ۱۹۳۵ء) میں پہلی بار شائع ہوئی تھی میرے علم میں تقسیم کے بعد اس کا کوئی ایڈیشن شائع نہیں ہوا۔ وہ اس پر نظر ثانی کر رہے تھے۔ اس کا مسودہ یقیناً محفوظ ہو گا۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ اسے دوبارہ شائع کیا جائے۔ یا دیا، ان کی ایک اور مفید اور معلوماتی کتاب ”ہماری زمین“ بھی تھی۔ اس میں مختلف مآخذ سے سائنسی کرائف جمع کر کے یکجا کر دیے ہیں کہانی کے پیرایے میں؛ بڑے کام کی چیز ہے۔

تقسیم ملک کے ساتھ مکتبہ جامعہ پر بھی ابتلا آئی۔ پیام تعلیم بند ہو گیا۔ جب جامعہ ملیہ کے دفاتر اٹھلا آئے، تو انھوں نے کوشش کی کہ اسے دوبارہ جاری کیا جائے لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ اسی زمانے میں جامعہ نے ایک ادارہ تعلیم ترقی کے نام سے قائم کیا تھا۔ اس کا مقصد بالعموم کے لیے لٹریچر پیدا کرنا تھا۔ حسین حسان صاحب اس ادارے سے وابستہ ہو گئے۔ اس جگہ انھوں نے جہاں دوسروں کے مسودوں پر نظر ثانی کی اور انھیں اشاعت کے لیے تیار کیا، وہیں خود بھی بہت کچھ لکھا۔ اس میں سے کچھ چھپ گیا، کچھ مسودوں کی شکل میں رہ گیا (اور اب تک غائباً دیکھنے کی نظر ہو چکا ہو گا)۔ الزم کس پر؟ ”آستین کا سانپ“، ”امٹی دوا“، ”برف کا گھر“، ”چاند“، ”تاؤ کے پدیش“، ”زمین کے سہاٹی بہن“، ”رامو نے پڑھنا سیکھا“، ”دیکھ“، ”کتنی زمین وغیرہ“ یہ کتابیں اسی زمانے میں شائع ہوئیں۔

۱۹۴۳ء میں پیام تعلیم دوبارہ شائع ہونا شروع ہوا، تو ترتیب کے لیے قرعہ فال پھر ان کے نام پڑا۔ وہ آخر تک اس کے مدیر رہے۔

صحت بہت دن سے سقیم چلی آرہی تھی۔ وے کا عارضہ تھا۔ بہت ہی نحیف و نزار ہو کے رہ گئے تھے۔ اگر کثیر العیالی اور بچی جموریوں وانگلر نہ ہوتیں، تو وہ کہہ کے ان جھیلوں سے الگ ہو چکے ہوتے۔ لیکن ہندوستان کے ادیب کی قسمت میں آرام صرف کنارہ محدود میں لکھا ہے۔ اسی حالت میں ۱۲ جولائی ۱۹۴۴ء



کو انھیں حبس بول کی تکلیف لاحق ہو گئی۔ اس پر وہ اسپتال میں داخل ہوئے۔  
 نئے دن ۱۳ جولائی ۱۹۷۴ء (دس مول چنڈا اسپتال میں) صبح ساڑھے چھ بجے  
 کے قریب حرکت قلب بند ہو جانے سے رحلت کی۔ اسی دن ظہر کے بعد جامعہ  
 ملیہ کے قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

بیراؤ اقی تعلق ان سے ۱۹۳۶ء سے تھا۔ اور میں نے عربی کا پہلا سبق اسفین  
 سے پڑھا تھا۔ اس زمانے میں جامعہ ملیہ کے دوسرے عملے کے ساتھ وہ سبھی  
 قزول باغ میں رہتے تھے۔ حسن اتفاق سے میں نے بھی کرایے کا مکان اسی  
 جگہ لے لیا۔ جب ان سے خاصا ربط ضبط پیدا ہو گیا تو ایک دن میں نے ان  
 سے عربی پڑھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ وہ بے حد خوش ہوئے۔ اسی  
 ہو گئے۔ چنانچہ میں نے سبھی سے ابتدائی نصاب کی کتابیں (القرآن الرشیدہ  
 کے چاروں حصے منگوا لیے۔ ان میں سے پہلے دو باتیں میں نے ۱۹۳۷ء-۱۹۳۸ء  
 کے جاڑوں کے چار پانچ مہینوں میں سبھا ان سے پڑھ لی تھیں۔

پہلی پوری سے ایک لڑکی یا لڑکا تھی۔ دوسری بچہ سے چار بیٹے (حسب،  
 شعیب، نجیب، شکیب) اور تین بیٹیاں (صفیہ، ریحانہ، فرزانہ) ان کے  
 سوگواروں میں ہیں۔

اب کہاں ملیں گے، اس محبت اور دینی علم کے لوگ۔ اللہ تعالیٰ انھیں کر دے  
 کر دے جنت نصیب کرے۔ آمین!

## ساغر صدیقی، محمد اختر

ساغر صدیقی نے ایک مرتبہ کہا تھا: "میری ماں رتی کی تھی، باپ پٹیاں کا، پیدا اترسر میں ہوا، زندگی لاہور میں گزری؛ میں بھی عجیب چوں چوں کا مرتبہ ہوں؛ اس قول میں صرف ایک مہولی سی غلطی کے سواے اور سب سچ ہے۔

در اصل ان کا خاندان انبالے کا تھا، اور وہ پیدا بھی انبالے میں ہوئے۔ سال ۱۹۲۸ء میں گھر میں ہر طرف افلاس و محنت کا دور دورہ تھا۔ ایسے میں تعلیم کا کیا سوال! محلے میں ایک بزرگ حبیب حسن رہتے تھے، انھیں کے پاس جانے آنے لگے۔ جو کچھ پڑھا انھیں سے۔ اس کے بعد شاید ورنیکلر ڈل کے کچھ درجے بھی پاس کر لیے ہوں۔ ایک دن انھوں نے اس ماحول سے تنگ آ کر اترسر کی راہ لی، اور یہاں ہال بازار میں ایک دوکاندار کے وہاں ملازم ہو گئے، جو لکڑی کی کنگھیاں بنا کر فروخت کرتا تھا۔ انھوں نے بھی یہ کام سیکھ لیا۔ دن بھر کنگھیاں بناتے اور رات کو اسی دوکان کے کسی گوشے میں پڑ سکتے۔ لیکن شعور وہ اس ۱۳-۱۵ برس کی عمری میں کہنے لگے تھے، اور اپنے بیشکلف دوستوں کی محفل میں سناتے بھی تھے۔ شروع میں غمگین ناصر مجازی تھا۔ لیکن جلد ہی اسے چھوڑ کر ساغر صدیقی ہو گئے۔

ساغر کی شہرت ۱۹۴۴ء میں ہوئی۔ اس سال اترسر میں ایک اچھے بڑے پیمانے پر مشاعرہ قرار پایا۔ اس میں شرکت کے لیے لاہور کے بعض شاعر بھی مدعو تھے۔

ان میں سے ایک صاحب کو معلوم ہوا کہ یہ "لڑکا" (ساغر صدیقی) بھی شعر کہتا ہے۔ انہوں نے مشکلیں سے کہہ کر اسے مشاعرہ میں پڑھنے کا موقع دلوا دیا۔ ساغر کی آواز میں بلا کا سوز تھا اور وہ ترنم سے پڑھنے میں جواب نہیں رکھتا تھا۔ پس پھر کیا تھا، اس شب اس نے صبح معنوں میں مشاعرہ لوٹا لیا۔

قدتاً اس کے بعد امرتسر اور لاہور کے مشاعروں میں اس کی مانگ بڑھ گئی۔ اب اس نے کنگھیاں بنانے کا کام چھوڑ دیا اور بعض سرپرست اصحاب کی مدد سے اپنا علم اور صلاحیت بڑھانے کی کوشش کی۔ مشاعروں میں شرکت کے باعث اتنی یافت ہو جاتی تھی کہ اسے اپنا پیٹ پالنے کے لیے مزید تنگ و دو کی ضرورت نہ رہی۔ گھر والے بیشک ناراض تھے کہ لڑکا آوارہ ہو گیا ہے اور کوئی کام نہیں کرتا، لیکن اُسے اُن کی کیا پرواہ تھی؛ اس نے گھر آنا ہی چھوڑ دیا۔ کلام پر اصلاح کے لیے لطیف انور گورداس پوری مرحوم کا انتخاب کیا اور ان سے بہت فیض اٹھایا۔

۱۹۴۷ء میں پاکستان بنا، تو وہ امرتسر سے لاہور چلا گیا۔ یہاں دوستوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اُس کا کلام مختلف پرچوں میں چھپنے لگا۔ سینما فلم تیار کرنے والوں نے اس سے گیتوں کی فرمائش کی اور اس میں اسے حیرتناک کامیابی حاصل ہوئی۔ اس دور کی متعدد فلموں کے گیت ساغر کے لکھے ہوئے ہوئے ہیں۔ اس زمانے میں اس کے سب سے بڑے سرپرست انور کمال پاشا و اہن نجیم احمد شجاع مرحوم) تھے، جو پاکستان میں فلم سازی کی صنعت کے بانیوں میں ہیں۔ انہوں نے اپنی بیشتر فلموں کے گانے ساغر سے لکھوائے اور یہ بہت مقبول ہوئے۔

۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۲ء تک ساغر کی زندگی کا زریں دور کہا جاسکتا ہے۔ وہ لاہور کے کئی روزانہ اور ہفتہ وار پرچوں سے منسلک ہو گیا، بلکہ بعض جریدے تو اسی کی ادارت میں شائع ہوتے رہے۔ لیکن اس کے بعد شامت اہمال سے

حالات نے ایسا پلٹا کھا یا کہ وہ کہیں کا نہ رہا اور اخیر میں صحیح معنوں میں رقیعِ حبرت بن گیا۔

۱۹۵۲ء کی بات ہے کہ وہ ایک ادبی ماہنامے کے دفتر میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے سر درد اور اضمحلال کی شکایت کی۔ پاس ہی ایک اور شاعر دوست بھی بیٹھے تھے۔ انہوں نے تعلقِ خاطر کا اظہار کیا اور خاص ہمدردی سے انہیں مارفیا کا ٹیکہ لگا دیا۔ سر درد اور اضمحلال تو دور ہو گیا، لیکن اس معمولی آفت نے ان کے جسم کے اندر فحش بازی کے تناور ورخت کا بیج بو دیا۔ بد قسمتی سے ایک اور واقعے نے اس رجحان کو تقویت دی۔

اس زمانے میں وہ انارکلی لاہور میں ایک دوست کے والد کے (جو پیشہ کے لحاظ سے ڈاکٹر تھے) مطب کی اوپر کی منزل میں رہتے تھے۔ اسی کمرے میں ان کے ساتھ ایک اور دوست بھی مقیم تھے (اب نام کیا انھوں) ان صاحب کو ہر طرح کے نشوں کی عادت تھی۔ ہونی کو کون مال سکتا ہے، ان کی صحبت میں ساغر بھی رفتہ رفتہ آلا بھنگ اور شراب احمدان سے گزر کر انیون اور چرس کے عادی ہو گئے۔ اگر کوئی شخص راہِ راست سے بھنگ چائے اور توفیقِ ایزدی اس کی دستگیر ہی نہ کرے، تو پھر اس کا تحتِ اشرافی سے اور کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا۔

یہی ساغر کے ساتھ ہوا۔ اور انیسویں سے کہنا پڑتا ہے کہ خود ان کے دوستوں میں سے بیشتر نے ان کے ساتھ ظلم کیا۔ یہ لوگ انہیں چرس کی پڑیا اور مارفیا کے ٹیکے شیشیاں دیتے اور ان سے غزلیں اور گیت لے جلتے، اپنے نام سے پڑھتے اور چھواتے اور بحیثیت شاعر اور گیت نگار اپنی شہرت میں اضافہ کرتے۔ اس کے بعد اس نے رسائل و جرائد کے دفتر اور فلموں کے اسٹوڈیو میں جانا آنا چھوڑ دیا۔

اس میں بھی کوئی مبالغہ نہیں کہ ان اداروں کے کزنادھرتا اس کے کام کی اجرت کے دس روپے بھی اس وقت تک ادا نہیں کرتے تھے، جب تک وہ ان کے دیرِ دولت کی چوکھٹ پر دس سجدے نہ کرے۔ اس نے ساغر کے مزاج کی تلخی

اور دنیا بیزاری اور ہر وقت "نیوڈ" رہنے کی خواہش میں اٹانہ کیا۔ اور وہ بالکل آوارہ ہو گیا۔ نوبت بایں جا رسید کہ کہیں وہ تنگ مرنگ ایک بلی کی چادراؤٹھے، اور کبھی چیخندوں میں ملبوس، بال بھرائے تنگے پاؤں — منہ میں بیڑی یا سگرٹ لیے سڑکوں پر کھرتا رہتا اور رات کو تھکے میں ڈھٹا، مدہوش کہیں کسی سڑک کے کنارے کبھی دوکان کے تھکے یا تخت کے اوپر یا نیچے پڑ رہتا۔

اب اس کی یہ عادت ہو گئی کہ کہیں کوئی اچھے دوستوں کا دوست مل جاتا، تو اس سے ایک چوتی طلب کرتا۔ اس کی یہ چوتی مانگنے کی عادت سب کو معلوم تھی چنانچہ بارہا ایسا ہوا کہ کسی دوست نے اسے سامنے سے آتے دیکھا اور فوراً جیب سے چوتی نکال کر ہاتھ میں لے لی۔ پاس پیچھے، اور علیک سلیک کے بعد مصافحہ کرتے وقت، چوتی ساغر کے ہاتھ میں چھوڑ دی۔ وہ باغ باغ ہو جاتا۔ یوں شام تک جو دس بیس روپے جمع ہو جاتے، وہ اس دن کے چرس اور ماریفا کے کام آتے۔ ناخبر وایا ولی الابصار۔

جنوری ۱۹۷۳ء میں اس پر فالج کا حملہ ہوا۔ اس کا علاج بھی چرس اور ماریفا سے کیا گیا۔ فالج سے تو بہت حد تک نجات ملی گئی، لیکن اس سے دایاں ہاتھ ہمیشہ کے لیے بیکار ہو گیا۔ پھر کچھ دن بعد منہ سے خون آنے لگا۔ اور یہ آخر تک دوسرے تیسرے چارے ہمارے رہا۔ ان دنوں خوراک بالکل برائے نام تھی جسم سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ سب کو معلوم تھا کہ اب وہ دن دور نہیں جو اب وہ کسی سے چوتی نہیں مانگیگا۔ چنانچہ ۱۹ جولائی ۱۹۷۳ء صبح کے وقت اس کی لاش سڑک کے کنارے ملی، اور دوستوں نے لے جا کر اسے میانی صاحب کے قبرستان میں دفن کر دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یزدانی جاندھری نے قطعہ تاریخ وقات کہی :

ساغر نے رخت زلیست جہاں سے اٹھایا افسرہ اس کے غم میں ہیں یا ران انجمن  
وہ شہر پار شمر، وہ درویش بے بریا نعلیں تجھیں جس کی نظر میراج مگر دن

نعتوں میں جس کی جذبہ حب رسول تھا غزلوں میں جس کی سخن و جوانی کا باکپن  
یونانی حزن میں نے لبہ جام رکھ کے ہاتھ تاریخ رحلت اس کی کہی "ساغر سخن"

(۱۹۷۱ء تا ۱۹۷۳ء)

(۲)

اس نے غزل، نظم، قطعہ، رباعی ہر صنف سخن میں خاصا ذخیرہ چھوڑا ہے۔ وہ خود  
قوائے کیا چھوڑا، ناشرین نے اپنے فتنے کی خاطر اسے چھاپ لیا، اور اسے سناؤ  
میں ایک جہت تک نہ دیا۔ چھوڑے اس کی زندگی میں لاہور سے چھپے وغیرہ بہار  
نہر آر زو (۱۹۶۳ء) یوحنا جون (۱۹۷۱ء) اور سیرگیندا ورشب (۱۹۷۲ء) یو  
یقین ہے کہ اگر کوشش کی جائے، تو ایک اور مجموعے کا مواد باسانی ہوتا ہو سکتا  
ہے۔ ساغر کا کلام بہت جاندار ہے اور زندہ رہے گا۔

جی چاہتا ہے کہ یہاں اس کی زندگی کا ایک واقعہ قلمبند کروں، جس سے شہور  
یونانی فلسفی دیوجانس کلیکی کی روایت تازہ ہوتی ہے :

اکتوبر ۱۹۵۸ء میں پاکستان میں فوجی انقلاب ہوا۔ جنرل محمد ایوب (ف) اپریل  
۱۹۷۲ء پر سزا قرار آگئے اور تمام سیاسی پارٹیاں اور سیاست دان، جن کی  
باہمی چغٹاش اور رستہ کشی سے عوام تنگ آچکے تھے، حزب غلط کی طرح فراموش  
کر دیے گئے۔ لوگ اس تبدیلی پر واقعی خوش تھے۔ ساغر نے اسی جذبے کا  
اظہار ایک نظم میں کیا ہے۔ اس میں ایک مصرع تھا :

کیلے صبر جو ہم نے، ہیں ایوب ملا۔

یہ نظم جنرل محمد ایوب کی نظر سے سچی گزری یا گزاری گئی۔ اس کے بعد جب وہ  
لاہور آئے، تو انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ میں اس شاعر سے ملنا چاہتا ہوں  
جس نے یہ نظم لکھی تھی۔ اب کیا تھا! پولیس اور خفیہ پولیس اور نوکر شاہی کا  
پورا عملہ حرکت میں آگیا، اور ساغر کی تلاش ہونے لگی۔ لیکن صبح سے شام تک  
کی پوری کوشش کے باوجود وہ ہاں نہ لگا۔ اس کا کوئی سطور ٹھکانا تو تھا  
نہیں، جہاں سے وہ اسے پکڑ لیتے۔ پوچھ گچھ کرتے کرتے سر شام پولیس نے اسے

ایک پان والے کی دکان کے سامنے کھڑے دیکھ لیا، وہ پان والے سے کہہ رہا تھا کہ پان میں تو ام زرا یا وہ ڈالنا۔ پولیس افسر کی باجیبہ کھل گئیں کہ فکر ہے غلّی سبانی کے حکم کی تعمیل ہو گئی۔ انھوں نے قریب جا کر ساغر سے کہا کہ آپ کے حضور صدر ملک لے یا دفرمایا ہے۔ ساغر نے کہا: بابا، ہم فیروں کا صدر سے کیا کام! افسر نے اصرار کیا، ساغر نے انکار کی رٹ نہ چھوڑی۔ افسر بیچارہ پریشان کر کے تو کیا کیونکہ وہ ساغر کو گرفتار کر کے تو لے نہیں جاسکتا تھا کہ اس نے کوئی جرم نہیں کیا تھا، اور اسے کوئی دسی بدایت بھی نہیں ملی تھی، جرنیل صاحب تو محض اس سے ملنے کے خواہشمند تھے اور ادھر یہ پگلا شاعر یہ عزت انتہائی قبول کر لے کر تیار نہیں تھا۔ اب افسر نے جو مسلسل خوشامد سے کام لیا، تو ساغر نے نہج ہو کر اس سے کہا: ارے صاحب، مجھے گورنر افس میں جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ مجھے کیا دینگے، دوسو، چار سو، فیروں کی قیمت اس سے کہیں نہ بادل ہے جب وہ اس پر کبھی نہ ملا تو ساغر نے گلوڑی بکتے میں و باقی اور زمین پر پڑی سنگرٹ کی خالی ڈیا اسٹاک کر کے اُسے کھولا۔ جس سے اس کا اندر کا حصہ نمایاں ہو گیا۔ اتنے میں یہ تماشا دیکھنے کو اور گرد و خاصی سمیٹ جمع ہو گئی تھی۔ ساغر نے کسی سے قلم مانگا اور اس کا غڈ کے ٹکڑے پر یہ شعر لکھا:

ہم سمجھتے ہیں ذوقِ سلطانی

یہ کھلونوں سے بہل جاتا ہے

ساغر صدیقی بقلم خود

اور وہ کاغذ پولیس افسر کی طرف بڑھا کر کہا: یہ صدر صاحب کو دے دینا، وہ سمجھ جائیگے اور اپنی راہ چلا گیا۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پر آئندہ طبع لوگ

شاید کہ تم کو تیر سے صحبت نہیں رہی

ایک نغمہ، ایک نچہ، ایک تارا، ایک جام غم دوراں غم دوراں! تجھے میرا سلام

ہم بنائیں گے یہاں ساغرِ انجی تصویرِ شوق  
ہم تخیل کے مجدد، ہم تصور کے امام

گیت اس عہدِ مختلف میں  
بربطِ جنگ و لڑنے کو ترسے ہیں

ساتیلا تیرے بارہ ٹائے ہیں  
نام ساغر ہے، کے کو ترسے ہیں

چراغِ طور جلاؤ، بڑا اندھیرا ہے  
نہ نقابِ اسحاق، بڑا اندھیرا ہے

وہ جن کے ہونے میں خوشیہا کتنی تھیں  
اسٹیں کہیں سے بلاؤ، بڑا اندھیرا ہے

مجھے تمہاری نگاہوں پر اعتماد نہیں  
مرے قریب نہ آؤ، بڑا اندھیرا ہے

فرازِ عرش سے ٹوٹا ہوا کوئی تارا  
کہیں سے ڈھونڈ کے لاؤ، بڑا اندھیرا ہے

ابھی تو صبح کے ماتھے کا رنگ کالا ہے  
ابھی قریب نہ کھٹاکو، بڑا اندھیرا ہے

بصیرتوں پہ اجالوں کا خوف طاری ہے  
مجھے یقین دلاؤ، بڑا اندھیرا ہے

جسے زبانِ خرد میں شراب کہتے ہیں  
وہ روشنی سی پلاؤ، بڑا اندھیرا ہے

بنامِ زہرہ جبیناں خطہِ فردوس  
کسی کرن کو جگاؤ، بڑا اندھیرا ہے

سازِ کسی کی یاد میں جب اشکبار تھے  
کتنے حسین دن تھے جہاں خراب میں

جگمگاتے ہیں دشتوں کے دیار  
عقل نے آدمی کو بیچ دیا

ہم اُلٹ دیتے ہیں مدیوں کا نقاب  
ہم نانوں کی خبر رکھتے ہیں

یوں چلکے ہیں شاخ پر غنچے  
جیسے ان کے سلام آتے ہیں

رہبروں کے ضمیر محرم ہیں  
ہر مسافر یہاں لیٹر ہے

معبودوں کے چراغِ گل کر دو  
تعلیمِ انسان میں اندھیرا ہے

میں بھی جنت سے کالا ہوا اک بت ہی تو ہوں

ذوقِ تخلیق! تجھے کیسے ستم آتے ہیں!

ہاں ہیں نے لہو اپنا گلستاں کو دیلا ہے  
عجب کو گل و گلزار پر تنقید کا حق ہے

صبح دیکھا، اشگو نے تھے ٹوٹے ہوئے  
گل کھلاتی رہی، رات بھر، چاندنی

اے ستاروں کے چاہنے والے  
آنسوؤں کے چراغِ حاضر ہیں

روشنیِ جشنِ رنگ و بو کے لیے  
زخمِ حاضر ہیں، دماغِ حاضر ہیں



لشکرِ لشکر، ایسے تو بہ !  
 قطرے قطرے کو ہم ترستے ہیں  
 اے خداوندِ کوثر و تسنیم !  
 تیرے بادل کہاں برستے ہیں ؟  
 کچھ نہیں مدعا فقیروں کا  
 مدد ہے لادوا فقیروں کا  
 اپنی تنہائیوں پہ ہنستے ہیں  
 کون ہے آشنا فقیروں کا

ایک وعدہ ہے کسی کا جو دنا ہوتا نہیں  
 وہ نہ ان تاروں بھری راتوں میں کیا ہوتا نہیں

ہر شاد و کوہِ نہیں ملتا، تلاطم سے خسر ج  
 ہر سفینے کا محافظ ناخدا ہوتا نہیں

ہر سبکداری پا نہیں سکتا مقامِ خواجگی  
 ہر کس و ناکس کو تیرا غم عطا ہوتا نہیں

ہاے یہ یگانگی، اپنی نہیں مجھ کو خبر !  
 ہاے یہ عالم کہ تو دل سے جدا ہوتا نہیں

زمانے کو دے الزام، اے ناواقفِ منزل !  
 زمانے کی نظر ہم ہیں، زمانے کا چلن ہم ہیں

آوارگی بزرگ تماشا بُری نہیں  
 ذوقِ نظر ہے، تو بہ دنیا بُری نہیں  
 کہتے ہیں تیری زلف پریشاں کو زندگی  
 اے دوستِ زندگی کی تماشا بُری نہیں  
 ساغر کے ساتھ چل کے کبھی میسر نہیں  
 اتنی حدیثِ ساغر و بادہ بُری نہیں

یا درکھنا ہمداری تربت کو  
 قرض ہے تم پہ چار پھولوں کا

## جمالی، طفیل احمد

ان کا خاندان دراصل الہ آباد کا رہنے والا تھا، لیکن یہ ۱۹۱۹ء میں بنارس میں پیدا ہوئے، جہاں اس زمانے میں ان کے والد محمد اسحاق صاحب مقامی جیل خانے کے مہتمم تھے۔ وہ وہاں بہت لمبا عرصہ تعینات رہے تھے۔ چنانچہ جمالی کی ابتدائی تعلیم بنارس ہی میں ہوئی۔ بی۔ اے کا امتحان بعد کو ۱۹۴۱ء میں اپنے وطن الہ آباد یونیورسٹی سے پاس کیا۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد انھوں نے دلی کی راہ لی۔ سیاست اور مضمون نگاری سے انھیں طالعبعی کے زمانے ہی میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ یہاں دلی میں انھوں نے مختلف اخباروں میں جُز وقتی کام شروع کیا۔ پھر مستقل طور پر ”غشور“ کے عملے سے منسلک ہو گئے۔

۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہوا تو کراچی چلے گئے۔ ابتدا میں چندے روز نامہ ”جنگ“ میں کام کیا۔ جب مشہور کانگریسی اور کیونسٹ لیڈر میاں افتخار الدین (فدا جون ۱۹۴۲ء) نے اردو روزنامہ ”امروز“ جاری کیا، تو اس کا ایک ایڈیٹیشن کراچی سے بھی چھپنے لگا۔ اس کے ایڈیٹر مشہور صحافی چراغ حسن حسرت (فدا جون ۱۹۵۵ء) تھے۔ انھوں نے جمالی کی صلاحیتوں کا اندازہ لگایا اور انھیں امروز کے اسٹاف میں لے لیا۔ جمالی اس میں روزانہ ”پہلا درویش“ کے قلمی نام سے مزاحیہ کالم لکھنے لگے۔ وہ اس کے ہفتہ وار ایڈیٹیشن کے لیے

”گر تو بُرائے مانے“ کے معنوں سے ملک کی معاشری سیاسی ہمایوی ادبی، سرکاری پریس پر انداز میں تنقید کرتے رہے۔ یہ دونوں کالم (خاص کر مؤخر الذکر) بہت مقبول ہوئے۔

”امروز“ ہکراچی ایڈیشن بند ہو جانے کے بعد وہ فلمی دنیا سے وابستہ ہو گئے۔ اس زمانے میں انھوں نے متعدد فلموں کے مکالمے اور گانے لکھے۔ وہ کراچی کے مشہور فلمی رسالے ”شکار“ (ہفتہ وار) کے مستقل فلمی معاون تھے۔ اس میں وہ مختلف ناموں سے ہر ہفتے کئی کئی مضمون لکھتے رہے۔ یہ تعلق تقریباً دو برس تک قائم رہا۔

مجید لاہوری (دفہ جون ۱۹۵۷ء) اعلان کا ہفتہ وار مزاحیہ اخبار ”تمکد ان“ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ شکار سے علاحدہ ہونے کے بعد جمالی نے ”تمکد ان“ اپنی تحویل میں لے لیا۔ وہ دو برس تک اس کے مرتب رہے۔ زیادہ جتنہ اس کا بھی ان کے قلم سے ہوتا تھا۔

۱۹۶۳ء میں وہ روزنامہ ”انجم“ (کراچی) کے مدیر مقرر ہو گئے۔ اسی سال انھوں نے روس کا دورہ کیا۔ دو سال بعد مئی ۱۹۶۵ء میں ہیکس سرکاری اداسے ”نیشنل ان ڈیسٹنٹ ٹرسٹ“ کے افسر تعلقات، نامزد نامزد ہو گئے، لیکن یہاں سال بھر بھی مشکل سے گزرا ہو گا کہ حکومت چین نے ان کی خدمات حاصل کر لیں اور وہ ریڈیو پکینگ کے رسالے ”نصویر چین“ میں مترجم ہو کر چلے گئے۔ چین سے ۱۹۶۹ء میں واپس آئے۔

وہ پاکستان راسٹرنگ گیلڈ کے بانیوں میں سے ۱۹۶۲ء تا ۱۹۶۴ء تک دو سال اس کے سکتر رہے اور کچھ مدت اس کے رسالے ”ہم قلم“ کی ادارت بھی کی۔۔ بعد کو اس سے بھی تعلقات منقطع کرنا پڑے، اور انھیں بسراوقات کے لیے ریڈیو اور فلمی رسائل کا سہارا لینا پڑا۔

۱۹۷۰ء میں کراچی سے فیض احمد فیض نے ایک ہفتہ وار ”میل و نہار“ شروع کیا

تھا۔ جمالی اس میں اپنا کلام ”غر تو بڑا نہ مانے“ لکھنے لگے۔ لیکن یہ تعلق بھی زیادہ دن تک قائم نہ رہ سکا۔ اس کے بعد جمالی نے اپنا ذاتی پرچہ ”انقلاب“ (ہفتہ وار) جاری کیا۔ لیکن اس نے بھی پانچ شماروں کے بعد دم توڑ دیا۔

انہیں اردو، فارسی، انگریزی تینوں زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔ اردو اور انگریزی میں یتیم گھٹ لکھتے تھے۔ فارسی میں ان کا کوئی مضمون نظر سے نہیں گزرا۔ لیکن اس میں گفتگو اور تقریر وہ بڑی روانی سے کرتے تھے۔ وہ انجمن صحافیان پاکستان کی مجلس عاملہ کے رکن بھی تھے۔

انہی صلاحیتوں کا مالک اور کامیاب نثر نگار اور طنز نگار ہونے کے باوجود انہوں نے کلام کے مزاج میں استقلال نہیں ستھا۔ انجمن آرا اور انجمن ساز قسم کے انسان تھے۔ لاابالی پن گویا ان کے خیر میں تھا۔ ہر وقت دوستوں کے حلقے میں خوش گیسوں میں مصروف رہتے۔ اسی لیے عمر بھر پریشان رہے اور کوئی دیر پا کام نہ کر سکے۔ اور تاہم اپنا کلام تک جمع نہیں کیا۔ حافظ بہت اچھا تھا؛ اسی لیے جو کچھ کہا، سب یاد تھا؛ ضرورت پڑے پر وہ لمبی لمبی نغلیں (طنز بہ اور مزاحیہ) اور غزلیں سنا دیتے تھے۔

آخری عمر میں انہوں نے مہافت سے کتنا کشتی اختیار کر لی تھی اور بےسراوقات کے لیے ایک سیمنٹ ایجنسی چلانے لگے تھے۔ اسی کاروبار کے سلسلے میں ۱۰ اگست ۱۹۷۴ء ہفتے کے روز جہد رابا (سندھ) گئے۔ اگلے دن شام کو کراچی واپسی ہوئی۔ رات سوتے میں شدید کمر درد کی شکایت کی۔ صبح (۱۲ اگست) دل کا درد پڑا۔ فوراً اسپتال منتقل کرنے کا انتظام کیا گیا، لیکن رستے ہی میں جان بحق ہو گئے۔ اسی دن مغرب کے بعد سخی حسن و مبارک قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

شادی خاصی دیر سے ۱۹۷۲ء میں کی تھی۔ دو کسں لڑکیاں ان کے سوگواروں میں چرے۔

افسوس کہ ان کے کلام کا مجموعہ آج تک نہیں چھپا۔ اپنی بے پروائی اور لاابالیانہ پن

کی بدولت کبھی کوئی باقاعدہ میاض تک نہیں رکھی۔ مندرجہ ذیل تین غریب، مفلک  
رسائل سے جمع کی گئی ہیں :

کسی حبیب، نہ کسی نازنین کی بات کرو  
بہو سے بھیگی ہوئی آستین کی بات کرو  
گماں ہے موت، یقین موت کا جواب  
گماں سے ہاتھ اسٹاؤ، یقین کی بات کرو  
مقام آہ و فغاں سے گزر چکی ہے حیات  
نکا و گرم و دم آتشیں کی بات کرو  
نہیں ہے پیاسی لے خون دل کے چھینٹے دو  
پھر اس کے بعد تے وانگیلیں کی بات کرو  
مہر دستار کی محفل بڑی حسین ہے، مگر  
زمین والو! کچھ اپنی زمین کی بات کرو  
سیاہی شب، بحر ا کی داستان چھوڑو  
سحر قریب ہے، مہر مہیں کی بات کرو  
شگفتگی کے فسانے تو سن چکے ہیں بہت  
شکست خاطر اندو گلیں کی بات کرو

باغیاں کو بالمشردیکھ کر چپ ہو گئے  
اس چمن میں ہم بھی کیا سب دیکھ چپ ہو گئے  
گر یہ محفل جو یوں باقی رہی، تو کیا رہی  
دل دل چپ ہو گئے، اہل نظر چپ ہو گئے  
رات اس محفل میں کس خوابیدہ سر کا ذکر تھا  
ساز نوئے، راگ بیکے نمونہ مگر چپ ہو گئے

اک خبشتاں نور کو ترسا گیا، تر پا گیا  
سو سے بڑاں دیکھ کر شمس و قمر چپ ہو گئے  
کارواں کٹے کاظم بھی رفتہ رفتہ رُحل گیا  
رنگرز پھر سو گئی، اہل سفر چپ ہو گئے  
کم نہ تھے نازک مزاجی میں کسی سے ہم ہر  
ریخ دینے والے کو پہچان کر چپ ہو گئے  
اپنے دل کی دھڑکنیں ہم بھی سنانے آئے تھے  
قلبِ عالم کو دھڑکتے دیکھ کر چپ ہو گئے

ماستانِ خم میں لفظِ آسماں رہے دیا  
ایک نکتہ سخا کہ محتاجِ بیاں رہے دیا  
ان کو دیکھا، پھر بھی نظروں سے نہاں رہے دیا  
اپنی آنکھوں پر حجابِ بھگلتاں رہے دیا  
گل کو چوما، چاند کو دیوانہ وار آواز دی  
ایک پردہ ان کے اپنے درمیاں رہے دیا  
اس جہاں سے سرکشی کی، اس جہاں سے خودی  
لیکن ایک نازک سا سنگِ آستان رہے دیا  
اپنی پلکوں پر عین کے سارے آنسو لے لیے  
گل کو خندان، بلبلوں کو نغمہ خواں رہے دیا  
سیا بھٹکتے چشمہ جیواں کی خاطر در بدر  
اپنے پاس اک غم سقا، اس کو جا دلاں رہے دیا  
اے جمالی ابیکہ اک گلشن سے نسبت تھی ہمیں  
اپنے نغموں میں بھی اندازِ نفاں رہے دیا

## ٹھاکر پونجھی، جگن ناتھ

ان کا اصل نام سوہن لال تھا، لیکن مشہور جگن ناتھ کے نام سے ہوئے۔ وہ پونجھ کے ایک راجپوت خاندان میں ۳۱ دسمبر ۱۹۵۶ء کو پیدا ہوئے۔ پونجھ اس زمانے میں ریاست جوں و کشمیر کی ذیلی باجگراں ریاست تھی۔ ان کے والد باپو جیم سین کو درہاشی کھیلوں، خاص کر پولو اور نیزہ بازی میں خاص مہارت حاصل تھی، اسی باعث وہ راجہ صاحب پونجھ کے بڑے چیمپے اور منہ جڑے تھے اور اس کے باوجود کبیر کاوی طور پر محض ریاست کے محکمہ حسابات میں ملازم تھے، راجہ صاحب پونجھ کی نجی محفلوں میں بھی برابر شرکت فرماتے تھے۔ شاید حکمران خاندان سے دور نزدیک کی کچھ دوستی ماری بھی ہو۔ غرض ٹھاکر پونجھی بھی بچپن سے محل میں آنے جانے لگے اور ان کی تربیت اچھے مرنے والے طبع کے ڈھنگ پر ہوئی۔ پھر جب تعلیم کا زمانہ آیا تو اول انھیں مقامی دکتوریہ جوبلی اسکول میں اور بعد کو تیکمیل کے لیے پرنس آف ولز کالج (حال محاندھی میویری کالج) جوں میں بھیجا گیا، جہاں سے انھوں نے بی اے کی سند لی۔

تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ اولاً چندے محکمہ سول سہائی میں ملازم رہے۔ لیکن ان کی طبیعت کی جولاں کے لیے یہ میدان بہت تنگ تھا۔ وہ محض کلر کی اور بے عملی کی زندگی پر قانع نہیں رہ سکتے تھے۔ مشہور ہے کہ بچپن میں وہ گلی محلے کے بچوں کو ساتھ لے کر ڈرامے کھیلا کرتے تھے، اور سب لوگ انھیں جتھہ اڑکے نام سے پکارتے تھے۔ اس سے ان کے مزاج کے رواج کا پتا چلتا ہے۔ وہ ذاتی عملی اور مادی صلاحیتوں کے کوثر تھے۔ چنانچہ جب

سول سپلائی کے محکمہ سے دل اُچاٹ ہو گیا، تو ۱۹۴۸ء میں دلی چلے آئے۔ اُدوی دچہیں اور مشکل و صورت کے لحاظ سے اچھے تھے، کچھ سفارشیوں نے بھی کام کیا ہوگا جنہیں انہیں بہا جلدی کل انڈیا ریڈیو میں ملازمت مل گئی۔ جہاں وہ ڈوگری نیو سروس میں سب ایڈیٹر مقرر ہوئے تھے۔

دلی اس زمانے میں پنجاب سے آئے ہوئے پناہ گزینوں سے بھری تھی۔ لوگ جو بھوکے ننگے جان بچا کر یہاں آئے تھے، اور جن کے پاس سر پہانے کے لیے آسمان کی چھت کے سوا کچھ نہ تھا، انہیں تنہا ہر طرح کی مدد کے مستحق اور طلبکار تھے۔ ٹھاکر پو پھیں نے کچھ اور فنکاروں کے تعاون سے ٹھاکر کیے اور پروگرام بنائے، جن کی آمدنی انہوں نے شری رام سٹی ریلیف فنڈ میں پیش کر دی۔ اس کے لیے کچھ ڈرائے خود بھی بکھے تھے۔

دلی میں وہ دسمبر ۱۹۵۱ء تک رہے۔ اس کے بعد اسی مہینے پر جوں ریڈیو اسٹیشن میں تبادلہ ہو گیا۔ انہوں نے خاص طور پر ڈوگری علم و ادب اور کھیل کے فروغ میں نمایاں کام کیا۔ وہ ریڈیو اکادمی کے بھی رکن تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی افسانہ نویس سے شروع کی تھی۔ ان کا پہلا افسانہ غالباً "خانہ بدوش" تھا جو ۱۹۵۰ء میں "ایشیا" (پشتہ دار) میں چھپا۔ ۱۹۵۲ء میں بعد ازیں موت تک انہوں نے کوئی دو درجن ناول اور افسانوں کے تین مجموعے شائع کیے۔ ان کے بعض ناولوں اور افسانوں کا ایک کئی دوسری زبانوں، بنگالی، پنجابی، ملیالم، ہندی میں بھی ترجمہ ہوا۔ ان کے چند ناولوں کے نام یہ ہیں: ڈیڑی، دایاں اور ویراے، رات کے گھونگٹ، شمع ہر رنگ میں جلتی ہے، زلف کے سر ہونے تک، چاندنی کے سایے، یادوں کے کھنڈر، پیاسے بادل، اور اس تنہائیاں جب پتھر رستے ہیں، یہ رشتے یسٹ، پت بھرنے کے بھرنے، بھنورہ وغیرہ۔ زندگی کی دوڑ، چاندوں کے چاند، آدھے چاند کی رات، افسانوں کے مجموعے ہیں۔

وہ ڈوگری میں بھی بلا تکلف سمجھے تھے۔ ان کی تحریریں ہماری زندگی اور عوام کے مشاغل کا اچھا مرقع ہیں۔

زندگی کے آخری قیام میں انہوں نے ایک نیا ناول لکھنا شروع کیا تھا۔ "اب میں دہلی



نہیں رہتا: اسے انھوں نے ۱۴ اگست ۱۹۷۴ء کو مکمل کیا اور آخری صفحے پر یہ لفظ لکھا:  
 "ابنا پروردگار"

"یہ نام  
 سلام"

"خدا حافظ"

"سب کچھ درد ہے۔ سب کچھ پاس ہے، صرف احساس کی بات ہے۔"  
 یہ آخری لفظ لکھ کر وہ سبہر کو میز سے اٹھے اور دفتر سے باہر کچھ کھانے پینے کے لیے گئے۔  
 شکر پر پہنچے ہی تھے کہ ایک فیئر آئی ہوئی جیب الٹے نکرا گئی۔ داغ کو ضرب شدہ لکائی،  
 جس سے پریشانی ہو گئی۔ فوراً آخری بار دیکھا کہ گلاب سنگھ اسپتال پہنچا یا گیا، جہاں اسی  
 بیہوشی کے عالم میں جمعہ ۱۶ اگست (۱۹۷۴ء) صبح طائر روح نقیب عنقریب سے پرواز کر  
 گیا۔ موت سے کوئی تین مہینے پہلے سے انھوں نے "کہانی ختم" کا نقشہ ختم، کے الفاظ  
 کو اپنا تکیہ کلام بنالیا تھا۔ اس وقت انھیں کیا معلوم ہو گا کہ واقعی اتنی جلد ان کی جیون  
 کہانی یا قصہ حیات ایسے المناک طریقے پر ختم ہونے والا ہے۔

۱۹۴۶ء میں پونچھ کے وزیر خاندان میں شادی ہوئی تھی، لیکن بیوی سے نبھ نہ سکی اہل کوئی  
 ڈیڑھ دو سال میں طلاق ہو گئی۔ لاولد فوت ہوئے۔ ۵۱ برس کے دست و پیر اور  
 غمزدار تھے۔ ان کے خاڑے کے ساتھ زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا جو  
 ہجوم تھا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کتنے مقبول اور ہر دل عزیز تھے۔

## ہزار لکھنوی، سردار احمد خان

۱۹۰۰ میں اپنے خاندانی مکان، امین آباد پارک، لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ چونکہ خاندان مذہبی خیالات کا اور وہ بھی متوسط الحال مہتمم کا تھا، اس لیے تعلیم کے پہلو سے تشفی بخش انتظام نہ ہو سکا۔ پھر بھی ششم ہشتم ڈیڑھ کے درجوں تک اُردو، فارسی، عربی اور کچھ انگریزی حاصل کر لی۔ جب معاش کا مسئلہ پیش آیا تو دیوبند کے محلے میں ملازم ہو گئے۔ وہ مدتوں، لی، لی، اسی چلتی گاڑی میں محنت معاہدہ کرنے والے کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ان کے خاندان کا بریلی کی دنگاویہ نیازی سے پرانا تعلق تھا؛ یہ بھی وہیں سرحد تھے۔ اس لیے نادر دوسرے کے سختی سے پابند تھے۔ بچپن سے قوام کے تیلے اور جسم کے کزور تھے ہی؛ متواتر سفروں نے ذہنی بھی کسر پوری کنوی اور بیاور رہنے لگے۔ صحت سقیم، فرائض منہیں میں متواتر بے سفر لازم، جن میں بعض اوقات راتوں کو جاگنا پڑتا، اس پر نہ ہی ریاخت۔ غرض صحت نے بالکل جواب دے دیا اور اختلاجِ قلب کے دورے پونے لگے۔ لکھنؤ میں پھوش پڑے رہتے؛ اسے یا لوگوں نے حالتِ جذب سے تعبیر کیا۔ جب صحت کچھ بہتر ہوئی تو اب نئی اور نسبتہ سکون کی طارِ مست کی تلاش میں دلی آ گئے۔ اس زمانے میں یہاں آل انڈیا ریڈیو کے اصحاب بھارت بڑے ہمدرد مہتمم کے لوگ تھے؛ ان کی عنایت سے دوسری لی گئی اور یہ مضمون (سکرپٹ) لکھنے پر مقرر ہو گئے۔ دلی میں وہ تین چار برس رہے۔ یہی نادر نے جب میں نے انہیں دیکھا۔

اختلاجِ قلب کے مرض سے انہیں اتفاقاً تر ہو گیا، لیکن اس کے بعد سے وہ منتقلاً موت کی

اتنی خاص موتی دہریاتی گلی میں ڈالے جتے۔ جب کلام پڑھتے پڑھتے جوش میں آجاتے تو دونوں ہاتھوں سے اسے کھینچنے لگتے تھے۔ چونکہ وہ دہریاتی تھی اس لیے نیچے اوپر چلتی رہتی اور اس سے گلا گھونٹے جانے کا اندیشہ نہیں تھا۔ میں جس ملاقات کا ذکر کر رہا ہوں اس دن طبیہ کالج (قروباغ) محل کے کسی مشاعرے میں کلام سناتے کے لیے اسٹیج پر آئے تھے۔ میں نواب سائل مرحوم (ف ۱۹۴۵ء) کے قریب بیٹھا تھا۔ برابر میں کسی نے کہا: ”اوسے یہ گلی میں رکھی کیوں آئے ہوئے ہے اور اسے کھینچ کیوں آ رہا ہے؟“ اس پر سائل صاحب لبے: ”بھائی یہ دیوانہ ہے، لیکن بکا و خویش ہشیار۔ اگر کھینچے کو رتی نہیں ہو، تو یہ اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے گا۔“

بہزاد اگرچہ بیاں بہ طرح خوش تھے، لیکن ۱۹۴۰ء میں وہ ریڈیو کی لڑکوی حرکت کر کے پڑی فلم کمپن، لاہور میں مکالمہ نویس بن کر چلے گئے۔ لاہور میں دو تین برس رہے تھے۔ وہاں کا معاہدہ ختم ہوا تو وہ دوبارہ ۱۹۴۲ء میں آل انڈیا ریڈیو میں آ گئے، اب کے ان کا ٹکھنؤ ایشن میں مضمون (سکرپٹ) لکھنے پر تقرر ہوا۔ دو سال بعد، ۱۹۴۵ء میں انھیں راج محل کلاسنڈا بھیجے گئے اپنی فلموں کے لیے گیت لکھنے پر ملازم رکھ لیا۔ ۱۹۵۱ء تک یہی میں رہے۔ اس زمانے میں انھوں نے ۴۰-۵۰ فلموں کے لیے گیت لکھے ہوئے تھے۔ اسی سال پاکستان چلے گئے، جہاں جمعہ کے دن ۱۰ اکتوبر ۱۹۵۷ء کو قریب مغرب ان کا راجی میں انتقال ہو گیا۔ سنی دہگاہ کے قبرستان (کراچی) میں چار دیواری کے باہر اس راجا طرہ خاص میں دفن ہوئے، جہاں ان کے سلسلے کے لوگوں نے دہگاہ تعمیر کی ہے۔

بہزاد سب اصنافِ سخن پر قادر تھے۔ غزل، گیت، نظم کا دائرہِ خبرہ ان کے ہاں تھا ہے۔ لیکن ان کی خصوصیتِ شہرت نعت نگاری کی حیثیت سے ہوئی اور اس میں شہرہ نہیں کہ ان کی نعت میں خاص کیف اور درد ہے۔ لمن سے بڑھتے بھی خوب تھے۔ ان کے شعر مجموعے شائع ہوئے تھے۔ ان میں سے نمونہ درج ذیل اور چارخِ طور بہت مقبول ہوئے۔

انہوں نے ان کے کلام کا کوئی مجموعہ تلاشِ بسیار کے باوجود دستیاب نہ ہو سکا۔ بعض سال

ہیں شائع شدہ چند غزلیں ہیں انھیں میں سے چند شعر بطور نمونہ درج ذیل ہیں کلام  
میں بھی تصنیف کا رنگ غالب ہے، جوان کی زندگی کا ماہر الاقیا ز تھا،

اک عجیب عالم ہے جن کی یہ دنیا بھی  
داہر سے کیا پوچھوں راہن سے کیوں گلا  
مکوں مشرقی دے دیں لے لگا دیے پڑا!!  
منزلِ نظر وہ ہے، محفلِ دگر وہ ہے  
چہ پی در جانان، کعبہ نگاہ و جاں  
تھے بغیر مری زندگی کی دیرانی  
دل ہوئی مرے سینے میں علم کی جیگہ رانی  
عجیب رنگ سے شیرازہ بندگی نیکیں  
غلظوں نے گھیر لیا ہے چار جانب سے  
ہاں یہیں پہ جوتا ہے زندگی کا سودا بھی  
عجیب دود سے لے جان چال گذرتی ہے  
خدا گواہ کہ بیاختہ ابھرتی ہے  
دورِ رحمت و کلام سے بھرتی ہے  
جو یوں دُوب چکی تھی وہ خود ابھرتی ہے

تجھے خبر ہے مرے سوزِ عشق کی، پھر بھی

بتا جا کہ تری زلف کیوں سنو دیتی ہے

زسے زلفِ دگر رخ کا یہ رنگیں نظام  
مبارک، مبارک، انھی خود نقاب!  
میں کیوں راہبرِ تجھ کو تکلیف دوں  
وہ انھی، وہ انھی کسی کی نظر  
مرا اپنی خبر ہے، نہ دل کی خبر  
محب نے غشے عجب صبح و شام

ہے بخود سا بہر ادب مضطر، مگو

ہے اس کے لبوں پر تمھارا ہی نام

یہ تو ہی تھائے زاہد! ہے دیا کہ بے ریائی  
ٹوٹے آسمان کے صدفے کوئی حد کی کیف کی ہے  
میں جہاں سے منہ پھرا کر تھے پاس آ کر پہون  
مرا جذبہ ندامت، تری شان پارسانی  
کہیں منت ہو جاتی مرا ذوقِ جبرہ سانی  
کوئی اور کیا بھر گیا مرا کا سنہ گدائی

مری الجبذوں سے پوچھو، مری دھڑکنوں سے پوچھو  
 بڑی منزلوں سے گزری ہے جنوں کی نارسائی  
 مری زندگی ہے سستی، مری زندگی کا حاصل  
 نہ جنوں نہ ہوشمندی، نہ دانا، نہ بیوفائی  
 مری بیخودی تصدیق، مری مستیاں نچھاور  
 وہ ادھر ہی آ رہے ہیں، بکمالِ درجائی  
 تری رگڑ کے پھیرے، ترے آستان کے بچد  
 یہی ہیں مری خطائیں، یہی میری پارسائی

خبر نہ تھی تیری جستجو میں، کشاکش رہی ہوئی لیگی  
 قدم قدم پر جہیں جھکیگی، قدم قدم آگئی لیگی  
 تمہیں مبارک مرا آٹھ پنا، مجھے مبارک تمہارا چلو  
 یہ دونوں عالم رہیں سلامت، جہاں کو آسوں گی  
 نہ ڈھونڈوں کو لکھا، عالم، جہاں پہن ہوں جاتی، وہ پو  
 جہاں بھی کھویا ہوا لیگا، نضا بھی کھوئی ہوئی لیگی  
 ابھی نہ چھڑو، ابھی نہ چھڑو، ابھی تو دنوں طلب میں آؤ  
 یہ داریکون مجھ پہ کھوئے تھے ہو کر اور مشکل ابھی لیگی  
 خودی کے دھوکے میں آ رہا ہوں جنوں سے امن کا رہاؤ  
 سمجھ رہا ہوں یقین میں پھنس کر، سکون کی زندگی لیگی  
 ہمیں تو ہر ذرہ میکہ ہے کہ ہم تو ہیں ترے رند، ساقی!  
 مگر کہاں ستیاں لیٹگی، مگر کہاں بیخودی لیٹگی!  
 گناہ کے ہاتھوں خراب خستہ اکدھریہ دلائے جا رہیں  
 کہیں دیکھ نہ جکدھ ہے، ملی تو ان کی کھلی لیگی

## محشر مرزا پوری، مرزا فرزند علی

یکم جنوری ۱۸۹۸ء کو مرزا پور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حکیم علی صاحب تھے جو بچوں کو سخی تعلیم دینے کے لیے اس دور میں خاصی شہرت کے مالک تھے۔ فرزند علی صرف پانچ برس کے تھے، جب ان کا انتقال ہو گیا۔ محشر صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے والد کے بعض شاگردوں سے گھر ہی پر حاصل کی؛ اور اس کے بعد، پندرہ سال ۱۹۱۴ء میں مقامی لندن مشن ہائی اسکول (حال بابوالا جیووال انٹر کالج) سے دسویں درجے کا امتحان اول ڈویژن میں پاس کیا۔ اس طرح وہ اردو، فارسی، ہندی اور انگریزی میں خاصی لیاقت کے مالک ہو گئے۔ چونکہ خاندان کی ذمہ داریاں مزید تعلیم کے رستے میں مائل تھیں، اس لیے انہوں نے بسراوقات کے لیے ملازمت کرنے کا فیصلہ کیا۔ اولاً چند مرزا پور کلکٹریٹ میں نوکری کی۔ ۱۹۱۸ء میں ان کی شادی الہ آباد میں ہو گئی اور یہ اگلے برس وہاں چلے گئے۔ یہاں کوئی سال سبھڑو سٹریٹ بورڈ میں کام کیا اور اس کے بعد خفیہ پولیس کے محکمے میں بھرتی ہو گئے۔ شروع میں کرایے کے مکان میں قیام رہا۔ بعد کو جب حالات سازگار ہو گئے، تو ۱۹۲۸ء میں وہیں محلہ بچی پور میں اپنا مختصر مکان خرید لیا۔ ملازمت اور اس کے بعد سبھی اپنی وفات تک وہ اسی مکان میں مقیم رہے۔

۱۹۳۹ء میں ان کا ذمہ دار الہ آباد سے کھنڈو نشتیل مکر رہا گیا، تو یہ بھی اس کے

ساتھ وہاں بھیج دیے گئے۔ نہ معلوم کیوں، وہاں کی آب و ہوا ان کے راس نہ آئی اور اکثر بیمار رہنے لگے، خاص طور پر آنکھوں میں سخت تکلیف پیدا ہو گئی اور بینائی بتدریج کمزور ہونے لگی، اس پر ان کا الہ آباد کے ایک متعلقہ دفتر میں تبادلہ ہو گیا، لیکن اس سے بھی چنداں فائدہ نہ ہوا، رفتہ رفتہ بصارت بالکل جاتی رہی۔ آخر اسی باعث انہیں قبل از وقت ۱۹۲۷ء میں ریٹائر ہونا پڑا۔

ان کا الہ آباد کے جناب راحت حسین کی صاحبزادی سے نکاح ہوا تھا۔ ان کے بطن سے آٹھ بچے ہوئے؛ پانچ لڑکے (محمد علی مضطر، غنیمت علی غنیمت، اظہر علی، حیدر علی، صفا علی) اور تین لڑکیاں (قیصر جہان، انیس جہان، فردوس جہان)۔ بڑی بیٹی قیصر جہان کا ان کی زندگی میں انتقال ہو گیا تھا۔ باقی سب بچے بفضلہ تعالیٰ زندگی سلامت موجود ہیں۔

انہوں نے ۱۹۲۲ء میں شعر کہنا شروع کیا تھا۔ آغاز سخن گوئی میں پروفیسر ضامن علی ضامن صد شیعہ اردو، الہ آباد یونیورسٹی کے برادرِ خود و میزِ حامد علی حامد مرحوم سے مشورہ رہا۔ سپر سید حسن مرتضیٰ شفیق عماد پوری تعلیمِ امیر بینائی سے رجوع کیا۔ شفیق نے چند غزلیں دیکھنے کے بعد فارغِ اہلِ اصباح قرار دے دیا۔ اس کے بعد کسی سے اصلاح نہیں لی۔ افسوس کلام کا مجموعہ ان کی زندگی میں شائع نہیں ہوا۔

۲۵ اکتوبر ۱۹۷۴ء کو فالج کا حملہ ہوا اور ہفتہ بھر بعد بروز جمعہ یکم نومبر ۱۹۷۴ء کو دن کے دس بجے داعیِ اہل کولیک کہا۔ جنازہ اگلے دن ہفتے کو بوقتِ صبح اٹھا، اور انہیں ہمت گنج کی کربلا میں اپنے خاندان کے بیشتر دوسرے لوگوں کے قریب دفن کر دیا گیا۔

عمر سحر کی مشق و ملازمت ادا ساتھ کی صحبت کا اثر تھا کہ ان کا کلام زبانِ اردو کے پہلو سے بے عیب ہو گیا، اور انہوں نے خود استاد ی

کا درجہ حاصل کر لیا۔ انسوس کہ اللہ کا محبوبہ کلام آج تک شائع نہیں ہوا۔  
تمونے کے چند شعر درج دیے ہیں :

ہیں اسی شہبے میں گمراہ ہوا جاتا ہوں  
بیوقوف کہتی ہے دنیا جسے، وہ تم تو نہیں !  
بدگمان کیوں نظر آتی ہیں تمہاری نظریں  
خاموشی میری بہ اندازِ محکم تو نہیں !  
اے تمناؤں کے خالق ! خلشِ غم کے خدا !  
عشق ہی حسن کا معصوم تبسم تو نہیں !

یہ مانا چھن گیا آنکھوں کا نور اے محشر ! تو کیا جو دل میں تھی میرے وہ رشتی بھی گلا  
خطا معاف، ہم اس زندگی سے باز آئے۔ لعلِ نفس کا ہمارے شمار ہوتا ہے  
تو بہارِ سنِ فطرت، میں جنوںِ عشقِ رسوا  
تیری زندگی حقیقت، مری زندگی فسانہ

یہ زمانے میں نہیں دم کہ مٹا دے لہجہ کو محشر ! میں زمانے سے نہیں ہوں، مردم سے جبریلہ  
عشقِ بہارِ بجزاں، عشقِ سرورِ جاوداں عشق کا غم نشا طِ جاں، عشق سے دلِ بزرگ  
مرنے کا ٹھکانہ لی تو گیا، جیسے کا سہارا ہو تو گیا  
انہد کی دنیا بس تو گئی، کچھ ان کا اشارہ ہو تو گیا  
اے دردِ فراق ! اے دشمنِ جان ! اے زندگی غم کے سماں !  
تھے طلبِ جگر میں سے لڑاں، صدمہ وہ گورا ہو تو گیا  
کلیوں کا تبسم غائب ہے بچوں کے ہیں چہرے پر مر وہ  
لیکن ہم اس پر سمجھو لے میں، محلزار ہمارا ہو تو گیا

محوشِ رات میں، جب کائنات ہوتی ہے  
ترے خیال سے تا صبح بات ہوتی ہے



## تاج ٹونکی، نواب محمد اسماعیل علی خان بہادر (والی ٹونک)

انگریزی زمانے کے راجہ تانے میں ۲۲ ریاستیں تھیں، اور ٹونک ان میں واحد مسلم ریاست تھی۔ اس کی بنیاد امیر الدولہ نواب محمد امیر خان (ف ۱۸۳۹ء) نے انگریزوں کے ساتھ طویل کشمکش کے بعد ایک عہد نامے کی رُو سے نومبر ۱۸۱۶ء میں رکھی تھی۔ علم و ادب کی سرپرستی اور اسلامی شعائر کی حفاظت اور پابندی ہمیشہ اس ریاست کا خاص شعار اور طرۂ امتیاز رہی۔ حضرت سید احمد بریلوی کی مہم کی ناکامی کے بعد ان کے بقیت السیف قافلے کے برہنہ مجاہدین کو یہیں پناہ ملی تھی، محلہ "قافلہ" انہیں اسی کا بسایا ہوا ہے۔ ٹونک کے دوسرے حکمران نواب وزیر الدولہ محمد وزیر خان (ف ۱۸۶۳ء) کا نام غالب کی سوانح حیات میں بہت نمایاں ہے۔

نواب محمد اسماعیل خان اسی سلسلۂ الدہب کی ایک کڑی تھے۔ وہ ۳۱ جنوری ۱۹۱۷ء کو ٹونک میں پیدا ہوئے۔ وہ چوتھے فرمانروا نواب محمد ابراہیم خان حریت جنگ کے بیٹے تھے۔ اور بظاہر ان کے والی ریاست ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ لیکن مقتدر کو کون ٹال سکتا ہے! نواب محمد ابراہیم خان کے انتقال (۲۳ جون ۱۹۳۱ء) پر ان کے بیٹے سعید الدولہ نواب سعادت علی خان سعیدان کے جانشین ہوئے۔ وہ بھی تقریباً پندرہ برس کی جہان نانی کے بعد جمعہ ۲۳ مئی ۱۹۴۷ء کو

راگڑے عالم جاو ادانی ہوئے۔ چونکہ ان کے کوئی فرد نہ فرسینہ نہیں تھا، ان کے چھوٹے علاقے سبجانی ممتاز الدولہ فاروق علی خان گتہی پر بیٹھے۔ لیکن اسی پر مشکل

سے چھ مہینے گزرے ہونگے کہ ان کا اچانک دلی میں انتقال ہو گیا۔ ان کے سبب کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ اب ان کے برادر خورد محمد اسماعیل خان (جو باقی بھائیوں میں سب سے بڑے تھے) ان کے جانشین قرار پائے۔ جب تک حکومت ہند کی طرف سے اس کی باقاعدہ توثیق نہیں ہو گئی، تارنجنی ادب اردو کے مصنف جناب رام بابو سکسینہ (ف: ۱۹۵۷ء) جو یوپی میں کلکٹر کے عہدے پر فائز تھے ریاست کے منتظم قرار پائے۔ بعد کو حکومت ہند نے ۱۱ فروری ۱۹۴۸ء کو نواب محمد اسماعیل خان کی تخت نشینی کی منظوری دے دی، تو سکسینہ صاحب ہی وزیر اعلیٰ بنا دینے لگے تھے۔ انھوں نے عزیز الدین امیر الملک کا لقب اختیار کیا تھا۔

لیکن ملک آزاد ہو چکا تھا اور حکومت ہند چاہتی تھی کہ ویسی ریاستیں بھی ملک کے نظم و نسق میں ضم ہو جائیں۔ چنانچہ اس دھوکے پر لینک کہتے ہوئے نواب محمد اسماعیل خان بہادر نے بھی ٹونک کو مارچ ۱۹۴۸ء میں راجستھان سے ملا دیا۔ اس کے باوجود ان کے لیے ٹونک کی رعایا کی محبت اور احترام میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ اسی طرح یہاں کے لوگوں کا مہما و ماوا بنے رہے۔

جمرات ۲۱ نومبر ۱۹۷۴ء کو بعد ظہر بغاضہ کیفیر اپنے خالق حقیقی سے جاملے۔ تجبیز و تکفین اگلے دن صبح گیا سہ بجے ہوئی۔ جنازے کے ساتھ ہزاروں ہندو مسلمانوں کا مجمع تھا۔ ہر طرف سے جنازے پر گلابی ہو رہی تھی اور کوئی آنکھ ایسی نہیں تھی جو شکر بار نہ ہو موقی باغ ”شاہی قبرستان“ کے قطع خاص میں اپنے پروادا نواب، وزیر الدولہ کے سرانے سپرد خاک ہوتے۔

ان کے سبب اولاد نہیں تھی۔ اہل خاندان اور ٹونک کے عوام نے ان کے چھوٹے علاقے بھائی نواب مصوم علی خان کو ان کا جانشین قرار دیا۔

نواب محمد اسماعیل علی خان نے پورش سنبھالا، تو اپنے ارد گرد علم و فضل اور شعر و سخن کی فضا دیکھی۔ ان کے والد نواب محمد ابراہیم علی خان خود بھی شاعر تھے، غلیل خلق تھا۔ وہ مضطرب و پھر بسمل سے مشورۃ سخن کرتے رہے تھے۔

نواب محمد اسماعیل خان کی تعلیم کا معقول غبی انتظام ہوا تھا، انھوں نے مختلف علوم متعلقہ سائنسہ سے حاصل کیے۔ بعد کو انگریزی تعلیم کے لیے میو کالج، اجیر بھیجے گئے اور وہاں ایک انگریز ماہر تعلیم انایتی کی نگرانی میں چند برس رہے۔ ٹوٹک اس زمانے میں شعر و ادب کا شہر تھا۔ یہاں نواب محمد ابراہیم علی خان خلیل کی سرپرستی کے باعث شاعری کا وہ دورہ تھا۔ اساتذہ وقت نواب سلیمان خان بہادر اسد لکھنوی، سید محمد حسین بسمل خیر آبادی، سید محمد افتخار حسین خان مظفر خیر آبادی، سید ظہیر الدین حسین ظہیر دہلوی اور ان کے تلامذہ نے ٹوٹک کو حریف دہلی و لکھنؤ بنا دیا تھا۔ شاہی خاندان کے بیشتر افراد اور شہر کے لوگ شعر سے دلچسپی لیتے تھے اور آئے دن مشاعرے ہوتے رہتے تھے۔ ایسی فضا میں اگر نوجوان محمد اسماعیل خان بھی شعر گوئی کی طرف مائل ہونگے تو اس میں تعجب کا کیا مقام ہے! چنانچہ انھوں نے تاج تخلص اختیار کیا اور اردو میں طبع آزمائی کرنے لگے۔

انھوں نے مشورۂ ستم مولانا عبدالقادر خنداں لکھنوی ثم اجیری سے کیا، جو عربی، فارسی کے عالم اور اردو کے صاحب فن کہنے مشق شاعر ہیں۔ انھوں نے خود اپنے کلام پر مفتی مہدی حسن اور مولانا معنی اجیری سے اصلاح لی تھی۔ وہ ۱۹۴۷ء تک اجیر ہی میں رہے۔ آزاد و ملک کے بعد جب وہاں کی سکوت محو و شش ہو گئی، تو ٹوٹک چلے گئے۔ شروع میں بہت دنوں تک نواب صاحب کے کتا بخانے کے مہتمم بھی رہے۔ نواب صاحب مرحوم ان کے بڑے قدروان تھے۔

تاج مرحوم غزل سے بھی شغف رکھتے تھے۔ ان کے غزلیہ کلام کا دیوان (لمعات تاج) مرتب شدہ خنداں صاحب کے پاس موجود ہے، جس میں سے چند شعر انتخاب کر کے آخر میں دیئے جا رہے ہیں۔ انھیں حضرت رسالت کی ذاتِ ستودہ صفات سے جو محبت اور اراوت تھی، اس کا اظہار اکثر نعت کی

شکل میں ہوتا رہتا تھا۔ اپنے پندرہ بزرگوار حضرت جلیل کے اتباع میں ربیع الاول میں سات دن تک محفل میلاد کا قیام ان کے عہد میں بھی جاری رہا۔ اس کے اخراجات کے لیے ہزاروں روپیہ اپنی جیب خاص سے عطا کرتے تھے۔ روزانہ بلا امتیاز مذہب و ملت شیرینی تقسیم ہوتی تھی اور آپ کے محلِ نذر باغ میں چراغاں ہوتا تھا۔ ٹونک کو محفلیں کے بارے میں مولانا منظور الحسن برکاتی کا لکھا ہوا کدچہ ”ٹونک کے جشنِ میلاد البنی“ قاسم کی چیز ہے۔ مولانا برکاتی ہی کا مرتب کردہ تاجِ مرحوم کے نعتیہ کلام کا انتخاب بھی ”تاجدارِ مدینہ“ کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے (ٹونک ۶۷-۶۸) اس کے شروع میں انھوں نے وقیع اور جامع مقدمے کا اضافہ کیا ہے اس پر نواب صاحب مرحوم نے انھیں خطاب اور خلعت سے نوازا تھا۔

انھوں نے اپنے محلِ ”نذر باغ“ میں پندرہ روزہ مشاعرے کا التزام کیا تھا۔ یہ مشاعرے طرحی ہوتے، اور مضرع خود نواب صاحب مرحوم تجویز کرتے تھے۔ ٹونک کے ممتاز شعرا کے وظائف مقرر تھے۔ باہر سے بھی مشاہیر دعوت پر بلائے جاتے اور ان کے اعزاز و کرام میں کوئی کمی نہیں کی جاتی تھی۔ اگست ۱۹۶۷ء میں ان کی سرپرستی میں ”تاجِ اکیڈمی“ قائم ہوئی تھی جس کا مقصد ٹونک کی علمی اور ادبی تاریخ کی ترتیب اور ریاست کے جلیل القدر شعرا و ادبا کی تخلیقات کا تعارف تھا۔ یہ اکیڈمی آج بھی موجود ہے، غرض ان کی وفات سے ایک صاحبِ علم اور قدروانِ شعر و ادب شخص ہم سے جدا ہو گیا۔

اب نمونہ کلام ملاحظہ ہو :

تفصیل

ترتیب اخلاق سے قائم ہوا دنیا کا نظام (ایک ہی مذہب میں گمراہ کر کے آقا و غلام

## تذکرہ معاصرین

تختی بخت کے شاکی ہوئے سب شیریں کلام بحرِ لطافت و منیات، محمد طہ اکرام !  
 تھمے سرسبز و تروتازہ ریاضِ اسلام دشتِ پر خاں جہاں بن گیا گلزارِ حرام  
 تخیلِ بہتانِ مدینہ ز تو سرسبز مدام  
 زان شدہ شہرۂ آفاق پر شیریں طبعی

## تضمین

جگر تھامے ہوئے کوئی، کوئی مضطر، کوئی بیدم  
 کسی کے لب پہ آہیں، کوئی محوِ گریہ پیسہ  
 غرض میں کیا کہوں پیشِ نظر تھا کو لسا عالم  
 ”نہی دامن چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم“  
 بہر شور قفسِ لعل بود شب جائے کہ من بودم“  
 جمالِ حسن پر جس کی ندر اجنت کے نظارے  
 جو دیکھے اک نظر، قدموں پہ اس گمانِ دلِ طارے  
 مجسمِ نوبہارے، تجلّذارے، ایک رفتارے  
 ”پری پیکرِ نگارے، سرو قدِ لالہ رخسارے“  
 سراپا آفتِ دل بود شب جائے کہ من بودم“

عجب اک کشمکش میں مبتلا تھی، تاج ! میری جاں  
 زمیں و آسماں حیراں اور دیوار تھے لرزاں  
 مجھ یینا تھے خلوت میں کسی سے آج کچھ بیاں  
 ”رقیبانِ گوشِ ہر آواز، اور نازِ من ترساں“  
 سخنِ گفتن چہ مشکل بود شب جائے کہ من بودم“

جمالِ دمِ زدن ہے اور نہ یارے بیاں خسرو !  
 بیاں کیسے کردں، کیسے کھلے میری زباں خسرو

یہ شانِ تاجدارِ تاجدارانِ جہاں، خسرو  
خدا خود میرِ مجلس بود اندر لامکاں خسرو

محمد شمع مغل بود شب جاے کہ میں بودم

اب غزل کے چند شعرا ملاحظہ ہوں :-

پھر ہرے ہونے لگے زخمِ جگر لے بہنیش !  
آج ہی ہم نے کیا سقا عزمِ ترکِ میکشی  
ان کے ہونٹوں پر نوس ہے اختیار آنے لگی  
میکسے پر آج ہی کالی گٹھا چھلنے لگی  
گاہ آدبِ محبت کی قسم کھاتا ہوں میں  
گاہ آدبِ محبت سے گذر جاتا ہوں میں  
تاج میری شاعری کیا، بر سرِ محفل کبھی  
شعر کے چھکے ہیں دردِ دل سنا جاتا ہوں میر

میں قائم بے ستون لاکھوں تو اہت اور سیاہے

کشش کا عشق کی، ادنیٰ سایہ فیضان ہے شاید

غریباں چاک آنکھیں سرے، چہرہ خاک آلودہ

یہی لے تاج ! اربابِ جنوں کی شان ہے شاید

دل پر اب اختیار ہے میرا اب نہیں انتظار ہے میرا

ان کے آنے کا کچھ یقین سب آج دل بقیہ ر ہے میرا

جگر میں سوز، دل میں درد، آغشتہ بخون آنسو

فراہم ہو گئے سامانِ تکمیل محبت کے

گندی ہیں میری مشق ہیں راتیں ہزارہا طے میں نے کی ہیں عشق کی راہیں ہزارہا

اتنا ہی کھد دیا کہ سراپا ہوں شوق دید کھد کے واسطے تو میں باتیں ہزارہا

تو اس کے التفات سے غافل نہ رہ کبھی ایسے تاج ! حسن کی ہیں ادائیں ہزارہا

یہ غالی اہلِ دل سے تاج ! وہ فریاد و مجنوں سے

یہ سب آباویاں جبرِ نئی، یہ سب پرانے جھوٹے ہیں

ہوشِ ہستی، نہ تابِ نظارہ اب کی کیسی بہار آتی ہے

رہِ عشق میں شوق ہو مہر تو دشواریاں سب ہیں آسانیاں

پوچھتے رہتے ہیں، مرے حالات میں سناتا ہوں تو گتے میں  
 جس کو ہوز لطف پریشیاں سے کسی کی نسبت  
 اس کا جتنا بھی پریشان ہو حال، اچھا ہے  
 تاج! بے عشق کی دنیا کا نرالا دستور  
 حال جس کا ہو بُرا، اس کا مال اچھا ہے  
 یہ کھلتاں تھے جہاں اب ہیں ڈھیر خاروں کے  
 یہاں اترتے تھے سوکارواں ہزاروں کے  
 جنہیں ڈبویا سفاطوناں نے، وہ انجھر کے بیٹے  
 ڈانجھرے ڈوبنے والے کبھی کناروں کے

---

دل بہت بے قرار ہے میرا  
 دل پہ کیا اختیار ہے میرا

## شمر چھپروی، عبد الحفیظ صدیقی

ان کے خاندان میں ایک طرف عربی علوم اور اسلامیات کی روایت تھی، تو دوسری طرف شاعری اور وکالت کا پیشہ۔ ان کے والد مولوی عبد اللہ چھپرو کے کامیاب وکیل تھے اور اردو فارسی میں شعر بھی کہتے تھے، ان کی تعلیم تھا۔ انہیں تاریخ نویسی میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ تاریخی نام سے اپنا مجموعہ کلام بیان الغرائب کے نام سے مرتب کیا تھا، جو غیر مطبوعہ رہ گیا۔ ان کے والد (یعنی شمر کے دادا) مولوی بخش علی عربی اور فارسی کے عالم، دینیات کے فاضل اور فارسی کے شاعر تھے۔ انہیں بھی تاریخ گوئی میں خاص بہارت حاصل تھی۔ ان کا غیر مطبوعہ دیوان بھی خاندان میں موجود ہے۔

ایسے ماحول میں شمر (عبد الحفیظ) کی یکم فروری ۱۹۱۳ء کو چھپرو (محلہ دھباناواں) میں پیدائش ہوئی۔ وہ آٹھ سہائی بہن تھیں۔ دو سہائی ان سے بڑے تھے چار چھوٹے، بہن بھی چھوٹی تھیں۔ یہ سات آٹھ برس کے تھے کہ ۱۹۲۰ء میں ان کے دادا مرحوم نے ان کے بڑے سہائی عبد الحکیم کے ساتھ تعلیم کے لیے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ بھیج دیا۔ یہاں وہ دو برس تک رہے۔ لیکن سیاسی ہنگاموں، بالخصوص خلافت تحریک کے باعث یکسوئی نصیب نہ ہو سکی، آخر ان کے والد کے مشورے سے انہیں انگریزی تعلیم دلانے کا فیصلہ ہوا اور یہ پٹنہ واپس آ گئے۔ یہاں چھپرو اسکول میں داخلہ لے لیا۔ اس سے فارغ



ہو کر پٹنہ کالج میں پہنچے۔ درجہ بدرجہ ترقی کر کے بالآخر ۱۹۳۴ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے بی اے کی سند لی۔ اس کے بعد وکالت کا امتحان (ایل ایل، بی) بھی پاس کر لیا۔

تعلیمی تکمیل کے بعد کسبِ معاش کا مرحلہ آیا، تو اپنی سادگی پسند طبیعت سے اتفاق سے شروع میں معلّٰی کا پیشہ اختیار کیا اور پر سالیانہ اکول، سالانہ (ہمار) میں ملازم ہو گئے۔ لیکن نئی حالات کی مجبوری کے باعث یہاں دیا وہ دن بھگ نہیں رہ سکے اور والد کے توسط سے پٹنہ ہائی کورٹ میں مترجم کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔ آدنی محنتی تھے اور اخلاص و ایمان داری سے کام کرنے والے، محکمے میں ترقی پرتی گئی۔ پہلے ناظمِ دارالترجمہ مقرر ہوئے اور اخیر میں اؤتھورائزڈ ہی جج سے ۱۹۴۱ء میں سبکدوش ہو کر پھلواری شریف میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔

صحت بظاہر حال ہمیشہ اچھی رہی۔ اکتوبر ۱۹۴۳ء میں دل کا دورہ پڑا علاج کے لیے اسپتال چلے گئے۔ مبینا بھر بعد ۲۶ نومبر (۱۹۴۳ء) کو معالجوں نے کہا کہ آپ ٹھیک ہو گئے ہیں، رہا ہیں، تو مکان پر واپس جاسکتے ہیں۔ چنانچہ ہی شام پھلواری شریف پہنچے۔ دوست احباب، ارشدہ دار سب خوش و خرم تھے، ہنس مہنس کر ان سے باتیں کرتے رہے۔ اچانک دس بجے شب میں طبیعت بگڑ گئی اور اللہ اللہ کرتے جاں بحق ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ مد کا ہمدوم منہاج الدین راستی میں سپردِ خاک ہوئے۔

ابتدائی ماحول اور تعلیم کے زیر اثر شروع سے ورع و اتقا کی طرف مائل تھے۔ ہمیشہ پابندِ صلوٰۃ و صوم اور عاملِ امداد و وظائف رہے۔ ان کی فکری کا ہونی سا ثبوت یہ ہے کہ جب ان کے والد کا انتقال ہوا ہے، تو سب نے اتفاقاً راسے سے نماز جنازہ پڑھانے کے لیے انھیں امام بنا دیا۔

ان کی مشاوری کوٹلور (آرہ) میں دار و غمہ، مجلس کی صاحبزادی (فیضہ تونم)

سے ہوئی تھی۔ ان کے بطن سے چار بچے ہوئے: ایک لڑکا (جاوید اقبال) اور تین لڑکیاں۔ ماشا اللہ سب موجود ہیں۔

جس زمانے میں لکھنؤ میں زیر تعلیم تھے، وہاں دارالعلوم میں ایک تہ بزم سخن“ تھی، جس کے اہتمام میں مشاعرے منعقد ہوتے رہتے تھے۔ ان کی آسٹھ نو برس کی عمر تھی، یہ بھی ان مشاعروں میں جاتے اور وہاں اپنے سے بڑے طلبہ سے شعر لے کر اپنے نام سے پڑھ دیتے۔ یہی تفتن ان کی شعر گوئی سے شوق کی بنیاد بن گیا۔ چھپو اسکول کی طالب علمی کے زمانے میں خود کچھ تک بندی کرنے لگے۔ اور اصلاح کے لیے اسے اپنے دارالعلوم لکھنؤ کے رفیق مسید ابراہیم ندوی ختم سابق پرنسڈنٹ اسلامک اسٹڈیز، پٹنہ کے پاس بھیجے گئے۔ اس کا احترام ایک شعر میں بھی کیا ہے:

شاعری آتی نہ تھی مداح مل بھر کولے ثمر  
محبت نجم سخنور نے سخنداں کر دیا

چندے بعد نجم لے انہیں اپنے استاد حضرت تھانوادہی جیہی (ف: نومبر ۱۹۷۲ء) کے سپرد کر دیا۔ یہ سلسلہ بھی جلد ہی منقطع ہو گیا اور ۱۹۳۳ء میں یہ سیما ب اکبر آبادی (ف: جنوری ۱۹۵۱ء) کے علاقہ تلمذ میں شامل ہو گئے، آخر تک انہیں کے دامن سے وابستہ رہے۔ ان کے بارے میں کہتے ہیں:

کہنے کو بکثرت ہیں سخنور، لیکن

سیما ب کو استاد دیکھا نہ دیکھا

انہیں شری سے بھی دلچسپی تھی کہ، زمانے میں شہور فرانسیسی ناول نویس اور مصنف ہیدگو کے ناول کا ترجمہ ”بد نصیب“ کے عنوان سے کیا تھا۔ ابتدا میں کچھ نظموں انگریزی میں لکھی تھیں، جو انگریزی ماہر نے ”ٹریڈر چپٹ“ میں شائع ہوئی تھیں۔ افسوس کہ ان کا کوئی اردو مجموعہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ کلام بہت نچتر اور بے عیب ہے۔ فلسفیانہ طبیعت پانی تھی، یہی کی

جبلک ان کے کلام میں بھی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں :

عجب کیا جو سفر میں ہر قدم پر ساتھ ہے میرے  
یہ گر و راہ میری رازدوں معلوم ہوتی ہے  
سوئی پڑی ہے عیش کی منزل ترے بغیر  
ہیما نہ بن کے ٹوٹ گیا دل حرے بغیر  
مقصود ہوا نہ سعی کا حاصل ترے بغیر  
منزل پہ بھی ہے صحرے منزل ترے بغیر

بستر نگہ نشہ کار، کیا کہنا ! بدل دیا ہے رخِ روزگار، کیا کہنا !  
آلِ یک نگہ حسنِ یار، کیا کہنا ! بنا ہے خرمینِ دل پر شرار، کیا کہنا !  
غریب و وعدہ حسنِ یار، کیا کہنا ! پھر اس پہ بھی ہے ترا اعتبار، کیا کہنا !  
جہاں یار نے تجدیدِ عشق کا پیراں یک نگاہ کیا استوار، کیا کہنا !

خاموشی میں بھی کوئی کرتا ہے، کیا سرگوشیاں

سُن رہا ہوں آپ اپنی داستانِ دل کے قریب

نشاطِ انجیز حب انسان کی تقدیر ہوتی ہے

تو خود بیٹھے جھٹاتے غیب سے تدبیر ہوتی ہے

جب دل ہی نہیں پاک، تو کیا سمجھو گے ! ہے مقل نہیں خاک، تو کیا سمجھو گے !

دنیا کے ہوں یا عالمِ بالا کے دوز ! پیدا نہیں اداک، تو کیا سمجھو گے !

دشوا ہے انسان کا انسان ہونا ! ہاں سہل نہیں، صاحبِ عرفاں ہونا !

پھر بھی، نثر ! انسان جو کراہہ ہو ! مشکل نہیں، مشکل کا بھی آساں ہونا !

داناہِ آرزت کسی کو معلوم نہیں ! اہلی فطرت کس کو معلوم نہیں !

تہ پرہیز کرا عبادت سے، سب کو شہر ! اپنی قسمت کسی کو معلوم نہیں !

## انور کا مٹوسی، حافظ یار محمد انصاری

۱۸۵۷ء کی افادہ کے بعد انگریزی سیاست کی سخت گیری کے باعث شمالی ہند کے معاشرے میں ایک بڑی تبدیلی یہ آتی کہ یہاں کی گھریلو صنعتیں روپروان ہونے لگیں۔ اس زمانے میں کئی دستکار اور پیشہ ور خاندان تلاش معاش میں ترک وطن پر مجبور ہو گئے۔ انھیں میں یورپی کے دیہات کے پارچہ پاف بھی تھے، جو عرف عام میں انصاری کہا جاتے ہیں۔ اسی برادری کا ایک خاندان نزاری (ضلع فیض آباد) سے ۱۹۰۷ء میں ہجرت کر کے آگے پور سے ۱۶ کلومیٹر کی دوری پر کامٹی میں ہا ہا، جو اس زمانے میں تجارت کا مرکز تھا۔ اس خاندان کے بزرگ حاجی شیخ امیر تھے۔ موقوفہ کے چار بیٹے ہوتے، جن میں سے دو نے خاصا نام پایا۔ بڑے امونی مولوی اعلیٰ محمد، عالم اور درس و تدریس سے شغف رکھنے والے بزرگ تھے۔ انھوں نے سید غلام کبریا کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، انھوں نے صاحب اجازت تھے۔ بہت سے لوگوں نے ان سے فیض حاصل کیا۔ مارچ ۱۹۵۵ء میں رحلت کی۔

شیخ امیر کے دوسرے بیٹے بھی حافظ یار محمد انور تھے۔ کہا کرتے تھے کہ جب خاندان نزاری سے کاشی آیا ہے، تو میری عمر کوئی سات برس کی ہوگی۔ اس طرح ان کا سال ولادت ۱۹۰۰ء کے قریب ہونا چاہیے۔ کامٹی پہنچ کر شیخ نے بیٹے کو تعلیم کے لیے یہاں کے مشہور استاد حاجی صفی اللہ کے حوالے

کر دیا۔ چنانچہ انہوں نے حاجی صاحب موصوف کی نگرانی میں قرآنِ ناطقہ ختم کیا اور اسے حفظ بھی کر دیا۔ اس کے بعد فارسی ایک دوسرے استاد منشی محمد اسحاق صاحب سے پڑھی۔ کسبِ معاش کے لیے اپنے آبائی پیشے کو ترویج نہ کیا۔

یونہی کے اکثر مراثیوں کے کامی میں بس جانے کے باعث یہاں اردو کا عموماً اور شعر و ادب کا خصوصاً اچھا خاصا چرچا تھا۔ سال بھر مشاعرے ہوتے رہتے، اور عشرۂ محرم کی مجالس تو بڑے اہتمام سے ہوا کرتی تھیں۔ انور کی شعر گوئی شروع ہو چکی تھی۔ وہ بھی ان مجالس میں شریک ہوتے اور وہاں سلام وغیرہ پڑھتے۔ اس کے بعد طبیعت غزل کی طرف راغب ہوئی، تو انہوں نے مشہور مقامی شاعر سعید کاٹھوی (ف: مئی ۱۹۳۰ء) سے اصلاح لینا شروع کی۔

سعید خود صاحبِ فن اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ ایک زمانہ ہوا، ان کا ایک مجموعہٴ کلام ”ارمغانِ جدید“ کے تاریخی غلام (۱۳۱۵ھ) سے شائع ہوا تھا۔ سعید نے ابتدا میں چندے نشی خوش محمد سے اصلاح لی، بعد کو حاجی قجیل حسین قجیل جلاپوری (ف: ۱۹۳۳ء) سے مشورہ کرنے لگے۔ قجیل کا سلسلہ تین چار واسطوں سے ناسخ سے جا ملتا ہے۔ لیکن قجیل ہے کہ اگرچہ سعید کے کلام میں لکھنوی رنگ نمایاں ہے، مگر انور کے ہاں اس کا اثر بالکل برائے نام ہے۔ رفتہ رفتہ انور نے خود استاد کی کا درجہ حاصل کر لیا۔ اس نواح میں ان کے شاگردوں کی تعداد کچھ کم نہیں ہے۔

نیو کامی طلب نے ان کے کلام کا انتخاب ”تجلیاتِ انور“ کے عنوان سے شائع کیا تھا۔ ہنوز بہت کلام غیر مطبوعہ موجود ہے۔ کلام کا جو انداز ادبی معیار ہے اس کے پیش نظر یہ اس لائق ہے کہ اسے شائع ہونے سے بچایا جائے۔ اپنے گھر کے ماحول اور تعلیم کے زیر اثر ساری عمر صوم و صلوة کے پابند ہے۔

۱۹۶۱ء میں حج بھی کیا تھا۔ اخیر تک آرام و معائن میں مساجد میں تراویح پڑھاتے رہے۔ غرض متقی، پرہیزگار، پابند و منہج بزرگ تھے۔ وہ اختلاجِ قلب کے مریض تھے۔ بدھ ۲۷ نومبر ۱۹۷۳ء (۱۳ ذی قعدہ ۱۴۰۳) دن کے ٹھیکارہ بجے مرض کا شدید حملہ ہوا، جس سے جان نہ ہو سکے۔ اسی دن مغرب کے قریب سلم قبرستان، کامٹھی میں تدفین عمل میں آئی۔ حکیم حریر قدوسی کامٹھی نے قطعہ تاریخ وفات کہا:

اٹھ گئے، بزمِ جہاں سے افسوس ناز تھا اہل سخن کو، جن پر  
از سر آہ، کہا دل نے، عزیز! حیف جاتے رہے حافظِ افروز  
(۱) + ۱۹۷۳ = ۱۹۷۳ (۱۹۷۳)

صلبی اولاد میں چار بیٹے اور دو بیٹیاں اپنی یادگار چھوڑیں۔  
انور مرحوم بسیار گونہیں تھے، لیکن جو بھی کہا، خوب کہا۔ تعجب نہ تھے کہ  
کائنات کے غیر شاعرانہ ماحول میں وہ اتنے کامیاب شاعر کیونکر ہو گئے،  
واقعی یہ خدائے بخشنده کی دین ہے۔ تہلیاتِ انور سے چند شعر لفظ  
ہوں:

جانا بھی چاہتا ہوں تری بزمِ ناز سے  
پھر یہ بھی سوچتا ہوں کہ جایا نہ جاتیگا  
دیوانگی شوق کا عالم جو ہے، یہی  
انور سے ان کے سامنے جایا نہ جاتیگا  
شبِ غم، شام سے گھبرار باہوں الہی! خیر کیا انجام ہوگا!  
کفن کیا باندھ لوں میں سر سے، انور! سنا ہے، آج قیلِ عام ہوگا!

آیا وہ اور دل کو کیا، اے کے چل دیا ہم سوچتے ہی رہ گئے، یہ ماہر اے کیا!  
کما کر بھی سو فریبِ محبت ہوں مطمئن یہ ہجر کاری بتِ رنگیں اولیٰ کیا!

اس کو تری مغل میں تری دیکھ ہے کام کون آیا، گیا کون، یہ انور کو خبر کیا!  
 جہت بکھرا ہے ہوا، قصہ غم کی درناوی سے  
 جہاں تک سن سکو گئے تم، وہیں تک بھیاں اپنا  
 تم مہربان تھے، تو زمانہ ستا مہربان تم مہربان نہیں، تو کوئی مہربان نہیں  
 آتی بھی بہانا غور! رفت سبھی ہوئی کب کی  
 اب بکھسے گریباں سے الجھا ہوا سودا آتی  
 دودن کی زندگی بھی بڑی چیز ہے، مگر جینا ہی جب نہ آئے، تو پھر کیا کرے کوئی!  
 گتیاں سلجھائیں سب نے، کچھ بنا لیکن نہ کام  
 راز سخی پہلے بھی دینا، اور اب بھی راز ہے  
 دہی میں ہوں، جو ستھانا کام شرحِ آرزو اک دن  
 دہی میں ہوں، جسے کہتا ستھانا ہر اک بیڑیاں پہلے  
 یہ سوچتے ہی سوچتے، انور گدے گئے اس زندگی میں کیجیے کیا، کیا نہ کیجیے  
 ہر مدد کی، ہر غم کی دوا میرے لیے ہے کیا نام تھا نامِ خدا میرے لیے ہے  
 تنواری کسی پیش رفت بھی الفت میں ہے بہت  
 دل سے لے نہ دل، تو نظر سے نظر ملے

---

## شاہ معین الدین احمد ندوی

ہونے کے ضلع بارہ بنگی میں ایک مہتمم خیر قبیلہ رڈولی ہے۔ یہاں سے بعض ایسی ہستیاں اٹھیں جنہوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں امتیاز حاصل کیا اور آج تک ان کا نام عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ انہیں میں صابرہ چشتیہ سلسلے کے بزرگ حضرت شیخ عبدالحق آف ۱۸۳۶ء بھی تھے۔ جن کے نام سے اہل دل کے پلے روشن اور ان کی محفلیں آج بھی گرم ہیں۔ رڈولی میں ان کا زمر جمع الناس ہے شاہ معین الدین احمد ندوی انہیں کے خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ یہ خاندان نجبا فاروقی ہے۔

شاہ صاحب ۱۹۰۳ء میں رڈولی میں پیدا ہوئے۔ مگر کی زمینداری تھی۔ ان کے والد شاہ حسنا احمد مرحوم مجذوب صفت بزرگ تھے۔ اسی لیے شاہ معین الدین اپنے نانا کی کفالت میں آ گئے۔ نانا شاہ شرف الدین تعلیم یافتہ اور قدردان علم ہونے کے باوجود یہ نہیں چاہتے تھے کہ یہ مزید تعلیم کے لیے گھر سے باہر جائیں۔ لیکن معین الدین احمد کی قسمت میں کچھ اور لکھا تھا۔ انہوں نے کوتاہ زمانہ سطر مطابقت اور فارسی کی ابتدائی کتابیں گھر پر پڑھیں اور مزید دینی تعلیم کے لیے لکھنؤ پہنچ گئے۔ یہاں متوسطات تک کی مدرسہ نظامیہ فرنگی محل میں تحصیل کی اور اس کے بعد تکمیل کے لیے ۱۹۲۲ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لے لیا۔ اس عہد میں یہاں دارالعلوم میں ہر مضمون کا استاد اپنے



نہن کا ماہر، نقیروں و تحریر کے میدان کا شہسوار، طلبہ کا دلی ہمدرد تھا۔ نوجوان طالب علم نے اسی علمی ماحول سے اوجا پنے اساتذہ سے سہرا بھر کر راستہ فراہم کیا۔ اس نے میں مولانا عبدالرحمن نگرانی (ف: مارچ ۱۹۲۶ء) دارالعلوم میں تفسیر کے استاد تھے۔ عجیب و غریب آدمی تھے، یہ مولانا نگرانی۔ علم و فضل کا شعاعہ جوالہ! افسوس کہ یہ آج تک نہ جلد ہی تندی مہربا سے پگھل کر صرف ۲۷ برس کی عمر میں آنکھوں سے ادھل ہو گیا۔ شاہ معین الدین احمد ان کے چہیتے شاگرد تھے۔ نگرانی مرحوم نے ان میں جو برتاؤ دیکھا، تو ۱۹۲۴ء میں ان کے دارالعلوم سے فارغ ہونے پر انہیں اپنے استاد مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم (ف: نومبر ۱۹۵۳ء) ناظم دارالمصنفین کے پاس روانے کئے۔ کیا شبہ گھڑی تھی؟ جب ۲۱ سالہ نوجوان شاہ معین الدین احمد نے دارالمصنفین کے احاطے میں قدم رکھا تھا۔ جو رشتہ اس دن سے قائم ہوا، وہ پچاس سال کے بعد موت کے ساتھ ٹوٹا۔

مولانا سید سلیمان نے انہیں تربیت کے لیے (۲۵ روپے ماہرے پر) رفیق مقرر کر دیا۔ آہستہ آہستہ انہیں لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ دارالمصنفین نے سیرۃ النبی کی تالیف کے بعد صحابہ کے حالات کی تدوین شروع کی تھی۔ اس کی ابتدا فی رد جلدیں (خلفائے راشدین) اور "مہاجرین" (حصہ اول) مولانا حاجی معین الدین ندوی (ف: ۱۹۴۴ء) نے مرتب کی تھیں۔ اب انہیں کے ہمام شاہ معین الدین احمد جوالہ کے ہاتھ لگے، تو سید سلیمان ندوی مرحوم نے اسے خالی نیک خیال یا اور اس سلسلے کی تکمیل ان کے سپرد کر دی۔ شاہ صاحب مرحوم نے اس سلسلے میں "مہاجرین" (جلد دوم) لکھی؛ پھر "تابعین" لکھی؛ پھر صحابہ غیر مہاجر و انصار کی سیرت لکھی۔ اسی زمانے میں وسعت مطالعہ سے انہیں تاریخ اسلام لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ انہوں نے آغا سے خلافت بنو ہاشم کے اختتام تک چار جلدوں میں یہ سلسلہ مکمل کیا۔ یہ

کتاب بہت مقبول ہوئی۔ متعدد یونیورسٹیوں اور کالجوں کے نصاب میں شامل ہے اور اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

ان کے علاوہ ان کی بعض کتابیں یہ ہیں: اسلام اور عربی تمدن (عربی سے ترجمہ) عرب کی موجودہ حکومتیں، دین رحمت، حیات سلیمان (مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کی سوانح عمری)، ادبی نقوش (مجموعہ مضامین)۔ انہوں نے ۱۹۶۹ء تا ۱۹۷۱ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ۱۶ قبال کی مشاعری کے موضوع پر توسیعی خطبات بھی دیے تھے، یہ شاید ہنوز کتابی شکل میں شائع نہیں ہوئے۔

معارف کے شذرات وہ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے بھوپال چلے جانے کے بعد ہی سے مستقلاً لکھنے لگے تھے۔ ان کی تحریر کی سلاست اور مناسبت، پختگی اور اصابت مانے کے سب قائل تھے، سخت سے سخت بات بھی ایسی نرم اور سادگی سے کہ جاتے تھے کہ بڑے سے بڑا مخالف بھی اس پر انگلی نہیں، کہہ سکتا تھا۔

وہ تمام تحفیفی کاموں میں سید سلیمان ندوی مرحوم کے دست راست رہے۔ ۱۹۴۵ء میں مولانا ندوی مرحوم بعض مقامی حالات سے دل برداشتہ ہو گئے۔ انہیں آیام میں نواب محمد حمید الدخان والی بھوپال (ف، فروری ۱۹۶۰ء) نے انہیں اصرار سے اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔ اس پر مولانا سید سلیمان کو عظم گڑھ چھوڑ کر بھوپال جانا پڑا۔ وہ وہاں قصبات اعلیٰ کے منصب پر نیز دیہی اور ندہی امور کے منصرم بن کر لگے تھے۔ ان کی عدم موجودگی میں شاہ صاحب مرحوم نے دارالمصنفین کا نظم و نسق اور معارف کی ادارت کی نوسٹ داری جس خوش اسلوبی سے سرانجام دی، اس پر استاد نے خوشنودی کی سند دی، اور تصحیح کا اہماریا۔ پھر ۱۹۵۱ء میں جب سید صاحب منتقل طور پر ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے، تمام اس تاریخی ادارے کا سارا باران

کے اوصاف کے رفیق کار سید صباح الدین عبدالرحمن کے کندھوں پر آپڑا۔ اور خدا کا شکر ہے کہ وہ اس سے بوجہ احسن عہدہ برآ ہوئے۔ اسی کا شاندار نتیجہ دارالصفین کا جشن زترین تھا جو فروری ۱۹۶۳ء میں نائب صدر جمعیہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم (دف ۱۹۶۹ء) کی صدارت میں منعقد ہوا اور جس میں ملک بھر کے علماء اور اہل علم نے شرکت کی تھی۔

سیہ چشمی، اقربا پروری، استغنا، توکل ان کے کردار کے اجزائے ترکیبی تھے۔ ۱۹۶۴ء میں مشاہرہ محض ۲۵ روپے مقرر ہوا، تو وہ اسی میں خوش تھے۔ آخر میں بڑھتے بڑھتے یہ ۳۰ سو تک پہنچا تو سبھی انہوں نے کسی طعراق اور نمائش کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اس اثنا میں بڑے بڑے مشاہرے پر بارہے بلاؤ آئے۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ نے بلایا، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی نے اپنے یہاں آنے کی دعوت دی۔ لیکن اس مردِ خدا نے ایک درگزر و محکم گیر کے اصول پر عمل کرتے ہوئے اپنے استاد اور دادا استاد کی یادگار کو پیسے سے لگاتے رکھا، اور سب کو جواب دے دیا۔ ہر چہ اپنے آمدنی کا ایک حصہ اپنے اعزہ اور دوسرے متقی اصحاب کے لیے الگ کر دیتے تھے۔ ۱۹۶۹ء میں صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے عربی کی سند اعزاز ملی جس کے ساتھ تین ہزار سالانہ کا وظیفہ بھی ملتا ہے، تو اس کا بیشتر حصہ بھی اسی طرح تقسیم ہوتا رہا۔ ان کے والد بہت زرمی زمین چھوڑے تھے۔ شاہ صاحب مرحوم نے اپنے حصے کی زمین چھوڑے سجائی شاہ امام احمد کو ہبہ کر دی کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں اور تمہارے پاس کوئی اور ذریعہ معاش نہیں ہے۔ عمر کے ساتھ استغنا کا یہ رنگ اور گہرا ہو گیا تھا۔ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی (سہارنپور) امیر تبلیغی جماعت سے بیعت تھے اور اس جماعت کا جو رنگ ہے، اسے جاننے والے جانتے ہیں۔ دو مرتبہ (۱۹۶۹ء و ۱۹۷۳ء) حج بیت اللہ کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔

ان کی پہلی شادی رُذول کی مشہور شخصیت شاہ مصطفیٰ احمد کی چھوٹی صاحبزادی حضرت النسا بیگم سے (جو کسی زمانے میں جہوپال میں اکاؤنٹنٹ جنرل تھے) عنوانِ شباب میں ہو گئی تھی، لیکن جلد ہی یہ خاتون ایک لڑکا اپنی یادگار چھوڑ کر ۱۱ دسمبر ۱۹۲۵ء (۲۵ جمادی الاول ۱۳۴۴ھ) کو انہیں داغ مفارقت دے گئیں۔ چندے بعد دوسری شادی شیخ منظور الحق نعمانی کی صاحبزادی وحی النساء سے ہوئی۔ لیکن یہی حادثہ پھر پیش آیا۔ ان کا ۳۱ دسمبر ۱۹۳۶ء کو انتقال ہوا۔ گھر والوں نے بہت کوشش کی کہ وہ پھر تامل کا بچا کلمے میں ڈال لیں۔ اس وقت عمر یہی ۳۵ برس کی رہی ہوگی۔ لیکن اس اللہ کے ہنر نے کسی کی لالچ نہ سنی، اور پھر نکاح نہیں کیا۔ ان بیویوں سے دو بچے (ایک لڑکا اور ایک لڑکی) تھے۔ انہیں پالا پر سا اور پردان چڑھایا۔ لڑکا شاہ دودرا احمد اپنے بیوی بچوں کے ساتھ آج کل کراچی میں ہے، اور لڑکی دادھیالی نام، غوثیہ، ناسخیالی، خمر فاطمہ) اپنے گھر بار والی رُذول میں۔ اس کی شادی اپنے خاندان ہی میں ایک جوان صالح چودھری ادیس احمد سے کر دی تھی۔

صحت ہمیشہ ٹھیک رہی۔ ہاں کبھی کبھی تنفس کی شکایت کرتے تھے۔ ۱۹۷۲ء میں جب دارالمصنفین کا اجلاس بمبئی میں ہوا ہے، تو اچانک وہاں پہلی مرتبہ دل کی شکایت محسوس کی۔ لیکن اس پر کوئی تشویش نہیں ہوئی۔ آخری وقت بہت ہی دے پاؤں آیا۔ جمعہ کے دن ۱۳ دسمبر ۱۹۷۷ء کو حسبِ علوت تمام مولات سے فارغ ہوئے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد آنکھ لگ گئی۔ جاگے تو عمر کی نمائندگی سے رُذول کا پانی طلب کیا۔ کرسی سے اٹھنے لگے، تو گر گئے؛ اور پھر نہیں اٹھے۔ ڈاکٹر صاحب فوراً بلوائے گئے۔ انہوں نے دیکھ کر اعلان کیا کہ شاہ صاحب اپنے رفیقِ اعلیٰ کے حضور حاضر ہو چکے ہیں۔ (إِنَّا لِلّٰہِ وَإِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔

ان کی وصیت کے مطابق میت اگلے دن ان کے وطن راولپنڈی گئی اور وہاں  
 جو دھری خلیل احمد کی مسجد کے احاطے میں آخری خواجگاہ نصیب ہوئی۔  
 آسمان تربت پر قبری عنبر افشانی کسے۔

---

## شیر محمد اختر گجراتی

میرے بہتر اور دوست اور ہوطن تھے۔ یعنی وہ بھی گجرات (موجودہ پاکستان) کے رہنے والے تھے، اگرچہ ۱۹۰۷ء میں پیدا لاہور میں ہوئے جہاں ان کے والد میاں محمد یوسف غالباً اور ریسر تھے، اور سرگنگارام مرحوم (ف: جولائی ۱۹۲۷ء) کے دوستوں میں تھے۔ شیر محمد نے دسویں درجہ تک کی تعلیم زمینداری اسکول (موجودہ زمیندار کالج)، گجرات میں پائی۔ اس کے بعد انہوں نے پولیس ٹریننگ اسکول، پشاور میں داخلہ لے لیا، اور وہاں سے حریت کی تکمیل کے بعد پولیس کے محکمے میں بھرتی ہو گئے۔

لیکن ان کا مذاق ادبی، بلکہ تعلیمی تھا، پولیس کی نوکری جب تک چلتی! تین چار سال تو گھر والوں کے مجبور کرنے پر کسی نہ کسی طرح کالے؛ بالآخر ۱۹۳۳ء میں استعفیٰ دے دیا، اور سال بھر بعد لاہور چلے آئے۔

وہ عقیدے کے لحاظ سے جماعت احمدیہ کی لاہوری شاخ سے متعلق تھے۔ چنانچہ لاہور آنے پر وہ اس انجمن کے دونوں پرچوں، ہفتہ وار پیغام صلح (اردو) اور ہفتہ وار "لائٹ" (انگریزی) میں کام کرتے رہے۔ یہاں سے نکل کر کچھ دن تک ماہنامہ تہذیب نسواں کے ادارہ تحریر سے بھی رسمی طور پر وابستہ رہے۔ اسی زمانے میں انہوں نے ایک سلسلہ مضامین بچوں کی نفسیات پر قلمبند کیا تھا، جو بہت مقبول ہوا تھا۔

انہوں نے نفسیات کا مطالعہ بطور خاص کیا تھا۔ لاہور میں انہوں نے ایک ادارہ قائم کیا تھا، جہاں وہ نفسیات کے موضوع پر طلبہ کو تعلیم دیتے تھے۔ اردو میں اس مضمون کی نصابی کتابیں ہی کتنی ہیں؛ چنانچہ یہ کسی پورا کرنے کو انہوں نے ہی زمانے میں چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے، جنہیں وہ نفسیات کے طور پر استعمال کرتے تھے۔

لاہور کے مسلسل قیام سے وہ وہاں کے علمی اور ادبی حلقوں میں اچھے خاصے متعارف ہو گئے، اور ان کے احباب کا حلقہ بھی وسیع ہو گیا۔

ظلم و فسادوں میں درک تو حاصل تھا ہی، اب وہ رسالوں میں مضمون بھی لکھنے لگے۔ ان دنوں مولانا احسن اللہ خان تاجور خجیب آبادی کا ماہنامہ ”شاہکار“ بڑے شغف سے پھلتا تھا۔ آخر ایک دن اس کے دفتر گئے۔ مولانا تاجور صاحب بھرتے ہوئے ادیبوں کی حوصلہ افزائی کرنے اور انہیں آگے بڑھانے میں بڑی متشہق محسوس کرتے تھے۔ انہوں نے آخر کی صلاحیتوں کا اندازہ کر کے انہیں ”شاہکار“ کا نائب مدیر مقرر کر دیا۔ مولانا تاجور کا جب جنوری ۱۹۵۱ء میں انتقال ہو گیا، اور شاہکار بھی بند ہو گیا، تو اس کے بعد اختر پنجاب کے مشہور ماہنامے ”ہمایون“ کے ادارے سے منسلک ہو گئے۔ یہاں وہ ۱۹۴۸ء تک رہے۔

اس دوران میں بھی ان کا مددِ نفسیات بدستور جاری رہا۔ ۱۹۴۴ء میں انہوں نے اس موضوع پر اپنے دو ماہانہ رسالے شروع کیے: (۱) ”نفسیات“ اور (۲) ”نفسیاتِ جہانزے“ یہ دونوں پرچے مدتوں باقاعدگی سے چھپتے رہے۔ اب ان کی ادبی حیثیت مسلم ہو چکی تھی۔ ۱۹۴۸ء میں وہ ہفتہ وار ”قدیل“ (لاہور) کے مدیر مقرر ہو گئے۔ اور ۱۹۷۰ء تک اس رسالے کو مرتب کرتے رہے۔ اس میں وہ ہر ہفتے ”میں دیکھتا چلا گیا“ کے عنوان سے ایک کالم ”تماشا“ کی تہ علمی نام سے لکھتے تھے۔ یہ سب حلقوں میں بہت مقبول ہوا۔ اس میں لاہور

اور صوبے کی ہفتے بھر کی ادبی، سماجی، سیاسی سرگرمیوں پر لکے پھلے انداز میں تبصرہ کرتے۔ ان کی زبان سلیس، سادہ اور بڑی جاندار تھی۔ مولوی عبدالحق مرحوم تنگ آن کی زبان کے معترف اور مداح تھے۔

وہ حلقہ ابابہ ذوق اور رائٹر گگڈ کے بنیادی اراکین میں سے تھے، اور حلقے کے جلسوں میں خاص طور پر مستعدی سے شریک ہوتے تھے۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ حلقے میں حاضری دیے والے اور بورڈ کا کلام نظم و نثر انہیں بآسانی "تندیل" میں اشاعت کے مل جاتا۔ یہ اس جہد کے میسر قابل ذکر ادیبوں کے مضامین اور منظومات تندیل میں چھپتی رہیں اور پچے کا معیار اپنے معاصرین کے مقابلے میں بہت بلند ہو گیا۔ وہ اپنے مستقل کام (میں دیکھتا چلا گیا) کے علاوہ بھی انسانے، ڈرامے اور مضامین لکھتے رہتے تھے۔ ان کی تقریریں ریڈیو سے بھی نشر ہوتی رہتی تھیں۔

۱۹۷۱ء میں ان پر پہلی مرتبہ تاج کا شدید حملہ ہوا، اور وہ بہت دن تک نقل و حرکت سے معذور رہے۔ بارے، باقاعدہ علاج سے کچھ چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے، لیکن اس سے کمزوری اتنی ہو گئی کہ پھر انہیں کامل صحت کا ایک دن بھی دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو اواخر میں ان پر پھر فالج گرا۔ اب کے علاج کے لیے یونائیٹڈ کرسچین اسپتال چلے گئے۔ دو مہینے بعد وہیں اسپتال میں ۳۰ دسمبر ۱۹۷۳ء کو علی الصبح رگڑا عالم جاودانی ہو گئے۔ جنازہ اسی دن اسٹا اور قریستان میانی صاحب میں سپرد خاک ہوئے۔ "وَاللّٰهُمَّ اِنَّا اَلَيْهِ رَاجِعُونَ"۔ یہ وہ کے علاوہ دو بیٹے اور چھ بیٹیاں اب سوگواروں میں چھوڑے۔

مرحوم اپنی سخن فنی اور بذلہ سخی، سچرپی اور وضعداری کے لیے مشہور تھے جن تمام میں تندیل کے مدیر تھے، کئی جگہ سے زیادہ تنخواہ پر ملازمت کی پیشکش ہوئی، لیکن انہوں نے ہمیشہ انکار کیا۔ پروفیسر محمد سرور (جامعی) جنہوں نے



مولانا عبید اللہ سندھی پر خاصا کام کیا ہے، اختر مرحوم کے ماموں ہیں۔ محمد سرور صاحب نے کسی زمانے میں حیدر نظامی مرحوم کے ”نوائے وقت“ کے جواب میں اپنا روزنامہ ”آفاق“ جاری کیا تھا۔ انھوں نے معقول تنخواہ پر اختر کو بھی اس کے ادارہ تحریر میں شمولیت کی دعوت دی۔ محمد سرور صاحب نے خیال کیا کہ اختر میرا سہارا ہے اور تنخواہ سبھی معقول، سبھلا سے قبول کرنے میں کیا عذر ہوگا! لیکن انھیں بھی مایوسی ہوئی۔ اختر نے اپنی وضع داری بنا ہی اور ”من لبستم خائے قفاست پائے خولش“ کہتے ہوئے قندیل میں جے رہے۔

ایک اور بات! اختر ان کا تخلص نہیں تھا، نہ وہ شعر کہتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی نے پوچھا: اختر صاحب! آپ شعر نہیں کہتے تو نام کے ساتھ یہ تخلص کیوں لگا رکھا ہے؟ کہنے لگے: اختر تخلص نہیں ہے، بلکہ سید اقیار علی تاج قسم کی چیز ہے، انھوں نے بھی تو کبھی شعر نہیں کہا۔ بات واصل یہ ہے کہ شیر محمد قسم کے نام کچھ نوجوی اور جنگجو حضرات ہی کو زیب دیتے ہیں۔ میں نے التباس سے بچنے کی خاطر اپنے نام کے ساتھ اختر کا اضافہ کر لیا؟

انھوں نے کوئی پچاس کے قریب کتابیں چھوڑی ہیں۔ ان میں نفسیاتی موضوعات ہیں ترجمہ ہیں، افسانے ہیں، ڈرامے (اردو اور پنجابی) ہیں، تاریخی اسلام ہے۔ لیکن ادیب اور مصنف سے بھی وہ بلند تر انسان تھے۔ با اصول، مرعجان مرنج، دوستوں کے ہمدرد اور کنبہ پرورد۔ دعا ہے کہ خداوند تعالیٰ ان سے عفو و کرم کا سکہ کرے! آمین!

## چغتائی، عبدالرحمن (خان بہادر)

کون ہے جس نے جامع مسجد اور لال قلعہ یا تاج محل، آگرہ کا نام نہ سنا ہوگا! لیکن یہ کم نگوں کو معلوم ہوگا کہ ان عالیشان اور شہرہ آفاق عمارتوں کے نقشے لاہور کے دو فنکاروں کے تیار کیے تھے، ان کے نام تھے: احمد اور حامد۔ یہ دونوں لگے بجاتی تھے۔ عہد شاہجہانی کے موزخوں نے ان کے نام استاد العصر احمد اور ناو العصر حامد لکھے ہیں۔ ان کے نام سے مشہور موزچہ استاد احمد آج بھی ان کی یاد دلا رہے ہیں۔ فن عمارت اس خاندان میں نسلاً بعد نسل قائم رہا۔ مہاراجا رنجیت سنگھ کے میر عمارت بابا احمد والدین چغتائی خاندان کے نام یوں تھے۔ ان کے بیٹے میاں کریم بخش تھے اور میاں کریم بخش کے میاں کریم بخش چغتائی۔ یہ دونوں باپ بیٹے بھی میر عمارت اور معمار تھے۔ یہاں کریم بخش کا ۱۹۱۳ء میں انتقال ہوا۔ ۶۰ سال سے نیا فخر پاتی۔

یہاں کریم بخش چغتائی کے عین بیٹے، عبدالرحمن، عبداللہ اور عبدالرحیم ہوتے۔ یہی عبدالرحمن، ہمارے مشہور مصور اور فنکار عبدالرحمن چغتائی ہیں، جن کا ۱۹۷۵ء کو لاہور میں انتقال ہوا۔ عبداللہ علمی حلقوں میں ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی کے نام سے معروف ہیں، اور ان کا نام سوانح اقبال میں متعدد مقام پر آتا ہے۔ انھوں نے سوہیون یونیورسٹی (پیرس) سے تاج محل کے موضوع پر اپنے مقالے سے ڈاکٹریٹ کی سند لی تھی۔ عبدالرحیم سب سے

چھوٹے میں۔ انھوں سے ساری عمر بڑے سجاتی عبدالرحمن چغتائی کی معیت اور خدمت میں گزاری۔

عبدالرحمن چغتائی لاہور میں ۱۲ ستمبر ۱۸۹۹ء کو پیدا ہوئے۔ ان کی اسم اللہ مسجد میں پڑتی۔ یہاں انھوں نے قرآن ناظرہ ختم کیا۔ بعض سواریں جو انھیں آخر تک حفظ تھیں، وہ اسی ابتدائی تعلیم کا نتیجہ تھا۔ مسجد کی یکمبتی تعلیم کے ساتھ ہی ان کے والد نے انھیں اپنے بہنوئی میاں میران بخش نقاش (بن بابا عمر الدین نقاش) سے نقاشی اور مصوری کے اسباق ایسے ہی ہدایت کی تھی۔ میاں میران بخش نقاش اپنے فن کے ماہر اور اس حیثیت سے سرکاری حلقوں میں بھی معروف تھے۔ حکومت نے ان کی عظمت فن کے اعتراف میں انھیں مسجد وزیرخان (لاہور) میں ٹجرے عطا کیے تھے۔ اس زمانے میں یہ ٹجرے مصوروں، نقاشوں، خطاطوں کو حکومت کی طرف سے اعزاز و کرامت کے طور پر دیے جاتے تھے۔ بابا میران بخش نے بہرہ ۱۱۵۵ سال ۱۹۲۰ء میں وفات پائی۔ وہ لاہور کے قبرستان بنی بی پارک دامن میں دفن ہوئے۔ عبدالرحمن چغتائی میواکول جانے تک ان سے مستفیض ہوتے رہے تھے۔

مسجد سے فارغ ہو کر ان کا ریلوے ٹکنیکل اسکول، لاہور میں داخلہ ہوا۔ چھٹے درجے کے بعد تعلیم کا یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ چندے پننگ بازی اور آواہ گرو کی کرنے کے بعد انھوں نے پھر اسی اسکول سے ۱۹۱۱ء میں پرائیوٹ طور پر مڈل (آٹھویں درجے) کا امتحان پاس کیا۔

خاندانی روایت کے پیش نظر فن اور آرٹ ان کے خون میں تھے۔ مڈل اسکول امتحان کے بعد انھوں نے خود بخود میواکول آف آرٹ، لاہور میں داخلہ لیا۔ اس زمانے میں یہاں ڈرائنگ، نقاش سازی (ڈرافٹ مین) ٹولہری درکڑی کے کام کی تعلیم کا خاصا انتظام تھا۔ عبدالرحمن چغتائی آخری درجے کے امتحان (۱۹۱۳ء) میں صوبہ میں اول آئے تھے۔

میں اسکول کے امتحان میں کامیابی کے بعد اولاً اسخوں نے کراچین ہائی اسکول گوجرانوالہ میں ڈرائنگ ماسٹر کی نوکری اختیار کر لی۔ لیکن یہاں ان کا دل نہیں لگا۔ گوجرانوالہ میں وہ صرف چند مہینے رہے، اور اعلیٰ داخلہ کر کے واپس لاہور چلے آئے۔ ان کی مادری علمی ذہنی اسکول میں نے محسوس کیا کہ ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانا چاہیے، چنانچہ اسکول میں نوٹولیتھوگرافی کا درجہ کھولا گیا جس کے انچارج چغتائی صاحب مقرر ہوئے۔ وہ اس عہدے پر ۱۹۲۲ء تک رہے اور پھر مستعفی ہو گئے اس کے بعد عمر سبیر کہیں ملازمت نہیں کی۔

یہ بیاں میرا بخش نقاش کی تربیت ہی کا اثر تھا کہ اسخوں نے مضمون شباب میں مصوری شروع کر دی۔ چنانچہ پنجاب فائن آرٹس سوسائٹی، لاہور کی نمائش منعقدہ ۱۹۱۹ء میں چغتائی کی آب رنگی تصاویر کا بھی سراغ مل سکتا ہے لیکن ابھی تک ان کی مصوری کی شہرت ان کے احباب ہی تک محدود تھی، اور عوام سے متعارف نہیں ہوئے تھے۔ ان کی شہرت کے عام کرنے میں پروفیسر ڈاکٹر محمد دین تاثیر (ف۔ نومبر ۱۹۵۸ء) اور ماہنامہ نیرنگ خیال کا بہت ہاتھ ہے۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ نیرنگ خیال کے شروع کرنے والے ہی تاثیر اور چغتائی تھے۔ اس کی داغ بیل تاثیر کے مکان ہی پر پڑی، اور اسخوں نے حکیم یوسف حسن کو یہ پرچہ جاری کرنے کا مشورہ دیا، چونکہ ان کے پاس سرمایہ تھا، جسے وہ اس کے اخراجات کے لیے لگا سکتے تھے۔ ہاں، بعد کو دوسرے احباب ریناز منڈل، الامجد سے بھی مشورہ کیا گیا تھا اور سب نے دستِ ثناء و بڑھانے کا وعدہ کیا۔ نیرنگ خیال وسط ۱۹۲۳ء میں جاری ہوا اور اس کے پہلے ہی شمارے میں چغتائی کی بنائی ہوئی ایک تصویر شامل تھی۔ اس کے بعد بھی وہ باقاعدگی سے اپنی تخلیقات نیرنگ خیال میں شائع کرتے رہے۔ غرض کہ یہ حقیقت ہے کہ اگرچہ چغتائی پہا سے مصوری کر رہے تھے، لیکن وہ عوام سے نیرنگ خیال ہی کے ذریعے سے متعارف ہوئے۔ تاثیر نے ان کے فن اور تکنیک کے بارے میں اور ان کی

خوبیوں اور خصوصیتوں کی وضاحت کے لیے متعدد مضامین لکھے۔ یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ تائیر نے محض چغتائی کے آرٹ پر لکھنے اور اس کی باریکیوں کو اجاگر کرنے کی خاطر یورپ کے بڑے بڑے مصوروں اور فنون لطیفہ کے ماہروں کی تخلیقات اور تصنیفات کا غائر مطالعہ کیا تھا، تاکہ وہ چغتائی کے فن پر کما حقہ لکھ سکیں اور دوسرے عالمی مصوروں کے ساتھ ان کا مقابلہ کر کے ان کے ماہرہ الامتیاز پہلو دکھا سکیں۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگرچہ چغتائی نے اصول کی حد تک تو اپنے بزرگ میاں میران بخش سے ضرور استفادہ کیا، لیکن اس کے بعد اس میدان میں انھوں نے جو فتوحات حاصل کیں اور دنیا کے تصویر و فن کے خزانے میں جو جڑیں بھاغنا ڈکيا، وہ سراسر ان کا ذاتی کامنامہ اور ان کے اپنے زور بازو کا ثمرہ تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے محسوس کیا کہ جب تک میں عالمی شاہکاروں کا قریبی اور غائر مطالعہ، اور معاصر مصوروں اور فنکاروں اور نقادوں سے بالمشافہہ تبادلہ خیال نہیں کرتا، میرے فن میں وسعت اور عالمگیریت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اسی مقصد کے لیے انھوں نے ۱۹۲۱ء اور ۱۹۳۷ء میں دو مرتبہ یورپ کا سفر کیا۔ پہلے سفر میں ان کے چھوٹے بھائی محمد علی اللہ چغتائی بھی ان کے ساتھ گئے تھے۔ اسی زمانے میں علامہ اقبال بھی گول میز کانفرنس کے سلسلے میں لندن میں مقیم تھے۔ اقبال نے اپنے مشوروں سے مستفیض کیا اور مختلف اکابر سے ان کی ملاقات میں سبھی راہنمائی کی۔

ان سفروں میں انھوں نے یورپ کے تمام بڑے بڑے شہروں اور وہاں کے عجائب گھروں اور تصویر خانوں کی سیر کی اور ان کے بہتموں سے ملے نیز مختلف مقامات کے وہ حسین مناظر منظر غائر دیکھے جو اکثر مصور اپنی تخلیق کے لیے پس منظر کے طور پر استعمال کرتے رہے ہیں۔ انھیں سفروں میں وہ یورپ کے مشاہیر علم و فن اور مقدّم مصوروں سے بھی ملے۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ

ان سفروں اور ملاقاتوں کا ان کے فن کی بالیدگی اور پختگی، اور شخصیت کی تشکیل اور رچاؤ میں کتنا ہاتھ رہا ہوگا۔

یورپ سے واپسی کے بعد انھوں نے اپنے فن میں تانے کی پلیٹ پر لوہے کے قلم سے تصویر بنانے (یعنی ریتنگ (Etching) کا اضافہ کیا۔ اب تک ان کی توجہ زیادہ تر خطوط پر مبدول رہی تھی۔ یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ محض خطوط کے پیچ و خم سے جیتی جاگتی تصویر بنا دینے میں ان کا کوئی حریف نہیں اور اس کا راز ان کی ڈرائنگ کے فن پر غیر معمولی قدرت میں پوشیدہ ہے۔ یہی کام انھوں نے ریتنگ سے لیا۔ یاد رہے کہ ان سے قبل کسی ہندوستانی مصور نے فن کی اس شاخ کا ایسا سحر پور نمونہ پیش نہیں کیا تھا! اس کا سہرا صیح جنوں میں چغتائی کے سر ہے۔

اب ان کا سجا طور پر ہندوستان کے صفا اول کے مصوروں اور فنکاروں میں شمار ہونے لگا۔ ۱۹۳۴ء میں حکومت وقت نے ان کی خدمات کا اعتراف ”خان بہادر“ کے خطاب سے کیا۔ یہاں غائباً ایک بات کا ذکر کیل نہیں ہوگا۔ انگریزی جہد میں یہ خطاب بالکل سیاسی نوعیت کے تھے۔ اور بالعموم حکومت کے چیلے چانٹوں اور جی حضوریوں تک محدود (”خان صاحب“ الٰہیہ ایک آدھ مرتبہ غیر سیاسی اور علمی واڈ) افراد کے حصے میں بھی آچکا ہے۔ لیکن چغتائی کو یہ خطاب محض اپنی فنی اور ادبی خدمات کی وجہ سے ملا۔ ان سے پہلے جن چند غیر سیاسی اشخاص کو اس طرح کا خطاب ملا تھا، ان میں علامہ اقبال اور رامند ناتھ ٹیگور کے نام نمایاں ہیں۔

پاکستان کے وجود میں آ جانے کے بعد ۱۹۴۰ء میں وہاں کی حکومت نے انھیں ”ہلال امتیاز“ کے اعزاز سے نوازا۔ ۱۹۴۴ء میں مغربی جرمنی کے سابق صدر ڈاکٹر ہرک ہیک پاکستان کے دورے پر آئے تھے۔ انھوں نے چغتائی سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ لہذا اگلے دن جب مصوف علامہ اقبال کا قرار دیکھے گئے،

تھان کی خواہش کے مطابق وہاں ان سے چغتائی کا تعارف کرایا گیا۔ ڈاکٹر بیک، چغتائی کے فن کے بڑے مداح تھے چنانچہ انھوں نے خاص طور پر اپنے وزیر وائٹرشیل کو (جو بعد کو صدر مغربی جرمنی بنے) چغتائی کے مسکن (راوی روڈ) پر ان کی خدمت میں سونے کا تمغہ پیش کرنے کو بھیجا، جو گویا مغربی جرمنی کی طرف سے ان کی فنی میدان میں خدمات کا اعتراف تھا۔

ان کی چھ کتابیں فن اور تصویر کے موضوع پر شائع ہوئی ہیں۔ سب سے پہلے ۱۹۲۸ میں مرتب چغتائی "مقدمہ" شہود پر آئی، جس میں غالب کے کلام کو تصویر کے پیکر میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ان کی شہرت کا سنگ بنیاد ثابت ہوئی۔ اس کا مقدمہ علامہ اقبال نے لکھا تھا۔ اس میں ۲۴ رنگین اور دس سادہ تصویریں ہیں۔ اس کا ایک خاص ایڈیشن شائع ہوا تھا۔ اس کی قیمت ۱۲۵ روپے فی نسخہ تھی اور ایک عام جو سترو روپے میں بچا تھا۔ دونوں میں کاغذ کے تفاوت کے علاوہ اور کوئی فرق نہیں تھا۔ اس سلسلے میں لطیف یہ ہے کہ اعلان کیا گیا تھا کہ اعلیٰ ایڈیشن جرمنی میں چھپا ہے، حال آں کہ یہ لاہور ہی میں چغتائی صاحب کے مکان (واقعہ کوچہ چاکب سواراں، لاہور) میں خاص مشین سے طبع ہوا تھا۔ اس کی دیدہ زیب کتابت اور اعلیٰ معیار طبعیت اور تجمید وغیرہ سے سب لوگ دھوکا کھا گئے۔ اس کام میں ان کے سب سے پوٹے سجاتی عبدالرحیم چغتائی ان کے دست راست اور ہر طرح مدد و معاون رہے۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ عبدالرحیم صاحب نے اپنی پوری زندگی بڑے سجاتی کی خدمت کے لیے وقف کر دی۔ عبدالرحمن چغتائی کو اپنے تخلیقی کام کے سواے اور کسی کام سے کام نہیں تھا۔ اس کے بعد تصاویر پر چرچے لگوانا، انھیں نمائشوں میں بھیجنا اور واپس منگوانا ہنر ہوں کا شائع کرنا، ان کی تقسیم اور نکاسی کی نگرانی — غرض سب کام عبدالرحیم صاحب کی نگرانی میں ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ گھر بار کے سب اخراجات بھی انھیں کے ہاتھوں

سریجام ہوتے تھے۔

ترقیہ چنتائی کے سلسلے میں ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے جب یہ کتاب شائع ہوئی، تو اس کی تمام اصلی تصاویر سر اکر حیدری نے نظام پبلش ویدز آباد ہاؤس) نئی دہلی میں لگانے کے لیے لے لی تھیں، لیکن جب شہزادی دروانہ (نظام عثمان علی خان مرحوم کی بڑی بہو اور نواب اعظم جاہ ولی عہد کی بیگم) نے انھیں دیکھا، تو فرمایا کہ تصاویر نئی دہلی نہ بھیجی جائیں، میں اسٹیشن پرے محل میں دنگا ڈیجی۔ خدا معلوم، اب وہ کہاں ہیں!

نقش چنتائی، ان کا دوسرا کارنامہ تھا۔ یہ کتاب ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔ اس میں غالب کے کچھ اور اشعار کو مصوّر کیا گیا ہے۔ یہ بھی بڑے اہتمام سے نکلی، انجزم کی نمکدار جلد اور بڑھیا کاغذ، ہر صفحے کی جدول کی تزئین اور دو رنگی چھپائی۔ اس میں کل ۱۹ تصویریں ہیں جن میں سے صرف ایک رنگین ہے، بقیہ سب سادہ، سپید و سیاہ ہیں۔

اسی نقش چنتائی کا دوسرا ایڈیشن (نقش ثانی) غالباً ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔ (تاریخ درج نہیں) یہ پہلے ایڈیشن سے بہت مختلف ہے تصویروں میں بھی تغاوت ہے اور ان کی تعداد میں کمی۔ اس میں چھ رنگین تصویریں ہیں اور سولہ سادہ، سپید و سیاہ۔ اسی دوسرے ایڈیشن کا جو پہوچرہ تیسری مرتبہ ۱۹۶۵ء میں چھپا۔

اس کے بعد ان کی یہ کتابیں شائع ہوئیں:

- ۱۔ تصاویر چنتائی: ۱۹۳۶ء
- ۲۔ ہندی تصاویر چنتائی: ۱۹۵۲ء (اس کا ایک مختصر ایڈیشن بہت پہلے دہلی کی ایک فرم نے شائع کیا تھا)۔
- ۳۔ عمل چنتائی: ۱۹۶۸ء
- ۴۔ تیمور کا گھراٹا: ۱۹۷۲ء



عمل چنتائی میں کلام اقبال کو مصور کیا ہے جس طرح پہلی روکتا میں مصور کلام غالب ہے۔ کلام اقبال کو مصور کرنے کی خواہش خود علامہ انصاری نے سر صبح چنتائی کی اشاعت کے بعد ظاہر کی تھی۔ چنتائی نے بم ۱۹۶۱ء میں اس پر کام شروع کیا تھا، اس کی تکمیل کہیں ۲۵ برس بعد ہوتی۔ یہ بڑے سائز (۱۶ x ۱۲) کے ۴۵۰ صفحات کی کتاب ہے؛ اس میں ۴۴ چار رنگی تصاویر ہیں اور ۲۴ رنگی؛ شروع میں حبش مرشد الرحمن کا دیباچہ ہے۔ کتاب بہت اہتمام سے شائع ہوتی ہے اور ہر طرح سے اقبال اور چنتائی دونوں کے شایان شان ہے۔ مرحوم کہتے تھے کہ اس کی تیاری اور طباعت پر میرا تین لاکھ روپیہ صرف ہوا ہے۔ ابتداء میں اس کا ۲۷۵ جلدوں کا ایک خاص ایڈیشن بھی شائع ہوا تھا جس کی قیمت پندرہ سو روپیہ فی نسخہ تھی۔ اس کا اجراء سابق صدر پاکستان فیضان مارشل محمد ایوب خان کے ہاتھوں لاہور آرٹ کونسل میں ہوا تھا اور حکومت پاکستان نے اس خدمت کے احترام میں چنتائی مرحوم کو دو لاکھ روپے کا انعام عطا کیا تھا۔

مندرجہ ذیل کتابیں غیر مطبوعہ رہ گئیں :

- ۱۔ **عمر خیام** (مصور) : اس پر انھوں نے ۳۰-۴۰ برس کام کیا تھا لیکن مکمل ہو چکی تھی۔ اس میں کوئی ۲۰-۳۰ تصویروں ہیں۔ تمام تصویروں کی نوعیت اور بلاک وغیرہ بن چکے تھے اور وہ اسے شائع کرنے کا انتظام کر رہے تھے کہ موت کا بلاوا آگیا۔ خدا معلوم، اب اس کی اشاعت کا کیا انتظام ہوگا؟ چنتائی مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ یہ کتاب اس قرض کی ادائیگی ہے جو مغرب عمر خیام کی قلم و منزلت کر کے اور اس کے متعدد مصور ایڈیشن شائع کر کے ہم اہل شرق سے وصول کرنے کا حقدار ہے۔

- ۲۔ **چنتائی آرٹ** : یہ کتاب تقسیم ملک سے قبل زیر طباعت تھی کہ منسلکات کے باعث کام درمیان میں رہ گیا۔ اس کے بعد وہ عمل چنتائی کی تکمیل میں

لگ گئے احمد اس پر توجہ نہ دے سکے۔ بہر حال اس کا پورا سامان موجود ہے۔  
۲۔ کارچنتائی: یہ دراصل غالب کے سلسلے کی تیسری کتاب ہے یعنی مرقع چنتائی اور نقش چنتائی کے بعد انھوں نے غالب کے جن مزید اشعار کو صورت کیا تھا۔ یہ ان کا مجموعہ ہے۔ اس میں ۳۰-۴۰ نئی تصویریں ہیں۔ یہ کتاب بھی تقسیم ملک کے وقت زیر طبع تھی۔ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ہر ایک تصویر کے ساتھ اردو میں کچھ اشارے لکھے ہیں۔ عمل چنتائی میں بھی ہر ایک تصویر کے ساتھ تقریباً دو دو صفحوں کے اشارات ہیں یہ سب محروم کے اپنے لکھے ہوئے ہیں۔

۳۔ اڈولڈ آرٹ میں چنتائی کا حصہ (انگریزی)

۵۔ چنتائی اور اس کے نقاد ( )

۶۔ نمائندت ( )

۷۔ چنتائی کی عریاں تصویریں (NUDES) ( )

وہ اردو میں انسانہ بھی لکھتے تھے، اور نئی موضوعات پر مضامین بھی لکھتے تھے۔ ۱۹۱۷ء میں ان کے انسانوں کے دو مجموعے ”کاجل“ اور ”لگان“ شائع ہوئے تھے۔ اپنی وفات سے پہلے ایک اور مجموعہ ”سنانوں“ کے عنوان سے مرتب کیا تھا۔ اس میں تین طویل افسانے ہیں: (۱) ستاون (۲) پانچن (۳) لندن سے ایک خط۔ ستاون میں دوسری جنگ عظیم کے اس زمانے کی داستان ہے، جب حسن اتفاق سے اردو کے بعض مشہور ادیب (ناثر، حمید ملک، پطرس بخاری وغیرہ) دلی میں جمع ہو گئے تھے۔ پانچن کشمیر سے متعلق ہے۔ ۱۹۲۹ء کے موسم گرما میں وہ کشمیر گئے تھے۔ اس افسانے میں اسی زمانے کے تاثرات ظہور کیاے ہیں۔ تیسرا افسانہ ظاہر ہے کہ سفر لندن کی یادگار ہے۔ سنا ہے کہ ان کے غیر مطبوعہ افسانوں کی کئی خاصی بڑی تعداد موجود ہے۔

انھوں نے اپنے حقوق سے مختلف مالک کے مشہور مصوروں کی تخلیقات کا اچھا

خاصاً ذمیرہ جمع کیا تھا۔ آرٹ سے متعلق مطبوعہ کتابیں بھی بہت تھیں۔ غرضی کا مقام ہے کہ انکی وفات کے بعد حکومت پاکستان کی سرپرستی میں چغتائی مجاہد گھر قائم کر دیا گیا ہے، جس میں ان کی سب چیزیں محفوظ ہو گئی ہیں۔ وہ خود بھی یہی جانتے تھے! اس طرح ان کی وصیت بھی پوری ہو گئی۔

وہ شخصی زندگی میں بہت سادہ تھے۔ دن رات اپنے فن کی دھن میں رہتے تھر سے بھی کم رکھتے تھے۔ کسی قسم کی ملت نہیں تھی! نہ سگریٹ پیتے تھے، نہ شراب، حال اُن کہ ان کے بیشتر دوست اور ملنے والے سگریٹ پیتے تھے اور ان میں سے کئی فنکار قسم کے حضرات تو شراب کے بھی رہا تھے۔ چغتائی صاحب تاش کے پتوں تک کو نہیں پہچانتے تھے۔ مصوری کے علاوہ ان کا دوسرا سب سے بڑا شوق پتنگ بازی تھا۔ اپنے پتنگ خود ہی بناتے تھے۔ ان کی ساخت اور شکل صورت میں طرح طرح کی اختراعات کی تھیں جو ان میں کھیل کو دکھاؤتی بھی ہاں، بلکہ شروع میں تو اسی کثرت کے واسطے چندے تعلیم کا سلسلہ ہی ٹوٹ گیا تھا۔ کرکٹ اہل وقت کا شاذ نہ بھلی کا شکار ان کے دل پسند مشغلے تھے۔ کرکٹ میں گیند اتنی تیزی اور قوت سے پھینکتے تھے کہ وکٹ لکڑے ٹکڑے ہو جاتی تھی تیراک بھی اچھے تھے۔

بزرگ جمعہ ۱۷ جنوری ۱۹۷۵ء کو اپنے خالق کے حضور حاضر ہو گئے۔ جنازہ اگلے دن اسٹا اور اسٹین امانتاً اپنے بزرگوں کے نزدیک لاہور کے مشہور قبرستان بیانی صاحب میں سپرد خاک کیا گیا۔ ان کے اعزاء چاہتے ہیں کہ انھیں ایک خاص مقبرے میں دفن کیا جائے۔ اسی لیے جب تک اس کے انتظامات مکمل نہ ہو جائیں، فی الحال انھیں میانی صاحب میں امانتاً دفنایا گیا ہے۔ بلکہ خود ان کی خواہش تو یہ تھی کہ چغتائی مجاہد گھر ہی میں ان کا مدفن بھی بنے۔ اِنا للہ وَاِنا الَیْہِ راجِعُونَ۔

انھوں نے اپنی زندگی میں دو نکاح کیے پہلی بیوی ( وزیر النساء بیگم ) اپنے خاندان ہی سے تھیں۔ ان کے والد کا نام میاں محمد بخش چغتائی تھا۔ اس بیوی سے کوئی

اولاد نہیں ہوتی، ان کا ۲۳ مارچ ۱۹۶۶ء کو انتقال ہوا۔ دوسرا نکاح انہوں نے ۱۲ دسمبر ۱۹۶۳ء کو کیا تھا۔ یہ دیکھ کر کٹھنر بائرم اور سر کے ایک کشمیری خاندان سے ہیں۔ ان کے بطن سے دو بچے ہوئے۔ بڑی بیٹی (مسٹر) نے فلاسفی میں ایم اے کیا اور پنجاب سبھ میں اول رہیں۔ وہ شادی شدہ اور اپنے گھر بار والی ہیں۔ ان سے چھوٹا ایک بیٹا عارف الرحمن چغتائی (ولادت: ۲۰ اگست ۱۹۴۹ء) ہے۔ عارف میاں نے بزنس ایڈمنسٹریشن میں ایم اے تک تعلیم پائی ہے۔ وہ انگریزی میں شاعری بھی کرتے ہیں اور ان کے دو مختصر مجموعے شائع کر چکے ہیں۔

## دیوان سنگھ مفتون، سردار

پنجاب (پاکستان) کے ضلع گوجرانوالہ میں ایک خاصا بڑا قبیلہ حافظ آباد ہے۔ یہ تحصیل کا صدر مقام بھی ہے تقسیم ملک (۱۹۴۷ء) تک بکھتری قوم کی کھتہ براوری کا یہاں کے عائد میں شمار ہوتا تھا۔ اسی برادری کے ایک کچھ گھرانے کے ایک فرد ڈاکٹر ندھان سنگھ تھے۔ وہ سرکاری ملازمت میں تھے اور ڈاکٹر کی حیثیت سے پنجاب کے مختلف مقامات (میاں والی، جہلم وغیرہ) میں تعینات رہے تھے۔ جب وہ جہلم کے سرکاری اسپتال کے انچارج تھے، تو یہاں ۳۱ اگست ۱۸۹۰ء کو ان کے گھر دو مولڑ کا (اودھو سٹا بچہ) پیدا ہوا۔ اس سے پہلے ان کی اولاد میں دو لڑکیاں اور ایک لڑکا کرتار سنگھ موجود تھے۔ اس نومولود کا نام انھوں نے دیوان سنگھ رکھا۔ یہی بچہ آٹھ چل کر سردار دیوان سنگھ مفتون، ایڈیٹر سیاست ہوا! اور اس نے تاریخ صحافتِ اُردو میں لافانی مقام حاصل کیا۔

دیوان سنگھ مفتون صرف ۳۰ دن کے تھے کہ ان کے والد ڈاکٹر ندھان سنگھ کا جہلم ہی میں انتقال ہو گیا۔ گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی، خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ ڈاکٹر ندھان سنگھ نے اپنی طویل ملازمت کے دوران میں بہت کچھ کمایا اور پس انداز کیا تھا۔ اس کے علاوہ غیر منقولہ جاوا د بھی کم نہیں تھی۔ اگر حالات معمول کے موافق رہتے، تو ان کے پسماندگان کو کسی قسم کی تکلیف نہیں چوتی چاہیے تھی۔ لیکن ہندو سماج میں (اور وہ بھی آج سے ایک صدی قبل کے سماج میں) بیدہ کی حالت بہت

نقد تھی۔ رشتے داماد عزیز قریب اس غریب کے اور اس کے تیم بے سہارا بچوں کے سر پر ہاتھ رکھنا اور ان کی حمایت کرنا تو درکنار اس سماں میں رہنے کو جو کچھ ان کے پاس ہے، اسے سبھی بتیا لیں۔ ڈاکٹر ندھان سنگھ کی وفات کے وقت بڑی لڑکی ۱۸ برس کی تھیں، کرتا سنگھ دس برس کے تھے۔ اور ان سے چھوٹی (دوسری) لڑکی پانچ برس کی تھی۔ اور دیوان سنگھ تو جیسا کہ ابھی ذکر ہوا، صرف ہم دن ہی کے تھے۔ ایسے میں ظاہر ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی بیوہ بالکل بے بار و بارگاہ رہ گئی تھیں۔ اراٹنی اور مکانات پر مرحوم کے ایک بھائی نے قبضہ کر لیا اور ان بچوں کے جوان ہونے پر بھی یہ جاداد واپس دینے سے انکار کر دیا۔ گھر میں جو انداز تھا، وہ آہستہ آہستہ بچوں کی پرورش اور دولڑکیوں اور بڑے بیٹے کی شادی کے مصارف میں ختم ہو گیا۔ جب نقد اور زیورات ٹھکانے لگ گئے، تو ناخالصیت تک فروخت کرنے کی نوبت آئی۔ قصہ کوتاہ، جب دیوان سنگھ کی دس بارہ برس کی عمر ہوئی ہے تو افلاس اور ادب بار نے گھر میں ڈیرا ڈال رکھا تھا۔

ایسے حالات میں بالعموم سب سے چھوٹا بچہ سب سے زیادہ ٹھکانے میں رہتا ہے، اس کی تعلیم و تربیت نہیں ہو سکتی۔ یہاں بھی یہی ہوا۔ دیوان سنگھ ششم پشتیم پانچویں تک تو بڑھ سکے، اس کے بعد ان کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ گھر میں روزمرہ کے اخراجات تک پورا کرنے کے لالے پڑے ہوتے تھے، ان کی نفیس اور کتابوں وغیرہ کے لیے کہاں سے آتا! چنانچہ یہ خالصہ باقی اسکول، گرجا، نوالہ سے جہاں انھوں نے داخلہ لیا تھا، تین چار دن بعد واپس آ گئے۔

حالات سے مجبور ہو کر دیوان سنگھ اب وہیں حافظ آباد میں پانچ روپے ماہانہ پر ایک کپڑے کی دکان پر نوکر ہو گئے۔ یہ ملازمت دو تین برس رہی۔ اس کے بعد انھوں نے کوشش کر کے فیروز پور کے سول اسپتال میں کپاؤنڈر کی نوکری حاصل کر لی۔ چھ روپے مشاہرہ ملنے لگا۔ کچھ مدت بعد اسی حیثیت سے منڈی بوہر (ضلع فیروز پور) کے اسپتال میں نبالہ ہو گیا۔ لیکن یہاں وہ زیادہ دن

نہیں رہے؛ فیروز پور واپس چلے آئے۔ فیروز پور میں شکل سے چھ بیسے نگر سے ہونے کے پھر تباہ ہوا۔ ادب کے وہ مولا (ضلع فیروز پور پر پہنچ گئے۔ مولا کی یہ خصوصیت ہے اور اس شہر کے لیے باعثِ فخر بھی کہ آنکھوں کے مشہور معالج مائے بہادر ڈاکٹر متھرا داس (ف: ۱۶ مارچ ۱۹۷۲ء) یہاں رہتے تھے۔ وہ بھی اصل میں حافظ آباد ہی کے رہنے والے تھے، لیکن مولا میں بس گئے تھے۔ یہاں انہوں نے ایک اسپتال قائم کیا تھا، جس میں موتیابند کے علاج کے فلاحی مریض آکر رہتے تھے۔ مولا کے متھرا داس کی دیوان سنگھ کے خاندان سے دودنزدیک کی کچھ عزیز داری بھی تھی۔ انہوں نے ڈاکٹر متھرا داس سے درخواست کی کہ مجھے اپنے اسپتال میں کام سیکھنے کا موقع دیجیے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے ان کا شوق دیکھتے ہوئے خوشی سے اجازت دے دی۔

وہ اس اسپتال میں کہاؤنڈر کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ شروع میں نور علی مشاہد تھا، بعد کو ترقی ہوتی، تو بارہ ملنے لگے۔ ساتھ ہی موتیابند کا آپریشن کرنے کی تعلیم پاتے اور اس کی مشق بھی کرتے تھے۔ یہاں وہ تین برس رہے۔ جب ہاتھ جم گیا اور خود اعتمادی پیدا ہو گئی، تو انہوں نے ملازمت سے استیفاء دے دیا اور مانسہرہ (ریاست پٹیالہ) میں آزادانہ بنی مہیہ ریکلٹس شروع کر دی۔ خدا نے ان کی محنت اور خلوص میں برکت دی، کام چل نکلا۔ یہاں انہوں نے اپنا ایک چھوٹا موٹا اسپتال بھی قائم کر لیا، جہاں وہ موتیابند کے آپریشن کرتے تھے، اور باہر کے مریضوں کو ٹھہراتے تھے۔ غرض اب زندگی کامیاب کہی جاسکتی تھی۔ شہرت بھی حاصل تھی اور زمین چار سو روپے جیسے کی آمدنی بھی۔

یہیں مانسہرہ میں وہ واقعہ پیش آیا، جس نے انہیں "ڈاکٹر دیوان سنگھ" کی جگہ "دیوان سنگھ مفتون" ایڈیٹر مہنت دار ریاست پٹیالہ کی راہ پر ڈال دیا۔

فیروز پور اسپتال میں تھے، جب انہیں اردو رسالہ پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس زمانہ میں وہ ماہنامہ "زمانہ" (کراچی) کے خربدار بن گئے۔ "عزیز" (لاہور) ان

کے لئے والے ایک صاحب کے پاس آنا تھا، یہ اس سے مقدارے کر پڑھنے لگے۔ یہ سلسلہ شوق الہیہ اور روحانی بھی نہ مرتب جاری رہا، بلکہ اس میں خرتی ہوتی گئی۔ اب اور ماہنامے بھی آنے لگے، بلکہ یہ روزنامہ ”انہارعام“ دلاہور کے بھی باقاعدہ خریدار بن گئے۔ جہاں گئے، وہاں کے بعض علم دوست اصحاب سے بھی روابط پیدا ہو جاتے۔ ان سے نہ صرف پڑھے کو رسائل و جرائد ملتے، بلکہ ان کی صحبت میں دل و دماغ کی صلاحیتوں پر حلا بھی ہوتی چلی گئی۔ یہ صورت حال تھی جب وہ مانسہ میں بلا شرکت غیرے ایک اسپتال اور تین چار سو روپے ماہانہ آمدنی کے مالک تھے۔

ایک دن اسخوں نے ایک مضمون لکھا اور اسے فیر سنگھ فرزد پوری کے فرنسی نام سے لاہور کے ہفتہ وار ”خالصہ اخبار“ کو بھیج دیا۔ مضمون چھپ گیا۔ اسی نام سے دو تین اور مضمون بھی اسے پرچے میں شائع ہوئے۔ تھوڑے دن بعد اخبار کے منبر سبحانی مول سنگھ کا خط آیا کہ آپ متقل طور پر ”خالصہ اخبار“ کی ایڈیٹری کی ذمہ داری بھجے کو تیار ہیں؟ اور اگر جواب اثبات ہو تو، کیا تنخواہ قبول کریں گے؟ اسخوں نے جواب دیا کہ میں یہاں ڈاکٹری کرتا ہوں اور اس سے تین چار سو ماہانہ پیدا کر لیتا ہوں۔ میری تعلیم معمولی ہے، لیکن مطالعہ کافی ہے، اور مجھے لکھنے کا شوق بھی ہے۔ سبحانی مول سنگھ نے اس پر لکھا کہ ہم تو ایڈیٹر کو ۶۰ روپے سے زیادہ مشاہرہ نہیں دے سکتے! آپ کی موجودہ آمدنی کے پیش نظر آپ کو خالصہ اخبار کی ایڈیٹری پیش کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

بظاہر معاملہ یہیں پر ختم ہو جانا چاہیے تھا کہ ۶۰ اور ۳۰-۴۰ میں جو تین فرق ہے، اسے کیسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے! لیکن دیوان سنگھ کی ہیجان پسند طبیعت کو چین کہاں! اسخوں نے ایک بزرگ ہریان سے مشورہ کیا کہ صورت حال یہ ہے، مجھے کیا کرنا چاہیے؟ ان صاحب نے لکھا کہ اس میں شک نہیں کہ تمہاری



قلم میں غیر معمولی زور ہے اور کامیاب صحافی بننے کی صلاحیت بھی، جو برک لینے میں کیا مضائقہ ہے! اس رايے نے دیوانہ راہو سے پس است، کام کیا۔ انہوں نے جماعتی مول سنگھ کو لکھا کہ میں ۴ روپے ماہانہ ہی پر خالصہ اخبار کی ادارت قبول کرتا ہوں۔ امداد ماہانہ میں اپنا جما جمایا، چلتا کاروبار چھوڑ کر لاہور پہنچ گئے۔

وہ اس اخبار میں مشکل سے چار مہینے رہے ہو گئے۔ بیشک، ان کے زود واردیوں سے ہر چہ بہت مقبول ہو گیا، لیکن ان کی تحریریں حکومت کی نظر میں خلاف قانون ٹھہریں، اور پرچے کے مالک اور طباع اور ناشر پر متعدد مقدمے قائم ہو گئے۔ ایک مہاجر (شیر پنجاب) کے ایڈیٹر سردار سنگھ (دف: جولائی ۱۹۴۸ء) نے بھی اذالہ حیثیت عرفی اور ہتک عزت کا مقدمہ دائر کر دیا۔ ظاہر ہے کہ کونسا اخبار اتنے "لائق" مدیر کا خرچ برداشت کر سکتا ہے! ہوئے تم دوست جس کے، دشمن اس کا آسمان کیوں ہوا قدرتاً دیوان سنگھ ملازمت سے درخواست کر دیے گئے۔

اب وہ بیکار تھے، لیکن ملاوس نہیں ہوئے۔ چندے ادھر ادھر کچھ اخباروں میں کام کیا، تاہم حالات تسلی بخش نہیں تھے۔ بہر حال انہوں نے محسوس کر لیا کہ اب صحافت ترک کر کے کوئی اور پیشہ اختیار کرنا ممکن نہیں۔ اور صحافت میں ان کی تعلیم و تربیت بمنزلہ صفر تھی۔ فیصلہ کیا کہ اگر صحافت ہی کو یقینی عمر کے لیے ذریعہ معاش بنانا ہے، تو لازم ہے کہ اسے کسی کامل استاد سے سیکھا جائے۔ مشہور صحافی رام راجپال سنگھ شیدا (ایڈیٹر سندھوستان) ان دنوں لاہور میں تھے۔ اور دیوان سنگھ مفتون کے ان سے مراسم تھے۔ انہوں نے شیدا صاحب سے پوچھا کہ امداد صحافت میں سب سے لائق اور تجربہ کار کون صاحب ہیں؟ شیدا نے سید بشارت علی جالب دہلوی (دف: جولائی ۱۹۳۰ء) کا نام دیا، جو اس زمانے میں روزنامہ ہمد، لکھنؤ کے مدیر تھے۔ اس پر دیوان سنگھ نے جالب صاحب کو لکھا کہ میں آپ سے صحافت سیکھنا چاہتا ہوں! اگر آپ اجازت

ہیں، اور میرے لکھنؤ میں بسر اوقات کے لیے کچھ مقرر فرما دیں، تو میں حاضر خدمت ہو جاؤں۔ جالب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ باددہائی کرائی، نواب کے سبھی عداے برخاست۔ دیوان سنگھ سہلا یوں کہاں ٹٹنے والی اسامی تھے! انھوں نے ریل کا ٹکٹ خریدا اور لکھنؤ پہنچ گئے۔ ساتھ کا مختصر سامان ایک گورو دارے میں رکھا اور ہمدھم کے دفتر جا چکے۔ جالب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے فرمایا کہ چونکہ ہمارے دفتر میں کوئی جگہ خالی نہیں تھی، اس لیے کوئی جواب نہیں دے سکا۔ دیوان سنگھ نے کہا کہ اگر صرف ۳۰ روپے ماہانہ کا انتظام ہو جائے، تو میں یہاں رہ کر آپ سے کچھ حاصل کر لوں۔ جالب نے پھر نفی میں جواب دیا اور کہا کہ کوئی خالی جگہ ہے ہی نہیں، نخواہ کا کیا سوال ہے! اب دیوان سنگھ نے کہا کہ میں چیر اسی کے طور پر بھی رہنے کو تیار ہوں، کیونکہ میرا مقصد نواب کے دفتر میں، آپ کے نزدیک رہنا ہے، تاکہ میں آپ سے کچھ حاصل کر سکوں۔ اس پر بھی جالب نے وہی جواب دیا کہ چیر اسی کی بھی جگہ خالی نہیں ہے۔ اس پر اسی مرد قلند نے کہا کہ اچھا فرمائیے کہ کیا آپ کو میرے بغیر کچھ نخواہ لینے، مفت کام کرنے پر بھی کچھ اعتراض ہوگا؟ جالب نے کہا کہ سہلا کسی کے مفت کام کرنے پر بھی اعتراض ہو سکتا ہے! اس پر انھوں نے شہر میں ایک کیمسٹ کی دکان پر پندرہ روپے ماہانہ کی نوکری تلاش کر لی۔ دن بھر ہمدھم کے دفتر میں مفت کام کرتے، چھ بجے شام سے آدھی رات تک اس کیمسٹ کے ہاں رہتے، اور جب وہاں سے چھٹی ملتی، تو گورو دارے اگر پڑ رہتے۔ وہ لکھنؤ میں غالباً چھ مہینے رہے! شاید اور رہتے، لیکن سخت بیمار پڑ گئے۔ جب علاج معالجے سے اچھے ہو گئے، تو لاہور واپس چلے آئے، اور شیدا صاحب کے اجازت ہندوستان میں نوکری کرن۔

اس واقعے سے دیوان سنگھ کے کردار اوصاف کی کامیابی کا راز نکلتا ہے۔ اگر ان کے سامنے کوئی مقصد ہوتا، تو اس کے حصول کی خاطر وہ ماہ کی مشکلات سے

گھبر کر اس سے دست بردار نہیں ہو جاتے تھے منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے وہ کسی ادنیٰ سے ادنیٰ کام سے بھی جی نہیں چراتے تھے۔ ان کی تمام کامیابیوں کا راز انہیں دو باتوں میں پنہاں ہے، مشکل سے نہ گھبراتا اور محنت سے جی نہ چراتا۔

یہ ہندوستان "میں کام کرتے تھے کہ مشہور سکھ لیڈر ماسٹر مونا سنگھ نے ان سے کہا کہ ہمارا چاہیہ کہ آدمی جسکوڑ دیا ست پٹیا لہ کے فوجی کارکن بابو تیا سنگھ کو بہت تنگ کر رہے ہیں کیونکہ بابو صاحب نے ہمارا جاکہ بعض ناجائز خواہش پوری کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اس پر دیوان سنگھ جسکوڑ سپنچے، ماسٹر مونا سنگھ اور بابو تیا سنگھ سے ملے، سارے حالات سننے مشورہ ہوا کہ کیا کرنا چاہیے۔ آخر طے پایا کہ ہمارا چاہا ہوا کہ کارکنز اریوں کا سجانڈا پھوٹا جائے، اخباروں میں مضمون لکھے جائیں اور دیوان سنگھ خود حالات میں نقاب کرنے کے لیے اردو میں ایک پمفلٹ بھی لکھ کر شائع کرے۔

قرار داد کے مطابق دیوان سنگھ نے پمفلٹ بعنوان "خون شہادت کا تازہ قطرہ" لکھا اور چھپوا دیا۔ وہ اس کے دو نسخے جلدی سے تیار کر داکے دفتری کے ہاں سے اٹھا لاتے اور انہیں دوستوں میں تقسیم کر دیا۔ شدہ شدہ اس کی خبر ہمارا جاکے آدمیوں کو بھی ہو گئی۔ انہوں نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا، جس پر حکومت ہند نے پمفلٹ بحق مراعات ضبط کر لیا اور پولیس نے دفتری کے ہاں سے بقیہ ۱۸ نسخے اپنے قبضے میں لے لیے۔ جب دیوان سنگھ کو حالات کی خبر ملی، تو انہیں افسوس ہوا کہ کی کرائی محنت ضائع گئی۔ لیکن انہوں نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا۔ جسکوڑ سپنچ کر پھر ماسٹر مونا سنگھ اور بابو تیا سنگھ سے مشورہ کیا۔ دونوں نے کہا کہ کچھ ہو، پمفلٹ دوبارہ شائع ہونا چاہیے۔ اس پر یہ دلی گئے، یہیں اس کی کتابت کرائی اور ایک دن میں اسے طبع کر کے اور دو ہزار نسخے کے کرواپس روانہ ہو گئے۔ رستے میں لدھیانہ، جالندھر، امرتسر کے ٹراکھیانوں سے مختلف دوستوں کے نام پارسل بھیجتے ہوئے لاہور پہنچے، اور یقیقے نسخے وہاں

سے ارسال کر دیے۔

پولیس نے تفتیش کی، تو انہیں پتا چل گیا کہ یہ کس کی کارستانی ہے۔ اس پر یہ دو ہفتے بعد گرفتار کر لیے گئے۔ اب ایک لطیفہ ہوا !

جس دن پولیس نے انہیں پکڑ لے، اتفاق سے اس دن انوار ستھانہ خانے والوں نے انہیں ہتکڑی لگا کر انگریز ڈپٹی کمشنر کے بنگلے پر بھیجا کہ ان سے ریمانڈ پر دستخط کرائے جائیں، مقدمہ تحقیقات مکمل ہونے پر بعد کو وائر ہوتا رہیگا۔ ان کی خوش قسمتی کہ جب ستھانیدار انہیں ہتکڑی لگاتے ڈپٹی کمشنر کے بنگلے پر پہنچا ہے، تو صاحب بہادر نشے میں چور تھے۔ ستھانیدار نے ان سے کوائف بیان کر کے ریمانڈ پر دستخط کرنے کی درخواست کی، تو خدا معلوم، وہ پوری بات سمجھ بھی یا نہیں، انہوں نے دیوان سنگھ سے پوچھا: ویل، تم کل ہماری عدالت میں حاضر ہو گھا؟ دیوان سنگھ نے کہا: اگر آپ کہتے ہیں، تو میں ضرور آؤں گا۔ اس پر ڈپٹی کمشنر نے ستھانیدار کو حکم دیا کہ ملزم کی ہتکڑی کھول دو اور اسے رہا کرو، پیکل عدالت میں حاضر ہو جائیگا۔ وہ تو یہ کہہ کر بنگلے کے اندر چلے گئے، اور ستھانیدار غریب جیلان، پریشان کہ ٹولینس آف انڈیا کا مقدمہ، دو ہفتے کی دن سات کی تنگ دڑ کے بعد ملزم گرفتار ہوا! اور صاحب نے یوں اس کی بہائی کا حکم دے دیا! کیسی حکم حاکم، مرگِ مفاجات، کرتا تو کیا کرتا، اُس نے انہیں رہا کر دیا۔

انگلے دن پیر ستھانہ، یہ حسبِ قرارداد عدالت میں حاضر ہو گئے۔ اب صاحب کا نشہ اتر چکا تھا اور وہ اپنی پہلے دن کی کارگزاری پر کچھ متعجب اور پریشان بھی تھا۔ لیکن جو تیرکمان سے نکل چکا تھا، وہ اب واپس کین نہ کر سکتا تھا! اس نے دیوان سنگھ سے کہا کہ اگر تم معافی چاہو، اور وعدہ کرو کہ آئندہ کبھی ایسا پمفلٹ نہیں لکھو گے، تو ہم تم کو بچھوڑ دیتا ہے۔ انہوں نے جوانی کی ترنگ میں جواب دیا کہ میں نہ معذرت کرتا ہوں، نہ کوئی وعدہ! آپ کو مقدمہ چلانا ہے، تو خوشی سے چلائیے۔ اس پر صاحب کسبیا نے جوئے چہر اسی کو حکم دیا کہ اس لڑکے کو

عدالت سے نکال دو! یہ نہیں جانتا کہ مقدمہ کیا ہوتا ہے! وہاں کیا درستی چہرہ اسی نے انہیں گردن پکڑ کر باہر ڈھکیل دیا۔ جان بچی، لاکھوں پاتے صاحب نے زبان پر لکھ دیا، لازم ناخبر بہ کار لوجہ ان چھو کر لے، اسے تہیہ کر دی گئی ہے۔ میل داخل دفتر کر دی جاتے۔

یہ ان کی زندگی کی پہلی تصنیف تھی! ادب پہلی گرفتاری بھی۔

اب یہ پھر بیکار تھے۔ بسا اوقات کے لیے چندے لاہور کے مختلف پڑچوں (گورنمنٹ ہسپتال، ہندو، اکالی وغیرہ) میں جڑ و لٹی کام کرتے رہے۔ لیکن کب تک؟ آخر ۱۹۳۸ء میں دلی پہنچے۔ ان دنوں یہاں اخباری دنیا میں خواجہ حسن نظامی مرحوم (دف: جولائی ۱۹۵۵ء) کا ڈکاء بھٹا تھا۔ انہیں نئے نئے اخبار جاری کرنے کی گویا حق تھی۔ دیوان سنگھ ان سے ملے اور ملے پایا کہ ایک روزنامہ "رحمت" کے نام سے جاری کیا جاتے۔ اس میں دیوان سنگھ نے ۲۵۰ روپے لگائے، بقیہ سرائے خواجہ صاحب مرحوم کا تھا۔ شرط یہ تھی کہ دیوان سنگھ صرف تیس روپے ماہانہ اپنے ذاتی خرچ کے لیے لینگے۔ روزانہ خواجہ صاحب کی کتابوں کا ایک صفحے کا اشتہار اخبار میں مفت شائع ہو گا۔ اگر اخبار میں منافع ہوا، تو دونوں شریک برابر کے حصے دار! اگر نقصان ہوا تو اسے خواجہ صاحب پورا کرینگے۔ لیکن پوری کوشش کے باوجود اخبار لگھائے میں رہا چند مہینے کے بعد خواجہ صاحب نے کہا کہ بھائی، اب زیادہ نقصان برداشت نہیں کیا جاسکتا، ہمیں اخبار بند کر دینا چاہیے۔ تدریگ دیوان سنگھ کو اس فیصلے سے بہت افسوس ہوا۔ ابتدائی ٹوہائی سو تو ڈوبے ہی تھے، اب پھر مستقبل کا سوال سامنے آگیا۔

خواجہ صاحب اوصوف کے عزیز دوستوں میں ملنا واحدی (دف: اگست ۱۹۷۶ء) بہت مشہور شخصیت تھی۔ یہاں دلی میں ان کی بڑی ساکھ تھی، وہ میونسپل کمیٹی کے رکن بھی تھے۔ اس زمانے میں وہ ماہنامہ "نظام المشائخ" نکالتے تھے۔ انہوں نے خواجہ صاحب سے کہا کہ آپ "رحمت" لکھ دے دیجئے، میں اسے چلاؤں گا۔ غرض، "رحمت" کا دفتر واحدی صاحب کے مکان کو چھ چیلان میں اٹھ گیا۔ بسو پال سے

نیاز فنجوری اس کی ادارت کے لیے بلائے گئے۔ حکومت کو اخبار کی پالیسی پسند نہ آئی، وہ اس کی متواتر محنت چینیوں سے چیں بچیں تھی۔ اتنے میں نیاز کے مصرعے متعلق دو ادارے گویا روایتی اونٹ کی پشت پر آخری تنکا ثابت ہوئے۔ حکومت نے ملا واحدی سے ضمانت طلب کر لی، اور مطبع ضبط کر لیا۔ پرچے نے دم توڑ دیا۔ ہے یہ کہ آج تک بھی یہ ملا واحدی کی ضد سے چل رہا تھا۔ ورنہ اس میں منافع کی صورت تو کبھی ایک دن بھی پیدا نہیں ہوتی تھی۔

دیوان سنگھ سچر بیکار ہو گئے، اور حسب معمول جیب بالکل خالی، رعیت میں کام کرنے کے زمانے میں ان سے دیوبند کے ایک تاجر لالہ اوگر سین کی ملاقات ہو گئی تھی۔ وہ دیوان سنگھ کی محنت کی عادت اور فرض شناسی سے بہت متاثر تھے۔ لالہ جی نے انھیں پیشکش کی کہ آئیے، ہمیں چل کر آرٹھ کا کاروبار کریں۔ مرنے کا کیا نہ کرتا! مجبوراً دیوان سنگھ نے ۱۵۰ روپے مشاہرے پر ان کی ملازمت قبول کر لی اور بہت چلے گئے۔ لیکن تجارت ان کے بس کی بات نہیں تھی، نہ کوئی اس کا تجربہ ہی تھا۔ مشکل سے انھوں نے چار مہینے میٹھ صاحب کے ساتھ کاٹے اور سجاگ نکلے۔ اس کے بعد مہاراجا رپورڈ من سنگھ واپس نا بھڑ کے، جہاں سے سردار مردول سنگھ کو میسر کے ذریعے سے تعارف ہو چکا تھا، ملازم ہو کر نا بھڑ چلے گئے۔ وہ نا بھڑ میں کوئی ڈھائی تین سال رہے۔ یہاں وہ دوسروں پرے ماہانہ پاتے تھے۔

مہاراجا رپورڈ من سنگھ اپنی قوم پرستی اور انگریز دشمنی کے لیے مشہور تھے۔ اسی لیے حکومت ہند کا پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ ان کے خلاف ہو گیا اور حکومت انھیں گدی سے اتارنے کے لیے بہانے ڈھونڈنے لگی۔ بالآخر حکومت نے ۱۹۲۳ء میں مہاراجا کو اختیارات سے دست بردار ہونے پر مجبور کر دیا، جس کے بعد وہ ڈیرہ دون میں مقیم ہو گئے۔ لیکن حکومت ان کی سرگرمیوں سے مطمئن نہیں تھی۔ مہاراجا نے سب کچھ بے احتیاطی سے کام لیا۔ آخر کار ۱۹۲۸ء میں انھیں الہ آباد کے ریلوے اسٹیشن پر گرفتار کر کے کوڑائی کنال میں نظر بند کر دیا گیا۔ وہیں ۱۹۴۲ء میں ان کا انتقال

ہوا۔ اس جلا وطنی کے زمانے میں ان کی بیوی سرورجینی دیوڑی بھی ان کے ساتھ نظر بند رہی تھیں، ان کی ۳۴ دسمبر ۱۹۷۷ء کو کوئٹہ واپسی میں رحلت ہوئی۔

جب مہاراجا نا بھو کو گمری سے انار آگیا، تو دیوان سنگھ نے بھی وہاں سے روانہ ہونے کی تیاری کی کہ اب وہاں ان کا کون تھا جس کے بھروسے پر یہنا بھیجیں وہ سنبھل سکتے تھے۔ انھوں نے انگریز منظم اعلیٰ ریڈ منسٹر ٹر مسٹر اوگلو کی خدمت میں استغاثہ پیش کر دیا۔ اوگلو نے اول تو ان سے استغاثہ واپس لینے کو کہا اور ملازمت جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔ لیکن، مرار کرنے پر انہی رعایت کی کہ اچھا پندرہ دن تک میں اسے منظور نہیں کرتا؛ یہ وقفہ آپ کی رخصت میں محسوب کر لیا جائیگا۔ اس دوران میں غور کر لیجیے۔ اگر اس کے بعد بھی آپ اس فیصلے پر پندہ ہے، تو اسٹیفے منظور کر لیا جائیگا لیکن ہوا اس کے برعکس۔ یہنا بھر سے فوراً مہاراجا سے ملاقات کے لیے ڈیرہ دولی پہنچے۔ وہاں مہاراجا نے انھیں ایک نجی خط لے کر جبراً باد بھیج دیا۔ ظاہر ہے کہ حکومت ہند کی ہفیز پولیس ان کی نقل و حرکت کی نگرانی کر رہی تھی، اور انھیں معلوم تھا کہ یہ کیا کر رہے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں! چنانچہ جب وہ جبراً باد سے واپس نا بھو پہنچے کہ پنا سامان وغیرہ لے کر اس شہر کو خیر باد کہہ دیں، تو پولیس نے انھیں گرفتار کر کے نظر بند کر دیا۔ قصور یا الزام کچھ نہیں بنایا، بس نظر بند کر دیا۔

ان کے دوستوں کی بھی کمی نہیں تھی، خود مہاراجا نے مجلسِ دامع قوانین کے راکبین دوستوں کو لکھا۔ خدا خدا کر کے معاملہ لارڈ ریڈنگ وایسر نے ہند کے سامنے پیش ہوا اور انھوں نے ان کی رہائی کا حکم صادر فرما دیا۔ بہنیں بیٹے نظر بند رہے تھے۔

نا بھو کی ملازمت کے دوران میں انھوں نے وہاں ظلم و ستم کے کئی واقعات اپنی آنکھوں دیکھے تھے۔ قرب و جوار کی دوسری ریاستوں کے حالات بھی کچھ بہتر نہیں تھے، وہاں کی بدعنوانیوں کی کہانیاں بھی آنے والے سناتے رہتے تھے۔ دیوان سنگھ جب یہ باتیں سنتے، تو ان کا خون کھوٹا اور چاہتے کہ کسی طرح ان مظلوموں کی مدد و حکومت

ہند اور عوام تک پہنچائی جائے تاکہ ان کی داورسی ہو سکے۔ اسی زمانے میں انھوں نے دہر سویر ایک اخبار جاری کرنے کا عزم کر لیا جس کے ذریعے سے دالیان ریاست کے مظالم طشت اندام کیے جاتیں اور ان کی مصیبت زدہ رعایا کی دردناک کہانی ملک و قوم کو سنائی جائے۔

جب یہ نا بھگ کی نظر بندی سے چھوٹے، تومیدھے دتی پہنچے۔ اب انھوں نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا اقدام کیا۔ دوستوں سے مشورہ ہوا کہ کسی نے حوصلہ افزائی کی؟ کسی نے اس خازن سے دامن بچانے کی صلاح دی۔ روپے کا سوال الگ تھا۔ وہ ہمیشہ فنونِ خرچ رہے۔ نا بھگ کی پوری ملازمت کے دوران میں بھی کچھ پس انداز نہیں کیا تھا کہ اب اخبار شروع کرتے وقت کام آتا۔ قصہ کوتاہ کافی سوچ بچار کے بعد فیصلہ ہوا کہ ایک ہفتہ دہر جاری کیا جائے اور موضوع کی مناسبت سے اس کا نام "ریاست نہو"۔ فریڈر ہزار روپیہ ایک چنیے سے قرض لیا اور یوں ۱۹۲۳ء میں اس کا آغاز ہوا۔

"ریاست" کا اجرا کئی پہلوؤں سے عہدِ آفریں تھا۔ یہ پہلا پرچہ ہے جس میں خاص طور پر دیہی ریاستوں کے حالات اور معاملات پر بخوبی اور صراحت سے تنقید کی گئی۔ اس سے پہلے اگر کوئی ریاستوں کے بارے میں کچھ لکھتا بھی تھا، تو صرف والی ریاست کی مدح میں قصیدہ، تاکہ اس سے کچھ فتوح حاصل ہو سکے، لکھنے والے کو ریاست کی رعایا سے کوئی سروکار نہیں ہوتا تھا۔ پھر یہ پرچہ جس اب دہاب سے چھپنا شروع ہوا، وہ بھی اردو صحافت میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس سے پہلے صرف مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم (ف: فروری ۱۹۵۸ء) کا الہلال (البلاغ) اس شان سے نکلا تھا، لیکن وہ خوش و خوشید، وے دولت مستجمل بود کا مصداق ثابت ہوا۔ اور صرف چار برس زندہ رہ کر بند ہو گیا۔ "ریاست" کے سلسلے میں اس کے مدیر اعلیٰ یووان سنگھ کو جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا، وہ بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ چونکہ اس پرچے میں مختلف ریاستوں کی بیزمانی اور مظلوم رعایا کی حمایت میں



وہاں کے عسکرانوں کے کرتوتوں کا کچا چٹھا چھپتا تھا، اس لیے تمام والیان ریاست لے گویا دیوان سنگھ کے خلاف متحدہ محاذ بنالیا۔ کئی مقتدے دائر ہوئے جن میں دو تین کون تھے، ایک طرف راجا مہاراجا یا نواب کی بے پایاں دولت اور اثر و رسوخ، اور دوسری طرف ایک ہفتہ دار اخبار کا بیخ و بنہا یڈر اور اس کے محدود وسائل۔ لیکن آفریں ہے دیوان سنگھ کو کہ انہوں نے جو قدم پہلے دن اٹھایا تھا، اس سے فائدہ برابر پائی قبول نہیں کی اور میدان میں ڈٹے رہے۔ ان پر بعض اوقات مختلف ریاستوں کی طرف سے بیک وقت چار چار مقتدے چلیے گئے، ایک شمال میں، دوسرا جنوب میں، تیسرا مغرب میں، چوتھا یہاں دلی میں۔ آپ تصور کر سکتے ہیں کہ اس سے کتنی جسمانی تکلیف اور زور و ہمتی کو وقت ہوتی ہوگی! پھر مالی زبرداری اپنی جگہ۔ ان پر اپنی زندگی میں پندرہ مقتدے چلے۔ ان میں سب سے شہور نواب بھوپال کا مقدمہ ہے جو ہوشنگ آباد میں چھ برس تک جاری رہا۔ اور جس میں آخر کار دیوان سنگھ کو تین مہینے قید کی سزا ہوئی۔ مرحوم کہتے تھے کہ اس میں میلاستی ہزار روپیہ خرچ ہوا تھا۔ اس کے باوجود یہ کبھی نہیں ہوا کہ ان مادی اور معنوی تکالیف سے پریشان ہو کر نا انصافی یا ظلم کو تم سے سمجھوتا کر لینے کا خیال بھی ان کے دماغ میں آیا ہو۔

ریاست کی ایک اور خدمت بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔

ہماری سیاسی جنگ کا اصلی محاذ تو انگریزی حکومت کے خلاف تھا، جس نے ہماری آزادی سلب کر کے پوری قوم کو غلام بنا رکھا تھا۔ لیکن ایک ذیلی محاذ اور بھی تھا۔ اور اس پر بہت کم توجہ ہوئی۔ ہندوستان میں کوئی ۲۰۰ سی ریاستیں تھیں۔ ان کے حکمران مطلق العنان تھے، ان کا فرمودہ ریاست کا قانون تھا۔ جس کے خلاف کوئی دادرستی نہ فرماؤ۔ ان ریاستوں کی ہستی اور بقا انگریز کے رحم و کرم پر تھی۔ اس لیے یہ والیان ریاست ہمیشہ انگریز کی حمایت کرتے اور جیسا بس چلتا، رہنمایانہ قوم اور سیاسی لیڈروں کے خلاف اقدام کرتے رہتے تاکہ

اس طرح دلی نعمت انگریزی حکومت کی نظروں میں اپنی خیر خواہی اور فربا برواری کا نقش اور گہرا کر سکیں۔ غرض کہ بریاستیں ہماری آزادی کے حصول میں ہمیشہ سید راہ ثابت ہوتیں۔ ریاست نے انجیلبر، بیتقاب کر کے بہت بڑی خدمت سرانجام دی۔ اس سے جہاں ریاستوں کی رعایا میں بیداری اور اچے حقوق کا احساس پیدا ہوا، وہیں اس سے انگریز کا وقار بھی ملیا میٹ ہو گیا، جو ان کا کارہ اور ننگ ملت و قوم راجاؤں، مہاراجاؤں اور نوابوں کا پشت پناہ اور حامی تھا۔

ریاست ۱۹۶۰ء تک جاری رہا۔ ملک آزاد ہوا، تو ریاستوں کی اہمیت بھی ختم ہو گئی۔ جلد ہی نہ ریاستیں رہیں، نہ ان کے حکمران، نہ ریاستوں کے مسائل۔ اس لیے حقیقت میں اب اس پر سچے کی عزت بھی نہیں رہی تھی۔ انہوں نے ایک مقامی دوست کے ساتھ اس کے جاری رکھنے کے لیے کچھ معاملہ کیا تھا، لیکن وہ بھی دیر پا ثابت نہ ہوا۔

دیوان سنگو جنم کے فضول خرچ تھے۔ لاکھوں کاتے اور اڑا دیے، کبھی کل کی فکر نہ کی۔ ان کے ہاتھ میں چھید تھا، بڑا سا چھید، روپیہ اس میں ٹکتا نہیں تھا، ایسے میں کچھ پس انداز کرنے یا آڑے وقت کے لیے بچا رکھنے کا امکان ہی کیا تھا۔ ساری عمر صاف کا کاروبار کرنے سے وہ کسی اور گون کے رہے بھی نہیں تھے۔ اس پر کبر سنی ودا اعتدال، قوا کا فقدان۔ واقعی پریشانی کا عالم تھا۔ ہارے، مولانا ابوالکلام آزاد کی سفارش پر حکومت ہند نے ڈھاتی سورہے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا، اور پھر انہیں کے ایمپائر حکومت پنجاب نے بھی غالباً پانسو ماہانہ دینا منظور کیے، یوں جانی وطن کا رشتہ قائم رکھنے کا سامان ہو گیا۔

ریاست بند کرنے کے بعد ۱۹۶۰ء میں دلی سے ہجرت کر کے راجپورہ (ڈیرہ دکن) چلے گئے تھے۔ وہاں اکیلے رہتے تھے، یو پی نیچے یہاں دلی ہی میں رہے۔ ۲۰ جنوری ۱۹۷۵ء کو سلطانی سے نکلنے ہوئے پانڈرپٹ گیا اور گر گئے۔ سر میں چوٹ آئی۔ جس سے بہت خون خارج ہوا، علاج کے لیے وہاں اسپتال میں داخل ہو گئے۔

جب دلی میں گھروالوں کو اطلاع ہوئی، تو جا کر انھیں بوالائے۔ لیکن وقتِ اجڑا لگا  
نشا، ساری دوا دوش کے باوجود وہ جاہل نہ ہو سکے۔ (اتوار ۲۶ جنوری ۱۹۷۷ء)  
رات سے کچھ پہلے روحِ نفسِ انصاری سے پرواز کر گئی۔ یوں وہ مرد میدان بھی جس  
نے ساری عمر لڑنے جھگڑتے اور مخالفوں کا مقابلہ کرنے گزار دی تھی، فرشتہ موت  
کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گیا۔

موت سے کس کو رستگاری ہے !

تین بیٹے ان کی جسمانی یادگار ہیں: مہندر سنگھ، انکار سنگھ، زندکار سنگھ  
سب دلی میں کاروبار کرتے ہیں۔

ان سے دو کتابیں یادگار ہیں: ناقابلِ فراموش اور جذباتِ مشرق۔ ناقابلِ  
فراموش انھوں نے جیل میں لکھنا شروع کی تھی۔ ۱۹۴۲ء کی ”ہندوستان چھوڑو“  
تحریک میں وہ بھی قید کر دیے گئے تھے۔ ۱۸۵۰ اگست ۱۹۴۲ء کو گرفتار ہوئے  
اور تقریباً سال بھر بعد ستمبر ۱۹۴۳ء میں رہا کر دیے گئے۔ جیل خانے میں انھوں  
نے اپنی زندگی کے وہ واقعات قلمبند کرنا شروع کیے جو ان کی نظر میں اہم اور  
سبق آموز تھے۔ ان کی غیر حاضری کے زمانے میں ریاستِ بندہ۔ ان کی رہائی  
کے بعد جب یہ ۳ اپریل ۱۹۴۳ء کو دوبارہ جاری ہوا، تو پہلے ہی شمارے میں  
یہ یادداشتیں ”ناقابلِ فراموش“ کے عنوان سے شائع ہونا شروع ہوئیں۔ بعد  
کو ان کا ایک محقر مجموعہ کتابی شکل میں چھپا، تو بہت مقبول ہوا۔ اس سلسلے کی  
ہر دو تعزیری سے انھیں خیال پیدا ہوا کہ اسے مفصل کر دیا جائے۔ چنانچہ دوسری  
بار یہ کتاب نومبر ۱۹۵۷ء میں بڑے سائز کے ۱۵۵ صفحات پر شائع ہوئی۔ رچرو  
کے قیام کے زمانے میں انھوں نے اس کا دوسرا حصہ ”سین و فلم“ کے نام سے  
لکھا تھا۔ اور اس کی کتابت بھی ہو چکی تھی۔ یہ بھی خاصی ضخیم کتاب ہے چھپ  
جاتے، تو اس سے ہمارے سوانحی ادب میں مفید اور دلچسپ اضافہ ہو گا۔  
تعلیم کی کمی کے باوجود انھوں نے ساری عمر کی مشق سے ”اردو سے اچھی خاصی واقفیت

حاصل کر لی تھی۔ اگرچہ ان کی زبان اغلاط سے پاک نہیں، لیکن ان کی تحریر میں بلا کی کشش ہے۔ ناقابلِ فراموش ”میں تسلسلِ مفقود ہے، جسے جسے واقعات ہیں۔ ہر ایک واقعے کے آخر میں کوئی اخلاقی سبق دیے کی کوشش بھی موجود ہے، جو طبیعت پر گراں گزرتا ہے۔ ان سب نقائص کے باوجود، اس کی دلچسپی اور کشش کا یہ عالم ہے کہ انسان اس سے اکتاتا نہیں اور چاہتا ہے کہ اسے آخر تک پڑھ جائے۔ اس کتاب کا ہندی ترجمہ بھی ”تروینی“ کے عنوان سے چھپ چکا ہے۔ میں جب ۱۹۶۶ء میں افغانستان سے واپس آیا، اور انہیں معلوم ہوا، تو خواہش ظاہر کی کہ اس کا فارسی ترجمہ چھاپنے میں ان کی مدد کروں۔ میں نے عرض کیا کہ اصلی مسئلہ اس کے فارسی ترجمہ کرنے کا ہے۔ جب تک یہ نہ ہو، طباعت و اشاعت کے مرحلے کا کیونکر سوچا جاسکتا ہے! بہر حال وہ پہلے مسئلہ نہ چڑھ سکی۔

ان کی دوسری کتاب ”مذباتِ مشرق“ بھی جیل کی دین ہے۔ مقدمہٴ سہو یاں کے بعد وہ تین مہینے ناگپور جیل میں رہے تھے۔ یہیں انہوں نے ہندی، پنجابی، فارسی وغیرہ کے منتخب اشعار کا انگریزی ترجمہ شروع کیا۔ رہائی کے بعد دونوں بیرونی بھی زیارت میں چھپتے رہے۔ انہیں کا مجموعہ بالآخر ۱۹۶۰ء میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔

ان کے نام کے ساتھ مفتون کا جزو تخلص نہیں تھا۔ خواجہ حسن نظامی مرحوم اپنے دوست احباب کو مختلف لقب اور خطاب دیا کرتے تھے جس زمانے میں سردار دیوان سنگھ سے ان کے تعلقات خوشگوار تھے، انہوں نے انہیں ”مفتون“ کا لقب عطا کیا۔ اور یہ کچھ ایسا ان کے نام کے ساتھ لگا کہ جب تک آپ پورا نام ”دیوان سنگھ مفتون“ نہ کہیں، ان کی طرف کسی کا خیال جا ہی نہیں سکتا۔

مرحوم کی پوری زندگی سبق آموز ہے۔ مادی و مائیل یکسر ندرت، تعلیم نہ ہونے کے برابر، ہر طرح کے ہنریا فن سے گورے، حوصلہ افزائی کرنے والے یا بڑھاوا دینے والے نہ تھے۔ لیکن ان کی محنت و مشقت سے جی نہ چرانے کی عادت، اور بے پایاں

خود امتدادی کا یہ ثمر تھا کہ انہوں نے بڑے بڑے پہاڑوں سے ٹکڑی۔ اور انہیں  
اپنی جگہ سے ہلا دیا۔ وہ آزادانہ ہیں اور آزادانہ مرے۔

اس طرح جی کہ بعد مرنے کے  
یاد کوئی تو گناہ گناہ کرے

---

## مسح الزماں، ڈاکٹر سید

ان کا خاندان جاس (ضلع رے بریلی، یوپی) کا رہنے والا تھا۔ ان کے والد سید مہدی الزماں پیشے کے لحاظ سے بہت کامیاب وکیل اور سماجی چلو سے عمائد ظہر میں سے تھے۔

سیح الزماں ۱۸ مارچ ۱۹۲۵ء کو جاس ہی میں پیدا ہوئے تعلیمی دور بہت کامیاب رہا۔ ۱۹۴۱ء میں بی۔اے کے امتحان میں الٹا باؤنڈریسٹ کی تمام اردو کے ابدو اور ان میں اول آئے، تو چنانہنی گھوش کلایدگاری سونے کا تمغا انعام میں ملا۔ دو برس بعد وہیں سے ایم۔اے (اردو) کی سند پائی، جس میں پھر تمام طلباء میں اول رہنے پر کوٹہ جملی تمغہ عطا ہوا، اس کے بعد پھر جاتے تھے کہ وہیں سے ڈاکٹریٹ کی سند بھی حاصل کریں، لیکن اس وقت صدر شعبہ اردو خاسن علی خاسن (د: ۲۵ اپریل ۱۹۵۵ء) تھے۔ اور وہی ان کے تحقیقی کام کے نگراں بھی تھے۔ ان سے موضوع کے مسئلے پر اتفاق نہ ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بات ملتے رہی، اور بہت دن بعد کہیں ۱۹۶۸ء میں وہ ڈی پٹ کے مرتبے تک پہنچے۔ صرف ۱۸ برس کی عمر تھی کہ ایم۔اے کرنے کے بعد ۱۹۴۳ء میں وہیں اپنی یونیورسٹی میں اردو کے مدرس (لیکچرر) مقرر ہو گئے، پہلے کچھ دن عارضی جگہوں پر رہے، بعد کو مستقل ہو گئے۔ رفتہ رفتہ ۱۹۷۲ء میں ریڈر کا مقام ملا۔ اس دوران میں دو برس کے لیے انہوں نے بنارس ہندو یونیورسٹی میں شعبہ اردو، فارسی و عربی کے صدر کی حیثیت سے

بھی کام کیا (نومبر ۱۹۶۹ء تا نومبر ۱۹۷۱ء) چونکہ وہاں نو بیس نہ ملی، اس لیے وہاں اللہ آباد چلے آئے۔

پھر چہ جسم کے لاغر اور قواء کے کمزور تھے، لیکن عاصوت کم و بیش ہمیشہ شیک ہی۔ آخری وقت بہت دیر پانے آیا۔ ۹ فروری ۱۹۷۵ء کو اچانک دل کا دورہ پڑا، اور جان بحق ہو گئے۔ خدا ملزت فرماتے۔ کربلا، اللہ آباد (ہمت ننگ میں دفن ہوئے)۔

جائس کے سادات امام دہم حضرت علی نقی علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ علم و فضل کے ساتھ شعر و ادب بھی ان کا طرہٴ اقبال رہا ہے۔ سید سیح الزماں کے خاندان میں بھی پرانے مسلمان نگرانوں کی طرح عربی، فارسی کا بہت جہر چلتا تھا۔ ان کے والد سید مہدی الزماں صاحب علمی ذوق اور شاعر اند مزاج کے آدمی تھے۔ انہیں کھینے پڑنے کا حقوق تھا؛ بلکہ عروض پر چند رسالے بھی ان سے یادگار ہیں۔ سید سیح الزماں مرحوم نے بھی فارسی انہیں کی نگرانی میں پڑھی، اور اس میں انہیں استعداد پیدا کر لی۔

ان کی دلچسپی کے دو خاص موضوع تھے: ڈراما اور مرثیہ۔ ڈراما کے فن کے مال، اور ماہیہ سے خوف و رافت تھے۔ دیوبندسٹی میں ڈراما بینک ایسوسی ایشن بھی قائم کی تھی، جس کی سرپرستی میں خود سید الزماں صاحب کی نگرانی میں ڈرامے کیلے جاتے تھے۔ یہ امر واقع ہے کہ اللہ آباد دیوبندسٹی، بلکہ ہاشر شہر کے حلقوں میں بھی، ڈرامے کو جو فروغ ہوا، اس میں سید الزماں مرحوم کی ساعی کو بہت دخل ہے۔

جس ماحول میں ان کی تربیت ہوئی تھی، اس میں تعصیف و تالیف کی چاٹ لگ جانا بالکل قدرتی بات تھی۔ اس پر پیشہ اُردو پڑھانے کا اعتقاد اچانک شیعہ تھے، اس لیے مرثیے سے شغف بھی فطری بات تھی۔ ان کی پہلی کتاب ”مرثیہ میر تقی میر“ ۱۹۵۲ء میں لکھی۔ عام خیال تھا کہ میر تقی میر کے مراثی مفقود ہو چکے ہیں، مرحوم نے انہیں کو ایک مبسوط مقدمے کے ساتھ پیش کیا ہے۔ بقیہ کتابیں یہ ہیں: (۲) اردو تنقید کی تاریخ، جلد اول (۱۹۵۴ء)؛ (۳) تبصیر انشراح، تنقید (۱۹۵۵ء)؛ یہ بعض مضامین اور شفرق تقریروں کا مجموعہ ہے؛ (۴) ”حرف غزل“ (۱۹۵۷ء)؛ اس

میں اردو غزل کا تنقیدی مطالعہ اور انیسویں صدی کے مشہور غزل گو یوں کا جائزہ لیا ہے؛ (۵) "امانت کی اندر سبھا" (۱۹۶۶)؛ مثنیٰ کی تصنیف کی گئی ہے، اور ایک مبسوط مقدمے میں، ابتدائی اسٹیج، رہس اور اندر سبھا کی تدوین اور اس کی غزلیں اور غامیوں پر بحث کی ہے؛ (۶) معیار و میزان (۱۹۶۸)؛ اردو کے نثری اسالیب پر تبصرہ ہے؛ (۷) اردو مرثیہ کا ارتقاء (۱۹۶۸)؛ ڈی لٹ کی سٹار کا مقالہ؛ (۸) اردو مرثیے کی روایت (۱۹۶۹) یہ گویا اردو مرثیہ کی تین صدیوں کی تاریخ ہے؛ (۹) مولانا انیس دو پیراؤں شیلی (۱۹۷۰) مقدمہ اور حواشی کا اضافہ کیا ہے؛ (۱۰) کلیاتِ مومن (۱۹۷۰) مقدمہ اور مومن کے مقام کے تعین کی کوشش؛ (۱۱) کلیاتِ میر: جلد دوم (۱۹۷۱)؛ غزلیات کے علاوہ میر کے کلام کی تدوین، اس کے مقدمے میں میر کی شاعری اور اسلوب پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے؛ (۱۲) دلیخ کی شاعری (ہندی)؛ (۱۳) خورشید (۱۹۷۳)؛ پارس کی تحفہ ربی کا پہلا اردو ڈراما جو کسی زمانے میں گجراتی میں چھپا تھا، اسی کو حیاتِ نور بخشی ہے۔ انھوں نے دو کتابیں انگریز کے ترجمہ بھی کی تھیں (۱۴) ٹیلیفون کی کہانی (۱۹۷۰)؛ (۱۵) بیاسہا متحدہ کی مختصر تاریخ (۱۹۷۴) کچھ چیزیں غیر مطبوعہ بھی رہ گئیں۔ مختلف مجلات میں مطبوعہ مضامین بھی خاصی تعداد میں ہیں۔

ان کی شادی پر و فی سر سید مسعود حسن رضوی ادیب کی بڑی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ ان سے دو لڑکے اور دو لڑکیاں اپنی یادگار چھوڑے۔



## حیرت بدایونی، سید حسن

یونی کے مروجہ چیز غلطی ہدایوں میں پیر کے دن ۲۳ اگست ۱۸۹۶ء (۱۵ ربیع الاول ۱۳۱۴ھ) کو پیدا ہوئے۔ دادھیال اور ناسخیال دونوں طرف سے حضرت ابو بکر صدیقؓ کی اولاد میں تھے پشتوں سے ان کے بزرگ حکومتِ وقت کی ملازمت کرتے آئے تھے، اور گھر میں علم و فضل کا بھی دور دورہ تھا۔

ان کے جدِ اعلیٰ قاضی محمد مجلسی، جہاد اور تلک ریب میں فتاویٰ عالمگیری کی ترتیب و تدوین شریک رہے تھے۔ اسی باعث ان کے بعد یہ خاندان "قاضی زادے" کے لقب سے مشہور ہو گیا۔ چنانچہ بدایون کے جس محلے میں یہ لوگ مقیم تھے، وہ آج تک "قاضی ٹولہ" کہلاتا ہے۔

ان کے دادا قاضی عظمت علی منصف اور صدیق اعلیٰ کے عہد سے ہر فائز تھے زمیندار کی بھی تھی۔ غرض دینی عزت اور آرام و آسائش کے تمام وسائل مہیا تھے لیکن یہ خوشحالی ان کے والد قاضی محمد حسن کے ساتھ ختم ہو گئی۔ انگریزی حکومت کا زمانہ تھا۔ انہیں کوئی معقول ملازمت ملی نہیں، اور معمولی اور چھوٹی نوکری پھولنے لے اپنے شایانِ شان نہ خیال کی۔ بیکاری اور مزاج میں ریاست کی ہوا رفتہ رفتہ ساری املاک بک گئیں، جہاں عیش کے تقاضے پہنچتے تھے، وہاں افلاس نے چھاؤنی جھالی۔

بدایون کا ماحول کچھ عجیب دین و دنیا اور شر و حکمت کے امتزاج کا نام تھا۔

سید حسن کچھ حالات سے عہدہ کچھ اپنی افتادہ طبع کا تقاضا، ان کی تعلیم کا آغاز بھی عربی اور دینیات سے ہوا۔ اور بالآخر مدستہ قادریہ اور مدستہ شمس العلوم سے عربی اور علوم قرآنی میں سند فراغ حاصل کی۔ پھر الزاب اور فیوکیٹی سے فنی فاضل (فارسی) اور مولوی فاضل (دری) کے اعلیٰ امتحانات انجیاز سے پاس کیے۔

تعلیم جس بیج پر مبنی تھی، اس میں معاشی کے پیشے کے علاوہ اور کوئی سبیل رہ ہی نہیں گئی تھی۔ چنانچہ اوائل میں چند سے انبار، بدایون، اکاچور کے باقی اسکولوں میں مدرس رہے۔

۱۹۲۲ء میں ہماری سیاسی تحریک اپنے پورے شباب پر تھی۔ پوری فضا کانگریس اور خلافت کے نعروں سے گونج رہی تھی۔ نوجوان طبیبوں میں جوش اور ہیجان تھا۔ جوان سید حسن بھی اس لپیٹ میں آ گئے، جوش و خروش سے میدان عمل میں کود پڑے اور جلسوں میں تقریریں کرنے لگے۔ لیکن جب گرتاری کا وارنٹ کٹ گیا، تو اب مابینت اسی میں دیکھی کہ انگریزی علاقے سے ہجرت کر جائیں۔ رُپوش ہو کر دسمبر ۱۹۲۲ء میں ریاست حیدرآباد وکن پہنچے، جو اس دور میں شمالی ہند کے شرفا کا واحد مہا ودا تھا۔ مہینا بھر بعد جنوری ۱۹۲۳ء میں ریاست کے قانون کے مطابق حلف نامہ داخل کر کے ملکی صداقت نامہ ریاست کی رعایا ہونے کا سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا۔ انگریزوں نے بھی یہ خیال کر کے کہ چلو، بلا ٹلی، مزید سمجھا نہ کیا اور انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔

حیدرآباد میں بھی معاشی کا پیشہ اختیار کرنا پڑا۔ اولاً چند سے مدستہ آصفیہ میں پڑھتا رہے، بعد کو شاہی خاندان کے نوہالوں کی درسگاہ ”مدستہ اعزہ“ میں تہا دار ہو گیا۔ یہیں تھے کہ نوجوان نواب سکلیانی کے اتالیق مقرر ہو کر پاینگاہ پر چلے گئے۔ دو تین برس بعد ہمارا جاسر کشن پرشاد عین السلطنت سے ملاقات ہوئی، تو ان کے وہاں سے وابستہ ہو گئے۔ ہمارا جامع روم کی مردم شناسی اور اپنے وابستگان کی ترقی پر توجہ ضرب المثل ہے۔ انھوں نے جاگیر دار کالج میں ان کی ملازمت کا انتظام کر دیا۔

سہی زمانہ ہے جب حیدر آباد میں ملکی اور غیر ملکی ٹھریک چلی تھی۔ جب تک وہاں ان کی پشت پر تھے، سپہ حسن کی ملازمت کو کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ لیکن انہوں نے استغفا دے دیا، تاکہ کسی کا احسان نہ رہے۔ اس کے بعد سچر مہاراجا ہی کی وساطت سے انہیں محکمہ اوقاف میں جگہ مل گئی۔ ۳۶ برس کی طویل ملازمت کے بعد اسی محکمے سے پنشن پر سبکدوش ہوئے۔ عمر بھر کے قیام نے حیدر آباد کو ان کا وطن ثانی بنا دیا تھا۔ اس لیے اب وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ احمد بدایون واپس نہیں گئے۔

ان کا گھر سچر شاعر تھا۔ دادا منگلت علی ضیا، والد محمد حسن، آخر چچا محمد حسین سحر، بڑے سہائی محمد حسن، محسن تھے۔ ان کے چھوٹے سہائی سلطان حسن کا تخلص ابرخا۔ ایسی شعردہ فضا سے یہ کیونکر بچ سکتے تھے! فرض بہت کم عمری میں شعر کہنے لگے۔ پہلے حسن تخلص کیا، بعد کو اسے جبریت سے بدل لیا۔ شعر پر کسی سے اصلاح نہیں لی جو کہا، خود ہی دیکھ لیا اور حسب ضرورت اس میں ترمیم کر لی۔ اردو اور فارسی دونوں میں کہتے تھے! اردو میں آبینہ (حیدر آباد ۱۹۳۷ء) اور فارسی میں ابرق (حیدر آباد ۱۹۳۷ء) مجھے طبع ہو چکے ہیں۔ بچوں کے لیے بھی کچھ چیزیں لکھی تھیں! یہ بھی شائع ہو چکی ہیں۔

۱۵ فروری ۱۹۷۵ء بھٹے کے دن نماز مغرب کے بعد سوا سات بجے راہی ملک بقا ہوئے۔ اگلے دن ۱۶ فروری جنازے میں شہر کے تمام طبقات کے لوگ کثیر تعداد میں شریک ہوئے۔ درگاہ یوسفین (نام پٹی) کے احاطے میں پائین کی طرف سبز خاک ہوئے۔ امیر مہناتی احمد داغ بھی اسی درگاہ میں موجود ابھی ہیں۔ رہے نام الہ کا۔

۱۹۲۵ء میں ان کی مشادی جناب اجمار حسین فرشتوری کی صاحبزادی شکیلہ خاتون سے ہوئی تھی۔ وہ مجددہ تعالیٰ حیات ہیں، اردو و فارسی کی بھی لیاقت کی مالک ہیں اور شعر و شاعری کا بھی ذوق رکھتی ہیں۔

اولاً جسمانی میں چار بیٹے اور تین بیٹیاں اپنی یادگار چھوڑے۔ بیٹوں میں سب سے بڑے مؤید حسن ایم۔ کام، ریحمن ریسرچ لیبارٹری میں انجینئر کے شعبے کے مدیر ہیں۔ ان سے چھوٹے ڈاکٹر افضل محمد عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ جغرافیہ میں ریڈر ہیں۔ اور سخیلہ احمد جلیس ایم، اے انوار العلوم کالج میں اردو کے لیکچرر۔ سب سے چھوٹے محی الدین حسن حکومت ہند میں ہیں۔ شہزادہ شکار جیلانی بانوان کی بیٹی ہیں۔

کلام بہت پختہ اور بے عیب ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں غلط العام فصیح اور غلط العام فصیح دونوں کو دھوکا سمجھتا ہوں؟ عام اور عوام میں کوئی فرق نہیں! غلطی عوام کی ہو یا خواص کی، وہ غلطی ہی رہیگی اور غلطی ہی کہلائیگی۔ اس لحاظ سے ان کا کلام دیکھا جائے، تو آپ کو اس میں کہیں کوئی سقم نظر نہیں آئے گا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

وہ شباب، وہ جوش، وہ دل نہ رہا، وہ تڑپ نہ رہی، وہ مزانہ رہا

تری آنکھ میں قند و دانہ نہ رہی، مرے دل میں مذاق جفانہ رہا

تری دُھن میں گھیا ہوں وہاں کہ جہاں نہ غم دل و جاں نہ غم و دجہاں

کوئی دُھن تری دُھن کے سوانہ نہ رہی، کوئی غم ترے غم کے سوانہ نہ رہا

دل ہی کی زندگی سے ہے دنیا کی زندگی دنیا نہیں رہی، اگر دل نہیں رہا

حیرت! وہ میکش نہ ہوتی، خود کشی ہوتی قابو میں جب دیاں نہ رہی، دل نہیں رہا

رنج میں ہنسنا، عیش میں رونا، موت کی شادی ولایت کاظم

سارے زمانے سے الٹی دنیا سے محبت، کیا کہنا!

دو در شراب و نغمہ و گلشن، ابر سیاہ و موسمِ نخل

آج کسی کی بزمِ طرب ہے غیرتِ جنت، کیا کہنا!

آج یہ کون انجمن میں جلوہ فرما ہو گیا بزم کا عالم، ابھی کیا تھا، ابھی کیا ہو گیا

میکدہ آباد، ساقی شاد، میکش زندہ باد آج ہم جیسے فیروں کا بھی پھیر ہو گیا

غیر دل کی وفا سے تو فراغت ہوئی حاصل  
ہنوں کی جفا کا ہے ابھی بارگراں اور

ضیا فریب محض ہے، لیکن مقرر نہیں  
دنیا میں ہنوائی دنیا کیے بغیر

پھر پوش میں آجائیں جنوں چھوٹ کے چرتا  
اب دل کو نیا رنگ لگانے کے نہیں ہم

تم نہیں ہو، تو برسات کس کام کی!  
آگ برسا رہے ہیں، یہ پانی کے دن

اپنی سنی کوئی کسی ہم نے دوا میں  
چلتی نہیں انسان کی مگر حکم خدا میں

ہے رحم کا وعدہ، تو کبھی تپس کی دھمکی  
ڈالا مجھے کشمکش بیم و رحبا میں

پیتے میں محتسب بھی، اکیلے ہمیں نہیں  
لیکن وہ بی کے گھر سے بچنے نہیں

منزل دہی قدم ہے جہاں ٹوٹ جاتے دم  
سچ بچھے تو عشق کی منزل کہیں نہیں

تم پر میرا کوئی حق بھی نہیں، دعوئی بھی نہیں  
آج تک میں نے اس انداز سے سوچا بھی نہیں

دل بے خدا دل کہہ کرتا ہے بھر دسا تم پر  
تم تو تم ہو، مجھے اب دل کا بھر دسا بھی نہیں

اب یہ لگتا ہے کہ برسوں کی محبت ہے، مگر  
اس سے پہلے تمہیں میں نے کبھی دیکھا بھی نہیں

تم مہربان تھے، تو سبھی مہربان تھے  
تم مہربان نہیں تو کوئی مہربان نہیں

خبر سی جو نفس میں بہار آنے کی  
نظر میں پھر گئی تصویر کشیا نے کی

شام سے صبح ہو گئی صبح سے شام ہو گئی  
آپ کے انتظار میں عمر تمام ہو گئی

ترک با مہکی باتیں، پاکباز ارہنے رہے  
بارہ خدا باز آئے ایسے خیر خواہوں سے

دونوں کی خندے خاک میں ہم کو ملا دیا  
دل اختیار کا ہے، نہ تم اختیار کے

دل تم سے لگا کر یہ دعا مانگ رہا ہوں  
انسان کا انسان سے خدا کام نہ ڈالے

سوئی کو خدا طور پہ آئی، تو سیر آئی  
جاؤ بھی، بڑے آئے ہمیں دیکھنے دلیرا

موت ہے انسان کا آفت از بھی، انجام بھی

زندگی در حقیقت موت کی تاخیر ہے

مانا کہ دوسروں سے مخاطب میں وہ انگریز  
 تم نے کیا کر دیا خدا جلنے \_\_\_\_\_ دل ہمارا رہا، نہ ہم دل کے  
 دوران سفر میں ہیں رہو، پایاں سفر معلوم نہیں  
 رہبر کو ریشہ منزل تو کجا، خود راہگزر معلوم نہیں  
 یہ چاند کا رنگیں دھوکا ہے، یا سچے چاند کا نور کا ہے  
 نسوس، ابھی آنا بھی تھیں، مرغانِ سحر معلوم نہیں  
 طوفانِ فضا میں چھا تو گیا، موجوں میں تلاطم آ تو گیا  
 اب دیکھیے، لکرا جائے کہاں، درجائے کدھر معلوم نہیں  
 اک ٹیس سیڑ پا جاتی ہے، اک برقی سی لہرا جاتی ہے  
 کیا کہیے کہ سینے میں رخی دل ہے کہ جگر، معلوم نہیں  
 لاریب کہ صبح صادق کا دنیا میں تو برحق ہے آنا  
 البتہ ہمارے جیتے جی آئیگی سحر معلوم نہیں  
 ہر چند کہ ہمت ہم سے خفا، اوروں کی طرف رُش ہے بھی تو کیا!  
 کیا ہم کو تمھاری آنکھوں کی افتادِ نظر معلوم نہیں؟  
 اٹھتے نہیں دل کی سمت تدم، کرتے ہو طوافِ دیرِ حرم  
 اللہ کہنہ دو! تم کو بھی اللہ کا گھر معلوم نہیں  
 مانا کہ افق پہ پہنونی کرن، دنیا سے چمن بیدار ہوئی  
 آغازِ سحر معلوم سہی، انجامِ سحر معلوم نہیں  
 حیرتِ انھیں انساں گیوں سمجھا! اب میں وہ پری، اب کیا شکوہ  
 جب حسِ جولان ہو جاتا ہے، لگ جاتے ہیں پیر، معلوم نہیں؟

## شمس میزری، حافظ شمس الدین احمد

ریاست بہار میں میسر بہت مشہور قصبہ ہے۔ یہ حضرت شرف الدین بھٹی کی سکونت  
 اور بکھروہیں تدریس کی وجہ سے میسر شریف کہلاتا ہے۔ یہی میسر شمس کے نزرگوں  
 کا وطن تھا۔ ان کے والد ضیہ الدین صاحب مولوی کا شکار تھے، محنتی، دانا دار  
 خدا ترس اور تعلیم یافتہ۔ اسی لیے وہ لوگوں میں مولوی ضیہ الدین کے نام سے  
 مشہور ہوئے۔ انھیں گاؤں کے زمیندار کے ظلم و ستم سے عاجز آکر ترک وطن  
 کرنا پڑا۔ اس پر انھوں نے گوا تیار میں سکونت اختیار کر لی۔ یہاں انھوں  
 نے میراوقات کے لیے ٹھیکیداری کا کام شروع کیا۔ اور رفتہ رفتہ فنِ تعمیر  
 میں اتنی مہارت حاصل کر لی کہ انجینئر کہلانے لگے، اور پھر اسی حیثیت سے ریاست  
 میں ملازم ہو گئے۔ ان کی بقیہ زندگی گوا تیار ہی میں گزری۔ یہاں عزت و  
 حاصل ہوئی، اور روپیہ بھی خوب کمایا، یہ خدا نے ان کی نیک نیتی کا پھل دیا۔  
 ایک زمانے بعد وطن مالوت واپس آئے۔ اب دیکھیے قسمت کا کرشمہ! وہی  
 زمیندار جس کی چہرہ و سیتوں سے تنگ آکر انھوں نے ہجرت کی تھی، اپنے  
 لہجوں کے طفیل، ان حالوں پہنچ چکا تھا کہ اس کی جا داؤد فروخت ہو رہی  
 تھی۔ مولوی ضیہ الدین نے یہ جا داؤد خرید لی۔ ایک الایام مراد لہا بن اٹھاس  
 زمانہ ایسی ہے۔

شمس الدین احمد ۱۸۹۶ء میں ضلع شند کے گاؤں بلھوری، اپنی نانہیاں میں پیدا

پیدا ہوئے تعلیمی اور بہت شاندار دور تھا۔ دسویں کا امتحان ۱۹۱۱ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے درجہ اول میں پاس کیا، اور فارسی میں پوری یونیورسٹی میں اول آئے۔ انٹر کا امتحان بھی چٹہ کالج کے طالب علم کی حیثیت سے کلکتہ یونیورسٹی ہی سے درجہ اول میں پاس کیا، اور ادب کے صوبہ بہار میں اول رہے۔ لی اے کے زمانے میں ان کے والد مولوی ضیاء الدین گوالیار میں مقیم تھے۔ یہ امتحان انھوں نے وکٹوریہ کالج، گوالیار سے، اور آباد یونیورسٹی سے دیا، جس کے ساتھ یہ کالج ملحق تھا؛ انے کالج میں اول آئے اور ریاست گوالیار سے وظیفہ ملا۔ اس زمانے میں مولوی احسن اللہ خان شاقب وکٹوریہ کالج میں مولیٰ اور فارسی پڑھاتے تھے؛ شمس الدین احمد ان کے چہیتے شاگرد تھے۔ اس کے بعد انھوں نے مٹنہ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا، اور وہاں سے ایم اے (فارسی) کی سند درجہ اول میں حاصل کی، یونیورسٹی بھر میں اول آئے، اور طلائی تمغہ ملا۔ اسی دوران میں قانون کی سند (ایل ایل بی) بھی حاصل کر لی۔

اتنے شاندار تعلیمی دور کے بعد ملازمت میں کیا خود اداوی پیش آسکتی تھی؛ منظرہ میں گریجواری بار برہمن کالج تھا۔ شمس کا ۱۹۲۱ء میں وہاں اردو فارسی کے مدرس کی اسانی پر تقرر ہو گیا۔ سال بعد دادنشا کالج، کنک (اڈیسہ) میں قانون کی تدریس مقرر ہو گئی اور یہ وہاں چلے گئے۔ پانچ برس وہاں رہنے کے بعد ۱۹۲۷ء میں چٹنہ کالج میں اردو فارسی پڑھانے پر مقرر ہوئے۔ بقیہ زمانہ ملازمت اس کالج میں بسر ہوا؛ ۱۹۵۱ء میں ان کو ادو اکرام سے دیں سے سبکدوش ہوئے۔

گماخدا پر د فیر سید جس چٹنہ؛ جناب قسم الحق گیا دی، چٹنہ  
 یہ کالج ایک مالدار اور ریجنل بھوسہ دار، بونگٹ سنگھ نے قائم کیا تھا۔ گریجر  
 (۱۸۷۷ء) اس وقت حاکم ضلع تھا جس کا نام انھوں نے اپنے ساتھ  
 خالی کر لیا۔ آدھوی کے بعد حکومت وقت نے کالج کا نام صرف بانی سے  
 منسوب کر کے لکٹ سنگھ کالج رکھ دیا (۱۹۵۷ء تک)۔ چنانچہ اس وقت  
 یہی نام ہے۔



ملازمت سے فارغ ہو کر اولاً انھوں نے وکالت شروع کی، لیکن اس میں دل نہیں لگا۔ ساری عمر مدنی میں گزری تھی، قانون کے ساتھ زیادہ مصلحت بھی نہیں رہا تھا۔ لہذا اس میں کچھ ایسی کامیابی نہیں ہوئی۔ اسی زمانے میں شیخینہ کا دل کھل گیا اور یہ تعلیم و تدبیر کے لیے وہاں مقرر ہو گئے۔ لیکن اب صحت بہت گر گئی تھی، اور اکثر بیمار رہنے لگے تھے۔ آخر میں اس ٹیٹ کی فرسائی ہو گئی۔ اسی حادثے میں ۱۸ فروری ۱۹۷۵ء کو انتقال کیا۔ درگاہ شاہ اہل حق میں دفن ہوئے۔

شہر گوئی کا نام کے زمانے سے شروع کی، اور اس میں اپنے کالج کے استاد شاقب مرحوم کے مشورہ رہا۔ بعد کو جب شاقب کا کلام نظم و شعر، گوہرین نامہ کے عنوان سے چھپا (تکھنؤ ۲۱/۱۳)، تو شمس نے اس کے شروع میں اردو میں تقریباً سب گمان ہے کہ انھوں نے شاقب کے علاوہ اور کس کو اپنا کلام نہیں دکھایا۔ ان کے کلام کا ایک مجموعہ ”گلہا نگ“ کے نام سے چھپ چکا ہے (جلد ۱۹۷۰ء) اس کے علاوہ انھوں نے نظیر اکبر آبادی کا مختصر انتخاب ”اشعارِ نظیر“ کے عنوان سے کیا تھا۔ یہ کتاب بھی چھپ چکی ہے (الہ آباد)

انھوں نے اپنی زندگی میں تین نکاح کیے۔ پہلی بیوی ان کی خالہ کی صاحبزادی تھیں۔ ان سے دو بیٹے ہوئے۔ ایک لڑکا عین عالم شباب میں بحالت جنون فوت ہو گیا، دوسرے حیات ہیں۔ اس بیوی کی وفات کے بعد دوسری شادی کی، اس کی اولاد موجود ہے۔ تیسری بیوی کی اولاد بھی، اشارہ اللہ خوش و خرم موجود ہے۔

چند اشعار بطور نمونہ درج ہیں:

اند! یہ صنمکہ کیسا بنا دیا      اس خاکراں کو حسن کی دنیا بنا دیا  
صد جلوہ پائے بوقلموں سے جہان کو      آشوب گاہ طورِ تجلی بنا دیا  
دشتِ وحشت میں وہ اب پہلی سی رہائی ہی نہیں

موت نے مجنوں کی، دیرانے کو دیراں کر دیا

کیا بسکہ دشی ہوئی شمس! میری عشق میں

بان دی اللہ کو، دل نذر جانماں کر دیا

خزاں سے پامال ہو رہا ہے، جن جو تھا اسی آرزو کا

جو کھل بظاہر شکستہ ہیں سب، نہیں ہے نام ان میں رنگ و کا

بھلا کر دے بھلا لیگا، ترا کر دے، ترا لیگا

اے نے کا تا ہے جس نے بویا، اے نے چا تا ہے جس نے تھو کا

اندان کی یاد اب اتنی سی رہ گئی۔ گویا کبھی لے تھے کسی میہاں سے ہم

منزل بھی ایک، راہ بھی ایک، اخلاک کیو؟ بس یہ کہ شرع گئے ہیں ذرا کا داں سے ہم

کبھی ہم سے قول و قرار تھا، تمہیں یاد ہو کہ زیاد ہو

کبھی چاہ تھی، کبھی پیاد تھا، تمہیں یاد ہو کہ زیاد ہو

کبھی وقت گری خوں بھی تھا، کبھی عہد زود جنوں بھی تھا

کبھی خوشی عہد بہار تھا، تمہیں یاد ہو کہ زیاد ہو

بہسی جنگلوں میں قرار تھا، کبھی شغل سیر و شکار تھا

ہیں لطف میل و نہار تھا، تمہیں یاد ہو کہ زیاد ہو

نقے بہت تھا، اے بھی ملتی دم امتحان رہا کوئی

یہی ایک شمس نزار تھا، تمہیں یاد ہو کہ زیاد ہو

بہت کم ہیں جاں رزے ملی دیکھنے والے زیادہ ہیں فقط عمل کا پردہ دیکھنے والے

دجلہ اوست جام کامرائی اس قدر حق کے

بہت دیکھی ہیں تقدیریں گجراتی ہم نے بن بن کے

مزا ہے آپ روٹھیں اور منائیں منتوں سے ہم

تیاست ہے، مگر پھر روٹھ جانا آپ کا من کے

کئی جھینا پڑے تو عس جنگل کو کھل جائیں

شالہ داغ ہم بھی منتظر بیٹھے ہیں سادوں کے

کئی جھینا پڑے تو عس جنگل کو کھل جائیں

شالہ داغ ہم بھی منتظر بیٹھے ہیں سادوں کے

ہونٹوں پر تسم کیوں کا، محالوں میں لائی پھولوں کی  
 کچھ پھول ادھر بھی دیتی جا، ادھیچنے والی پھولوں کی !  
 پھاگن کی ہوا میں چلتی ہیں شاخوں میں کلیاں کھلتی ہیں  
 اس فصل میں جو بن رہی کھلتی ہے ڈالی ڈالی پھولوں کی

جگنو کے اندھیرے میں روشن پھولوں کے دیے کڑاے ہیں  
 باغوں میں منائی فطرت نے کیا خوب دو الی پھولوں کی  
 اپنے بیگانے ہوئے اے جانِ جاں تیرے لیے  
 بن گئے دشمن زمین و آسمان تیرے لیے  
 ساتھیوں نے ساتھ چھوڑا دوستوں نے دوستی

ہو گئے اپنے پر ایسے بدگماں تیرے لیے  
 کیسے ہم ہلکے تھے جب تک نہ تھا تیرا خیال  
 ایک آفت ہم پر آئی ناگہماں تیرے لیے  
 سختیاں ساری سہیں تیرے لیے اے دلربا !

کھوئے سب آرام، اے آرامِ حال تیرے لیے  
 جان تک اس نے نگا دئی جاہ کی بازی میں  
 کچھ نہ بچا شمس نے سود و لیاں تیرے لیے

یار سے دُور و نظر نہ ہوئی لاکھ جاہ کہ ہو، مگر نہ ہوئی  
 شبِ فرقت گزری جائے لگی کون بس شب ہے، جو سحر نہ ہوئی ؟  
 وہ طلب کیا، جو در پہ ٹھہر گئی ! وہ نظر کیا، جو پردہ در نہ ہوئی !  
 وہ دہ دہ جس کے تیرے آتشِ شوق تیز تر نہ ہوئی

چاندنی کھل رہی ہے صحر میں  
 شمسِ وحشی کو بھیبا خبر نہ ہوئی !

## اعجاز حسین، ڈاکٹر سید

ان کے والد کا نام سید محمد شفیع تھا۔ وہ پولیس میں ملازم تھے۔ آدمی شریفانہ مسکین طبع تھے لیکن تعلیم زیادہ نہیں تھی۔ اس لیے کوئی نرقی نہ کر سکے۔ ان کے خسر سید حسین امیر اور رئیس آدمی تھے۔ اللہ آباد کے مصافحات کے محلہ راجا پور میں خاصی جاداد کے مالک تھے۔ ان کے صرف چار بیٹیاں تھیں، تربہ اولاد نہیں تھی۔ اسی لیے انھوں نے بیٹیوں کی شادیاں شریف لیکن غریب نوجوانوں سے کیں اور سب کو خانہ دانا کی حیثیت سے اپنے ساتھ رکھا یہی وجہ تھی کہ سید اعجاز حسین کی ولادت اپنی ناسخیاں میں ہوئی۔ انھوں نے خود لکھا ہے کہ سال کا یقین نہیں ۱۸۹۸ء یا ۱۸۹۹ء تھا، لیکن مہینہ یقیناً اگست کا تھا، اور جمعہ کا دن، وقت صبح صادق تھا۔ بعد کو انھوں نے یوم آزادی کی مناسبت سے اسے ۱۵ اگست بنا لیا تھا؛ ظاہر ہے، کہ یہ فرضی تاریخ ہے۔ اور لطیفہ یہ ہے کہ ۱۵ اگست ۱۸۹۸ء کو جمعہ تھا نہ ۱۵ اگست ۱۸۹۹ء کو۔

سید حسین اپنے زمانے کے رئیسوں کی جملہ خوبیوں اور خامیوں سے منہمک تھے۔ شعر بھی کہتے تھے۔ نوق مختص کرتے تھے۔ بیک واسطہ ان کا سلسلہ تلمذ آتش سے ملتا ہے۔ وہ فارسی اور عربی کے دلدادہ تھے؛ اور انگریزی کے مخالف کسی

قسم کا کام کاج کرنا دونوں مرحلہ سمجھتے تھے۔ آمدنی کا اور کوئی ذریعہ نہ تھا اندرون ختے سے سب اثاثہ پورے ہو رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح تو قارون کا خزانہ بھی ساتھ نہیں دے سکتا نتیجہ وہی ہوا جس کی کوئی بھی عقلمند پیش گوئی کر سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ حالت اتنی کمزور ہو گئی کہ گھر کا اُجلا خرچ تک چلانا دوسرے ہو گیا۔ کہاں کہیں روپے کی وہ بیل سیل تھی، اور کہاں اب آمدنی گھٹنے گھٹنے ۲۰-۲۵ روپے ماہانہ رہ گئی۔

سید اعجاز حسین کی تعلیمی رفتار بہت مست رہی۔ گھر کے ماحول کے باعث انہیں اردو ادفارسی شعر سے تو ضرور دلچسپی پیدا ہو گئی، بلکہ جلد ہی خود بھی تنگ بندی کرنے لگے، لیکن ریاضی اور اقلیدس سے ان کی جان جاتی تھی، اور دسویں درجے کی سند کے امتحان کے لیے یہ لازمی مضمون تھے۔ چنانچہ دوسرا کامی کے بعد انہوں نے سکول کی راہ لی، جہاں یونیورسٹی میں ریاضیات کا معیار نسبتاً کم تھا اور اسی لیے یہاں سے وہ ۱۹۱۹ء میں دسویں درجے کی سند لینے میں کامیاب ہو گئے۔ اس وقت عمر عزیز ۲۰ برس سے متجاوز ہو چکی تھی۔

اس کے بعد انہوں نے میونسٹریل کالج، الہ آباد میں داخلے لیا۔ سائٹ میں بھی ایک مرتبہ لیل ہوئی، لیکن لگے رہے۔ آخر کار مسلم یونیورسٹی سے انٹر اور ۱۹۲۳ء میں میونسٹریل کالج سے بی اے کی سند لی۔ اسی دوران میں انگریزوں کو اردو پڑھنا تھا اور اپنے خرچ کی کفالت کرنے رہے، چونکہ اب سرکاری ملازمت کے لیے عمر زیادہ ہو چکی تھی، اس لیے انہوں نے یونیورسٹی میں ایم اے (اردو) میں داخلے لے لیا۔ اور ۱۹۲۴ء میں اس شان سے یہ امتحان پاس کیا کہ اول درجے میں یونیورسٹی بھر میں اول آئے۔ اور سو روپے ماہانہ کالسیسج اسکا رشیپ بھی ملا۔ جس سے مستقل آمدنی کی صورت پیدا ہو گئی اور شولیش کچھ کم ہوتی۔ پھر جب ۱۹۲۶ء میں وہیں اردو کے مدرس کی جگہ نئی تو اس پر ان کا تقرر ہو گیا۔

اب یہ ہر طرح مطمئن اور پرسکون زندگی گزارنے کی شاہراہ پر گھڑے تھے۔ اس میں اگر

افسوس کا کوئی پہلو تھا، تو یہ کہ ان کے وہ نانا (سیّد حسین) جنہوں نے انہیں پالا پوسا پہرہ والے  
چڑھایا، پڑھایا لکھایا، ان کے کرام کی خاطر خود ہر طرح کی تکلیفیں جھیلیں، ان کے ملازم  
ہونے (۴ اگست ۱۹۲۹ء) سے پانچ مہینے پہلے (۲۱ مارچ ۱۹۲۹ء) حلت فرما چکے  
تھے۔ انہیں اپنے چیمپے نواسے کی کامیابی دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔

سیّد تاج الدہیر رحم (ف: ستمبر ۱۹۴۳ء) نے اپنے بعض بھتیجاں احباب کے تعاون سے  
۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی تھی۔ انہوں نے اس کے قیام اور  
ادراستحکام کے لیے ملک کا دورہ کیا اور جگہ جگہ اس کی شاخیں قائم کیں۔ ۱۹۳۷ء  
میں انہوں نے الہ آباد میں مستقل حکومت اختیار کر لی۔ اسی زمانے میں ان کے بعض اور  
ادیب دوست بھی یہیں مقیم تھے۔ ان میں ڈاکٹر ڈیڑا، اے احمد (ذہن العابدین احمد)  
موجودہ رکن راجیہ سبھا، کوثر محمد اشرف اور پروفیسر احمد علی کے نام زیادہ نمایاں  
ہیں۔ اس اجتماع کا تیسرہ نمٹا کہ الہ آباد میں بھی انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ  
قائم ہو گئی۔ جلسے ہونے لگے جہاں بحث مباحثے ہوتے، اور یوں شہر کے ادبی حلقوں  
میں گویا زندگی کی تازہ لہر دوڑ گئی۔ میزاج خاص بھی اسی بھنور میں پہنچ گئے، بلکہ انہیں  
کے کمتر بنا دیے گئے۔ ان کی کتاب "نئے ادبی رجحانات" اسی ماحول میں لکھی  
گئی تھی۔

۱۹۳۸ء میں ایم اے کی سند لینے کے بعد انہوں نے پی ایچ ڈی کے لیے رینجر میں داخل  
ہے لیا تھا۔ موضوع مقالہ تھا: "اردو شاعری پر تصوف کا اثر" لیکن خدا مظلوم  
کہوں، مقالہ پیش نہیں کیا۔ بہر حال وہ ڈاکٹریٹ کی سند کے بغیر ہی کام کرتے رہے۔  
دس بارہ برس بعد انہوں نے ڈی لٹ کی سند لینے کی سٹاف میں اور مقالہ بعنوان  
"مذہب و شاعری" تیار کیا، ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں میں اردو موضوع  
پر ڈی لٹ کی سند لینے والے وہ پہلے شخص تھے۔

ڈاکٹر اعجاز حسین یونیورسٹی میں بحیثیت لیکچرر ۱۹۲۹ء میں آئے تھے۔ وہ مدتوں

اسی عہدے پر رہے، پھر ریڈ مقرر ہوئے اور بالآخر پانچ چھ برس پر و فیس رہنے کے بعد یکم مئی ۱۹۶۱ء کو ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ اس کے بعد پورنورسٹی گرانٹس کمیشن کی طرف سے انھیں پانسو روپیہ مہینہ کا تحقیقی وظیفہ عطا ہوا اور وہ شاعری کا سماجی پس منظر "اسی وظیفہ کا قیمتی نتیجہ ہے۔

اگرچہ صحت عام طور پر اچھی رہی، لیکن عمر کے ساتھ ضعفِ قواء تھمتی عمل ہے، جس سے مغز نہیں۔ ۱۸ فروری ۱۹۷۵ء کو ایک طالب علم کے پی ایچ، ڈی کے امتحان کے سلسلے میں منظر پر (دبھار) گئے تھے، وہیں دل کا شدید دورہ پڑا۔ علاج معالجہ ہوا، لیکن بیسود۔ یوں اپنے اعزہ اور خاندان سے دور پریس میں انوار ۲۳ فروری ۱۹۷۵ء کو جان بحق ہو گئے۔ لاش الہ آباد آئی اور شوکت نگر کے نواح میں سرستی گھاٹ کے قریب، اپنے ناصیالی قبرستان میں دفن ہوئے۔ ان کی مندرجہ ذیل کتابیں رشائع ہو چکی ہیں: (۱۶) آئینہ معرفت؛ (۱۷) مختصر تاریخ ادب اردو (۳) نئے ادبی رجحانات (۱۹۴۶ء)؛ (۴) مذہب و شاعری؛ (۵) ملک ادب کے شاہزادے؛ (۶) اردو ادب آزادی کے بعد؛ (۷) ادب و ادیب؛ (۸) حیاتِ سیدنا حضرت سید طاہر سیف الدین مرحوم؛ (۹) ادبی ڈولے؛ (۱۰) میری دنیا (۱۹۶۵ء)؛ (۱۱) اردو شاعری کہانی پس منظر وغیرہ۔ ان کے علاوہ کچھ کتابیں ہندی میں بھی ہیں۔

وہ ابھی طالب علم تھے جب ان کے نانے انھیں روز افزوں آوارگی اور تماشینی سے بچانے کی خاطر ۱۹۲۲ء میں ان کی شادی کر دی تھی۔ ان سے آٹھ بچے ہوئے: پانچ لڑکے اور تین لڑکیاں۔ مجددِ تعالیٰ سب خوش و خرم ہیں۔ جیسا کہ نگہ چکا ہوں، ان کے نانا مرحوم شعر کہتے تھے۔ گھر پر کتابوں کا مستقل ذخیرہ تھا۔ آغاز میں ماحول بھی رنگین اور شعر انگریز تھا۔ اسی لیے وہ بہت اوائل عمر میں شعر کہنے لگے، تخلص اجماز تھا۔ بہت دن تک نانا تابی سے اصلاح لی، لیکن جب وہ بصارت سے محروم ہو گئے، تھانوں نے اپنے میور سنٹرل کالج کے

اسسٹنٹ پروفیسر (عربی و فارسی) شیخ مہدی حسن نامہری کا واسن سقما۔ ان کی ادبی تربیت میں شیخ صاحب المصوف کا بہت ہاتھ تھا۔ دیوان آج تک شائع نہیں ہوا۔ بطور نمونہ چند شعر ملاحظہ ہوں، جو ان کی بیاض سے حاصل کیے گئے ہیں۔

جلد بول نے فشر غم کو رگب جاں کر دیا  
درد کو اس طرح اپنایا کہ درماں کر دیا  
پیکر ہستی میں لک دھبہ سا تھا میرا وجود  
ذوقِ بینائی کے صدقے جس نے فناں کر دیا  
موج غم سے داد کیا ملتی، دلِ برباد کی  
میں نے خود، اجاز! ہر قطرے کو طوفاں کر دیا

سفر جات بھی ختم ہے، کہیں زندگی کا نشان نہیں  
ابھی اور تھم کے میں دیکھتا میرے بس ہیں عمر و خط نہیں  
میرے دل کی ہیں یہ کہانیاں جو بھر گئی ہیں یہاں وہاں  
یہ چین میں لالہ و گل نہیں، یہ فلک پہ بکشتاں نہیں  
نزدہ بنگوہ میں کہیں ملا، نہ حرم میں اس کا پتا چلا  
یہ اب احترافِ شکست ہے، یہ جس نہیں، یہ اذل نہیں  
دل و جاں کے بدلے میں کیا ملا، یہ سوال اہلِ ہوس سے کر  
کہ میرا عشق عالمِ کینہ ہے، یہ دیار سود و زیاں نہیں  
میرے لڑے دل کو نو یکھے کر یہ بختے بختے بنا ہے دل  
میری عمر بھر کا ریاخ ہے جو یہ آشنا نے فناں نہیں

خدا ہی جانے، اب اس دل کا حال کیا ہوگا  
کہ اس غریب کو مرنے کی بھی خوشی نہ رہی



بہا پسئی، کہاں کی خزاں، خدا جانے  
 خیالِ دید میں کچھ فسکوۂ ندگی نہ رہی  
 ہمیں بحد ملائک نے یوں کیا برباد  
 کہ بزمِ خاص میں کچھ قدر بندھی نہ رہی  
 غمِ دوداں پہنچ آیا غمِ جاناں کے قریب  
 آخر آہی گیا آگاہِ مہِ تاباں کے قریب  
 یہ تیری یاد ہے، یا دردِ محبت کی غلغل  
 اک کسک ہوتی ہے رہ کے رگِ جاں قریب  
 اب حیواں نے کیا، زوقِ فنا سے محروم  
 ورنہ یہ خطر بھی ہوتے کہیں انساں کے قریب  
 ابھی ہے زخم کا احساس، فکروں مرہم ہے  
 ہنوز منزلِ اقل ہے، غم فقط غم ہے  
 قلعِ غم بھی نہ لٹ جائے اس اندھیرے میں  
 چراغِ راہِ محبت میں روشنی کم ہے  
 نہ کوئی ربط، نہ ترتیب، بزمِ انجم کی  
 مگر غزل کی طرح و نقش و منظر ہے  
 نہ لے سکا، نہ لیتا کسی کو روزِ ابد  
 مگر صحیفۂ عالم کا اک ورقِ کم ہے  
 خللِ دماغ کا ہویا سکونِ دل، اعجاز!  
 یہ عشق جو بھی ہو، وجہِ فیاضِ عالم ہے

• نکلا ہوں کالمنا تو پل بھر سے کم سمجھا  
 وودت مگر جا وداں ہو گئی ہے

کنڈ زمین تابہ افلا — پہنچی  
بلندی کی پستی بیاں ہو گئی ہے  
ہم نامرادی، ہمسہ ز ندر گافی  
مہبت بھی اک داستان ہو گئی ہے

اپنی بیگم کی ذنات پر جو ٹیپہ کہا تھا، اس کا پہلا بند ہے،  
یا دایا ہے کہ حب سوداے بیش و کم نہ تھا  
و امن عہد جوانی آنسوؤں سے خم نہ تھا  
عالم شعر و شباب و مجمع احباب میں  
زندگی کا راستہ سیدھا تھا، بیخ و خم نہ تھا  
ذہن کی تکمیل ان ہاستوں میں تھی، جن کے لیے  
کاسۂ علم و ہنر بھی جامِ جم سے کم نہ تھا  
گردشِ آیام کی اس چلچلاتی دھوپ میں  
کاروانِ شوق لطفِ اندوز تھا، برہم نہ تھا  
تلخی حالات بن جاتی تھی، پیغامِ حیات  
راہ کا پتھر عسے موسوی سے کم نہ تھا  
اس قضاے جانفزا میں ایک تبدیلی ہوتی  
چادرِ یکسانیت پر چرم گیا رنگِ ردائی

## شفقت کاظمی، سید فضل الحسن

یہ خاندان اہل تشیع کے امام ثامن حضرت امام رضا علیہ السلام کا نام لیا تھا جب ۱۲۱۲ھ میں امام رضا کا انتقال ہو گیا، تو ان کے خلاف عراقی نے کھل بھڑے ہوئے جسے جہاں جگہ ملی، اس نے وہاں پناہ لی شفقت کے اسلاف بھی کابل، خراسان سے ہوتے ہوئے آکر شمال مغربی سرحدی صوبے میں بس گئے۔ یہاں ان کا قیام مدتوں مختلف مقامات پر رہا۔ ایک زمانہ بعد پیر ایک شاخ نے وہاں سے بھی نقل مکان کیا، اور آکر ڈیرہ غازی خان (قدیم) میں رشتہ سفر مکمل دیا۔

جناب فضل الحسن شفقت نے اپنے نام کے ساتھ کاظمی کی نسبت حضرت امام رضا کے والد حضرت موسیٰ کاظم (امام ہفتم) کے باعث اضافہ کی تھی۔ بلکہ وہ کاظمی کبھی کبھی بطور تخلص بھی استعمال کرتے رہے۔ ۱۳۵۵ فروری ۱۹۱۱ء کو ڈیرہ غازی خان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سید علی تھا۔ سید جزو علم ہے، وہ پولیس میں ملازم تھے اور آخر تک ہی تکے سے منسلک رہے۔ لطیفہ یہ ہے کہ بہت کم لوگوں کو معلوم

سے قدیم اس لیے کہ موجودہ شہر نیا ہے۔ پرانا شہر دریائے سندھ کے ۱۹۰۰ء کے سیلاب عظیم کی نذر ہو گیا۔ یہ شہر اس کے بعد وجود میں آیا۔ پُرانے شہر کی نشانی چھاؤنی رہ گئی تھی، دریا کے رخ سے اندیشہ ہے کہ یہ بھی اب کچھ ہی دن کی مہمان ہے۔

سنا کہ وہ پولیس میں ہیں۔ مگر سے اپنے روزمرہ کے معمولی کپڑوں میں سناٹے جاتے اور وہاں پہنچ کر وردی پہن لیتے۔ کام کے بعد سے وہیں چھوڑ آتے اور اپنے ذاتی لباس میں مکان پر آ جاتے۔ بغیر منٹش اور مرخان سرخج آدمی تھے۔ محرم کی مجلسوں میں بڑے فوجی و شوقی سے شرکت کرتے، اور بعض اوقات اس کے لیے خاص واپسی مسافت طے کرنے جاتے۔ ۱۹۴۵ء میں انتقال ہوا۔ اور کربلا سے قبرستان عالمی والا ڈیرہ غازی خان میں دفن ہوئے۔

شفقت صاحب نے دسویں درجے تک تعلیم پائی۔ اسکول میں جو کچھ پڑھا وہ اپنی جگہ۔ لیکن اس کے علاوہ انھوں نے ذاتی طور پر اردو اور فارسی ادب کا اور اس میں بھی شعرا کا مطالعہ خاص طور پر کیا۔ انھیں بیشتر شعرا دیکھنے آجمن سے نہ صرف شعر گوئی میں مدد ملی، بلکہ وہ علمی اور ادبی مجلسوں کی بھی گویا جان بن گئے۔

اپنی کچھ پرکسی اچھی ملازمت کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔ بارے، مگر میں قناعت اور توکل کا ماحول تھا۔ والد کی پنشن ۱۲-۱۳ روپے مہینہ تھی۔ ان کی والدہ کڑھائی کا کام بہت اچھا جانتی تھیں۔ اڑوس پڑوس کی ہوتی تھیں انھیں کپڑے کڑھائی کے لیے ترقی دیتی تھیں۔ اس طرح بسر اوقات ہو جاتی تھی۔ بہر حال تنگ دستی کا زمانہ تھا۔ اب شفقت نے مقامی انڈسٹریل سکول میں داخلہ لے لیا۔ اور وہاں بڑھتی کا کام، خاص کر فرنیچر بنانا سیکھ لیا اور اس طرح جیسے میں پندرہ بیس روپے کی یافت کا سامان ہو گیا۔

اسی زمانے میں وہ مرگی کے موزی مرض میں مبتلا ہو گئے۔ مدتوں اس کے دورے پڑتے رہے۔ مگر زمانہ وار دوش سے کوئی بارہ برس بعد اس سے چھٹکا راطلا۔ لیکن اس کا آخر زبان کی غلیف ہی لگنت کی شکل میں آخر تک سدا دہ "را" اور "ڑ" طیک طرح سے نہیں آدا کر سکتے تھے۔

اب وہ مقامی میونسپل کمیٹی میں چیر اسی مقرر ہو گئے۔ سب افسران کے کام سے بہت مطمئن تھے۔ چونکہ یہ لکھنا پڑھنا جانتے تھے، اس لیے انھیں ترقی دے کر محترمہ چنگی

بنادیا گیا۔ جب ملک تقسیم ہوا ہے، تو اس کے بعد وہ ریکارڈ کیس مقرر ہو گئے اور اسی جگہ سے سبکدوش ہوئے۔ اپنی معمولی تنخواہ کے علاوہ انھیں کمیٹی کے تمام اجلاسوں کی کارروائی تکمیل کرنے کا خاص وظیفہ تیس روپے مہینہ الگ ملتا تھا۔ تنخواہ کے ساتھ اسے ملازمتی ترشش سے بسراوقات ہو جاتی تھی۔ آخری ایام میں انھیں ایک افسوسناک تجربہ ہوا۔ کمیٹی کے نئے منتظم ایک ایسے شخص مقرر ہو کر آئے، جو ان سے ہر کسی بات پر ناراض ہو گئے۔ انھوں نے جاوید بچا انھیں دتی کرنا شروع کیا۔ بات بات پر ڈانٹ ڈپٹ اور دھمکی ان کا معمولی وطیرہ ہو گیا، اور بالآخر اس شخص نے ان کی تنخواہ میں سالانہ اضافہ بند کر دیا۔ خفقت نے محسوس کر لیا کہ اب خود داری کا خون کیے بغیر یہاں رہنا ممکن نہیں۔ اس پر انھوں نے مقررہ میعاد سے تین سال قبل پنشن کی درخواست دے دی اور نوکری سے الگ ہو گئے۔

خفقت نے شعر گوئی بعمر ۱۸ سال ۱۹۳۳ء میں شروع کی۔ ابتدائی مشق کے بعد انھوں نے مولانا حسرت سہابی (ف: مئی ۱۹۵۱ء) سے درخواست کی کہ انھیں شاعری میں قبول کر لیں۔ نچانے کیوں، انھوں نے یہ درخواست منظور نہ کی اس پر انھوں نے پہلے فیض احمد فیض جعفری سے رجوع کیا۔ ندیم ڈیرہ غازی خان ہی کے رہنے والے ہیں ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ عمر سب کو آپرٹو ٹھکے میں ملازم رہے۔ افسر صدیقی اور دہوی کے شاگرد ہیں۔ ایک مجموعہ کلام ”غائۃ زخیر“ شائع ہو چکا ہے۔ بفضلہ بقید حیات ہیں۔

خفقت نے ندیم کے علاوہ صادق اویسی (حاجی محمد) سے بھی مشورہ کیا تھا صادق ۱۹۰۸ء میں ڈیرہ غازی خان میں پیدا ہوئے۔ شعر خاصا کہہ لیتے تھے۔ لیکن ان کا اصلی کام افسانے کے میدان میں ہے۔ انھوں نے ”اگر بڑی سے یو پ کا مختلف زبانوں کے بلا مبالغہ بیسیوں افسانوں“ تہ کیا۔ میاں بشیر احمد دہیرہ ہاویں (ان کے بڑے قدر دان تھے) چنانچہ صادق کے دونوں افسانے ہمایوں میں شائع ہوئے۔ معلوم نہیں کیوں، انھوں نے ۱۹۳۲ء میں ادبی میدان ترک کر دیا۔ اور خفقت

نویسی کا پیشہ اختیار کیا۔ قانون کی پیپیڈ رگیوں کو خوب سمجھتے تھے۔ اس پیشے میں بہت کمایا اور خوشحال زندگی بسر کی۔ ۱۹۷۳ء میں انتقال ہوا۔

شفقت نے چار برس کی مشق کے بعد ۱۹۴۰ء میں دوبارہ حسرت سے اصلاح کی خواہش ظاہر کی۔ اس کے اسخیں کامیابی ہوئی، اور حسرت نے ان کی درخواست منظور کر لی۔ حسرت کی وفات تک وہ ان سے مشورہ کرتے رہے اس کے بعد ہمیشہ اپنے نام کے ساتھ خاک پائے حسرت ہو جانی لکھتے رہے۔

شفقت شروع میں نظم اور غزل دونوں کہتے تھے۔ لیکن حسرت کی شاگردی کے بعد غزل کے لیے وقف ہو کر رہ گئے۔ ان کے کسی مجموعے شائع ہوئے۔ بالکل ابتدائی کلام ان کے دو کتبوں نے "نغمۂ تابعدار" کے نام سے چھاپا تھا۔ یہ نو دیکھنے کو نہیں ملا۔ بعد کے مجموعے، حسرتکدہ (منظر گر طبع ۱۹۵۸ء) نغمۂ حسرت (منظر گر طبع ۱۹۵۹ء) و ادب حسرت (لاہور ۱۹۷۰ء) تاریخ حسرت ملتے ہیں۔ بہت پختہ کلام ہے۔ غزل کی تمام خصوصیات ان کے کلام میں بدرجہء وافر ملتی ہیں۔

ابتدائی سیرِ انجالی کے باعث صحت ہمیشہ خراب رہی، ۱۹۶۱ء/ ۱۹۶۲ء میں ذیابیطس کا گھلا دینے والا عارضہ لاحق ہو گیا اور آخر تک وبالِ جاں رہا۔ جون ۱۹۶۳ء میں دل کے مریض میں مبتلا ہو گئے۔ جیسے یہ تمام عوارض کافی نہ ہوں، اواخر ۱۹۷۳ء میں جسم کے باقی حصے کو فالج نے بیکار کر دیا اور وہ مستقلاً صاحبِ فراش ہو گئے۔ حکومت نے توجہ کی اور اسخیں علاج کے لیے مقامی اسپتال میں لے گئے۔ وہیں مددِ جی ۱۹۷۵ء کو فالج کا ذہنی طرف حملہ ہوا، جس سے سہوش ہو گئے۔ اسی حالتِ خشی میں ۱۲ مارچ ۱۹۷۵ء کو ظہر کے وقت روحِ نقیضِ عنقریب سے پروا کر گئی۔ چونکہ یہ ۲۸ رجب تھی، اس لیے اسے مبارک خیال کرتے ہوئے اسی شام اسخیں اپنے والد کے جوار میں (دکنے ٹالسی والا میں) سپردِ خاک کر دیا گیا۔

کئی اصحاب نے قطعاتِ تاریخ کہے۔ سید خدا بخاری نے "مرگِ دلخراش" سے تاریخ نکالی (۱۳۹۵ھ) عیسوی تاریخ میں سید چراغ علی شاہ آزاد نے یہ قطعہ

لکھا ۱۔

توڑی گردنوں نے ہم پہ یہ کیا جفا ہاں ہے ! سینہ اپنا ہے ، اور ترکش قضا ہاں ہے !  
 اٹھ گئی رسم اخلاص دل زلمے سے بھو گئی شمع فضا نہ و غا ، ہاں ہے !  
 شاعر بے بدل ، قادر الکلام ادیب ! نغمہ نگار ، سخن سرا ، ہاں ہے !  
 تاجدار غزل ، سخا بشیوہ حسرت ہر سدا خود کو سمجھا وہ غاکپا ، ہاں ہے !  
 فکر تاریخ پر آتی یہ ندا ، آزاد !

شید شغقت کاظمی جیلا ، ہاں ہے " (۱۹۷۵ء)

شغقت کی شادی اپنے چچا سید جند و شاہ کی بیٹی سکینہ بی بی سے ہوئی تھی سید  
 جند و شاہ پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر تھے۔ رتوں حکومت کی ملازمت کی۔ بس سے  
 سبکدوش ہوئے ، تو اپنا مطب جاری کر دیا۔ اس سے اچھی خاصی آمدنی تھی کامرام۔  
 اسی ایش کی زندگی گزری۔ شغقت کی جسمانی اولاد صرف ایک لڑکا غنیب الحسن  
 رضوی ان سے یادگار ہے۔ انھوں نے بی بی سے تنگ تعلیم پائی ہے۔

کافی ہے اپنے رفیع ترود کے واسطے

ان کی نہیں بھی عرض و فاکے جواب میں

ہزار ہو سکے نہ تری آرزو سے ہم

سختی شانِ اخلاص جو ترے اجتناب میں

دلیچیاں بہت اول مرحوم ! تجھ سے سختیں

جب تو نہیں ، تو رونقِ بزمِ جہلی نہیں

تجھ سے بچ کر کے ، سب کی نظر میں ذلیل میں

تو مہرباں نہیں ، تو کوئی مہرباں نہیں

مفتد میں لکھی سخی با ہم جدائی نہ تم یہو فاقہ ، نہ ہم یہو فاقہ

بہر وہی گئے دن زندگی کے تجھے کیا ، مٹا دیا ناشار حتمی ہم

اسباب اور سبب مری بربادیوں کے تھے  
 کیا جانے کیوں زبان پر ترا نام آگیا  
 بات جب بڑھ گئی، تو کیا کرتے تھے ہم کو یا رائے اختصار نہ تھا  
 بڑے مزے میں گزرتی تھی زندگی شفقت !  
 خوشا وہ عہد کہ ان سے نہ تھی مشناسا  
 سرگزشتِ حیات کیا کہنے ! خیر، ابھی بُری گزر رہی تھی  
 بات اپنی وفا کی جھوٹ نکلی آخر میں تری جفا سے ہمارا  
 بیکوں رو عین وہ تری دشمنی کو جن کو تری دوستی نے مارا  
 کھراور بھی آسے تھے، لیکن جب وقت پڑا، تجھے پکارا  
 تری نگاہ تو اپنی تھی بے سبب بھڑپڑ یہاں وہ بات ہے کہ بھڑ کو فریب کھانا تھا  
 ایفلے عہد کرنے سکے وہ، تو کیا ہوا  
 خود اپنی زندگی کو سبھی ممکن تھا ثبات  
 باغ پر اپنا بھی کچھ حق تھا، مگر باغ میں جب تک نہ آئی تھی بہار  
 خوش ہو کے سہ رہا ہوں تری ہچکا ہنوز  
 ثابت نہیں اگرچہ کچھ اپنی خطا ہنوز  
 وہ ایک دور وہ جس نے بنا دی ہے جان پر  
 وہ ایک دور وہ جس سے پیار ہے آج تک  
 گزری ہے نفس میں غریبیں سبھلے نہیں یادِ اشیاں ہم  
 کچھ بس نہ چلا تری جفا پر دیکھا کیے سوئے آسماں ہم  
 اپنی قسمت تھا داغِ رسوائی کیا کریں اب تجھے ہشیاں ہم !  
 سب کا مقصود ذکر تھا تیرا جتنے تھے تھے سنائے ہیں  
 کیا ختم سفر پر یاد کرتے گزریں جو مصیبتیں سفر میں  
 ہر ماہ سے بے نیاز ہو کر لوٹ آئے ہیں تیری نگاہ میں



علم ڈھائیگی، کہاں تک دنیا! کہیں اپنا بھی خدا ہے کہ نہیں؟  
جن کو تیری نگاہ بھول گئی اب کوئی ان کو پوچھتا بھی نہیں

تھکا دیا ہے زمانے کی گردشوں نے بہت  
تیری نگلی میں اجازت ملے، تو دم لے لوں  
زمانہ دیکھ چکا ہے مری و فسا کا مال  
کسی پہ اب نہ چلیگا تیری نظر کا فسوں

جب سزا وار غم بھی نہ سمجھ گئے ہم کریں اور امید کیا آپ سے!  
آج حیراں ہیں یوں، آپ سے مل کے ہم جیسے اب تک نہ تھے آشنا آپ سے  
اس نہاں سے ترا گلا کیوں ہوا جس زباں سے تیری ثنا کی ہو  
رو دھو کے یہ سال بھی گزرا آپ کے بھی پھرے نہ دن ہمارے  
خود ہی ان تک جا پہنچے ہم قاصد سے کہہ گئے کہتے

تیری اولیٰ کرم، لاکھ دلفریب سہی  
مگر وہ دل جو تیری بے رخی پہ مڑتا ہے

جب اٹھ کے آگئے ہیں، تو اب اس سے کیا غرض

ہم بھی کبھی تھے آپ کی مفل میں، یا نہ تھے  
کیا کیا ہوا ہے ترکِ محبت پہ انفعال  
آتی ہے تیری یاد جو سہرنا گہاں لہجے

جیسے ہی ہوس وہ کیا کر چکا مرنے کو بھی جو ترس رہا ہے

جغائے خاص کے لائق بھی کو ٹھیرایا  
اب اور اس کے سوا کیا کرے وفا کوئی!  
کسے خبر کہ حدیثِ جہاں کے پردے میں  
خود اپنے غم کا فسانہ سنا گیا کوئی

ایسے نکلے تری انجن سے کہ ہم عمر سجر کے لینے بے ٹھکانا ہوتے  
 جو ربیجا کے لائق تو سمجھا ہمیں  
 اتنی امید بھی تھی کہاں آپ سے  
 یاد کرنے پر بھی یاد آتا نہیں  
 کس گھڑی ہم ملے تھے کہاں آپ سے  
 ان کا خیال، ان کا قصور ہے آج تک جن سے کہیں ملے، نہ کبھی جن سے بات کی  
 لگتا ہے یوں کہ جیسے ابھی دل کی دل میں ہے  
 حال آں کہ ان سے قصہ غم بار بار کہتا

---

## شیم کرمانی، شمس الدین حیدر

اگرچہ اعظم غرہ دیوبند کا قصبہ کرمان آبادی وطن ستھا لیکن ان کی ولادت ۸ جون ۱۹۱۳ء (۲ رجب ۱۳۳۱ھ) کو اپنی ناخیاں پارہ ضلع غازی پور میں ہوئی۔ کرمان کے سادات حضرت شمس الدین عرف میرٹھی (ف، ۱۰۶۰ھ) کے نام سے وابستہ ہیں۔ شمس کا اپنے زمانے کے مشہور صوفیہ اور اہل اللہ میں شمار ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں سات حج پیادہ پا کیے تھے۔ اس ملاقات میں ان کی کرامات کے وسیوں قصبے زبانِ روح خاص و عام ہیں۔ اسی لیے جب یہ پیدا ہوئے، تو ان کے والد سید محمد اختر نے بطور نفاذ ان کا نام شمس الدین حیدر رکھا، گھر میں پیار کا نام شمسو ستھا۔ ان سے عین بڑے بھائی تھے، علی بخش غفصنف، اعظم حسین، حسام الدین حیدر۔ ایک بھائی علی حیدر، اور ایک بہن نرہیں خاتون ان سے چھوٹے تھے۔

جب تعلیم کی عمر کو پہنچے، تو اس زمانے کے دستور کے مطابق بسم اللہ گھر پر ہوئی جب یہ مرحلہ طے ہو گیا، تو انھیں بڑے بھائی سید علی بخش غفصنف کے پاس گورکھ پور بھیج دیا گیا، جو وہاں ملازم تھے۔ وہاں کچھ پڑھا لکھا ہو گا۔ لیکن گورکھ پور کا قیام بہت مختصر رہا، جلد ہی وہاں سے واپس آکر انھوں نے شریعت عربی اسکول فیض آباد میں داخلہ لے لیا۔ اس مدرسے میں دینیات کی رسمی تعلیم کے علاوہ عربی اور فارسی پڑھانے کا خاص انتظام تھا۔ چنانچہ یہاں انھوں نے عربی اور فارسی

کی تعلیم پائی اور اسی سے یونیورسٹی کے مولوی اور کامل کے امتحان بھی پاس کیے۔ اس زمانے میں انھوں نے انگریزی نہیں پڑھی۔ یہ کمی انھوں نے بہت دن بعد پوری کی۔ پہلے دسویں کی سند حاصل کی اور پھر انٹر کی۔ اپنی منصبی مسودہ فیتوں کے باعث بی اے کے امتحان کی تیاری نہ کر سکے، اور اس کمی کا احساس انھیں آخر تک رہا۔

دہلی عربی اسکول سے فارغ ہونے کے بعد انھوں نے ڈی اے وی ہائی اسکول اعظم گڑھ میں ملازمت اختیار کر لی۔ یہاں وہ فارسی اور اردو پڑھاتے تھے۔ مقررہ تنخواہ تلیل تھی، اور جو کچھ واقعی ملتا تھا کوہ قلیل تر تھا، اور ستم یہ کہ اس کی بھی مدت پر ادائی ہمیشہ غیر یقینی رہتی۔ یہ صورت حال کسی عنوان الطینان بخش نہیں تھی۔ بالآخر انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ مدنی کو غیر باد کہ کر کوئی اور پیشہ اختیار کیا جائے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ہندوستان کی صنعت و فلسافتی روز افزوں ترقی کر رہی تھی اور ہمارے بیشتر شاعر اور ادیب اس سے منسلک ہو گئے تھے۔ سب اعظم گڑھ کے قیام کے زمانے میں ان کا تعارف ماسٹر سید منور حسین رضوی سے ہو گیا، جو وہاں کے سماجی حلقوں میں خاصی معروف اور ذی اثر شخصیت تھے۔ سید منور حسین کے ایک بھائی سید شوکت حسین رضوی فطین بناتے تھے، مشہور ملکہ ترنم نور جہان ان کی بیوی تھیں۔ سید شوکت حسین نے شمیم کو مشورہ دیا کہ وہ ان کے ساتھ لاہور چلیں، اور نچولی کچرزی فلموں کے لیے گانے لکھیں۔ یہ مدنی سے اند تلیل آمدنی سے تنگ تو آہی چکے تھے؛ کچھ ان ادیبوں کی اچھی اوقات ان کا سامنے تھی، جنھوں نے فلم کی ماہ اختیاری تھی، کچھ سید شوکت حسین نے بھی سبز باغ دکھاتے، انھوں نے لاہور جانے پر آمادگی کا اظہار کر دیا۔

وہ لاہور پہنچے، اپنی فلموں کے لیے گانے لکھے۔ اپنے مخصوص خاندانی ماحول کے زیر اثر وہ موسیقی پہلے سے جانتے تھے اور اس کے بنیادی اصول سے انھیں اچھی

واقفیت تھی، غلوں کے لیے یہ علم بہت مفید ثابت ہوا۔ بلکہ اس میں اور گہرائی پیدا ہو گئی، آواز بھی بہت اچھی تھی۔ یہ سب باتیں بعد کو مشاعرہ بازی کے دور میں بہت کار آمد ثابت ہوئیں۔ لیکن انھیں نظم کا خاص کاروباری ماحول اس نہ آیا، انھوں نے گھر کی زمینداری دیکھی تھی، اگر چہ ان تک آنے والے وہ رئیسانہ سخاوت باٹ سب ختم ہو چکا تھا، تاہم ابھی رستی کا بل نہیں گیا تھا، غرض کہ جلد ہی ان کا دل اچاٹ ہو گیا اور وہ واپس اعظم گڑھ چلے آئے۔

اعظم گڑھ میں اب ڈی لے وی اسکول کی وہ پہلی نوکری ان کی دسترس سے باہر تھی، کیونکہ ان کی غیر حاضری میں وہاں اور اختتام ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ اب ان پر وہی کی کشش غالب آنے لگی، جو اردو فارسی علوم کا بہتر مرکز تھا۔ انھوں نے بعض دوستوں سے اپنی خواہش کا اظہار کیا اور کوشش کرنے سے انھیں ۱۹۵۰ء میں اینگلو عربک ہارس سیکنڈری اسکول میں فارسی کیمونس کی جگہ مل گئی۔ وہ اپنی وفات کے وقت اسی ایسا ہی پرمشکن تھے۔

انھیں اختلاج قلب کا عارضہ بہت دن سے تھا، تو تم کے بھی شکار تھے، اسی باعث اکیلے سفر کرنے سے بالعموم اجتناب کرتے، کوئی نہ کوئی دوست یا ان کا اپنا بچہ ان کے ہمراہ جاتا۔ اس کے باوجود اس کا سان گمان بھی نہیں تھا کہ انجام اتنا قریب ہے۔ ۱۸ مارچ ۱۹۷۵ء شام کے وقت وہ ایک مقامی مشاعرے میں شریک ہوئے۔ وہیں طبیعت بگڑ گئی اور بیہوش ہو گئے۔ فوراً قریب کے اردن اسپتال میں پہنچا دیے گئے۔ مہینے پر تشخیص ہوئی کہ دماغ کی نس پھٹ گئی ہے۔

اگلے دن (۱۹ مارچ) صبح ساڑھے سات بجے بیہوشی کے عالم ہی میں جان بحق ہو گئے۔ جنازہ اسی مشام اٹھا اور ان کی خواہش کے مطابق جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ ان کا جنازہ ۲۰ جنوری ۱۹۷۵ء کو ننگرام کے میر حسن عسکری صاحب کی بڑی صاحبزادی کاظمی بیگم سے ہوا تھا۔ پرنسپل سر سید احتشام حسین (رحمہم) نے ان کے

ہزلف تھے۔ دونوں برادریں ایک ہی دن گئی تھیں۔ بڑی بہن شمیم کے عقد نکاح میں آئیں اور محمد بی بی شمس بانو، سید احتشام حسین کے شمیم نے تین صاحبزادے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ سید حسین اختر (عرف مراد) سید مابد اختر (عرف مہماد) اور سید باقر اختر (عرف سلمان)۔ ان ناموں میں اختر کا لاحقہ شمیم مرحوم کے والد سید محمد اختر کی نسبت سے ہے۔

ان کے گھر کا ماحول علمی اور ادبی تھا۔ والد شاعر تھے؛ اختر اچھا کا تخلص تھا۔ بڑے منجیلہ سبائی اعظم حسین کا تخلص اعظم تھا۔ حکیم زکی حسین اور ان کے دونوں چھوٹے سبائی سید احمد علی، محمد اور سید محمد علی راسب شاعر اور رشتے میں ان کے چچا ہوتے تھے۔ فرض ان کے چچن میں ان کے ارد گرد شاعری کا چرچا تھا۔ اس کا اثر بہنا ہی چاہیے تھا، یہ بھی کسی میاں گنگ ہندی کرنے لگے۔ خاندان کی مذہبی روایت کے باعث شروع میں سوز خوانی پر بھی توجہ رہی اور خود بھی سلام اور نوحے لکھتے رہے۔ بعد کو غزل اور نظم کو ترجیح دینے لگے۔ چندے آرزو لکھنوی (دف: اپریل ۱۹۵۵ء) سے اصلاح لی۔ لیکن چونکہ اس زمانے میں انی کارجمان نظم کی طرف زیادہ تھا، اس لیے آرزو سے استفادہ بہت محدود رہا۔

ان کی شاعری کا آغاز ہماری سیاسی تحریک کے متوازی رہا۔ اس دور میں ان پر جوش ملیح آبادی کا بہت اثر تھا۔ انھوں نے بھی سیاسی نظمیں لکھیں جن کا مجموعہ "بدکو" دشمن اندھیرا" کے عنوان سے چھپا۔ (۱۹۴۳ء) اس کا سارا خسر چ رفیع احمد قدوائی مرحوم (دف: اکتوبر ۱۹۵۳ء) نے اپنی جیب سے دیا تھا۔ ان کے بعض دوسرے شعری مجموعے یہ ہیں: برقی و باران (مطلوبات)، "عکس نگار" (لکھنؤ: ۱۹۶۳ء)، حرفِ نیم شب (دلی: ۱۹۶۲ء) جانِ برادر (دلی: ۱۹۶۳ء) پروفیسر احتشام حسین کامرشیہ، صبحِ فاران (دلی: ۱۹۶۲ء) انھوں نے پشتِ جواہر لال نہرو مرحوم (دف: مئی ۱۹۶۳ء) کی فرمائش پر عجب آزادی کی منظوم تاریخ "تلاشِ بحر" کے عنوان سے لکھنا شروع کی تھی۔ اس کے متعدد ابواب موقت اشیاء جراثیم

شائع ہوئے تھے، لیکن انیسویں صدی کے نظم نگاروں کی زندگی اور سلیقہ کا اس دور کے صفحہ اول موجود ہے۔

ان کا کلام بچہ پنہ اور لطیف ہے، اس لیے بجا طور پر ان کا اس دور کے صفحہ اول کے شعرا میں شمار ہوتا تھا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

برباد ہوئی لیکن، برابر باغ و غم دل ہوں \_\_\_\_\_ آنکھوں سے لگا لچر کو، اگر دردمنزل ہوں

جشنِ حیات ہو چکا، جشنِ ممات اور ہے

ایک برات آچکی، ایک برات اور ہے

ان کو شمیم! کس طرح نامہ آرزو لکھیں

لکھنے کی بات اور ہے، کہنے کی بات اور ہے

گرا احتجاج، نہ ٹوٹا تھا کوئی آئینہ \_\_\_\_\_ شکستِ دل کی سبھلا آپ کو خبر کیوں ہوا

کبھی نہ روٹنے والے بھی روٹ جاتے ہیں \_\_\_\_\_ یہ بات پیار میں ہوتی تو ہے، مگر کہوں ہوا

دل سے شمیم! گفتگو، دیکھیے کب تلک چلے

رات بھی مختصر نہیں، بات بھی مختصر نہیں

جو میکدے میں ہو جھگڑا، تو پہلے یہ دیکھو

کہ میکدے میں کہیں شیخِ دربر ہیں تو نہیں

بہشت سے بھی زیادہ حسین نظر آئی \_\_\_\_\_ وہ سرزمین جو مالی گناہِ آدم ہے

آدابِ جنوں مانگے، آئینِ وفا مانگے

کیا دل ہے کہ اک دنیا، دنیا سے جدا مانگے

اک جان طلب تم ہو، تم مل بھی نہیں سکتے

دنیا سے یہ دل آخر مانگے سہی تو کیا مانگے

دنیا کے اجالوں نے ٹوٹا ہے، شمیم! ایسا

دل بزمِ چراغاں میں، اندھی کی دعا مانگے

جہ تباہ و کربستم سہی ہے اک زخم کا نام \_\_\_\_\_ چاک ہے کس لیے انسان کا سینہ، نہ کہو

احساس انا کیا ہے، احساس وجود اپنا  
ہم کو نہ بچھڑا ہم سے، رہ جا بیٹھے ہم تنہا  
ہمیں بھی دیکھ کر شاید تجھے نہیں معلوم  
”جہاں نگر“ ہمہ عالم ہے ”خود نگر“ تنہا  
اب اپنے ساتھ مجھ کو غم زمانہ ہے  
چلے تھے جب تو غم دل تھا ہمسفر تنہا  
نہ جانے فریت اہل نظر پہ کیا گزرے  
زمانہ سنگ بگفت اور شیشہ گر تنہا  
ایسا نہ ہو کہ جوش جنوں تنہک کے بیٹھ جائے  
ہو تی رہے خود سے ملاقات گاہ گاہ

شگفتِ گل کا تبسم بھی حرفِ دلکش ہے مگر کہاں ترے اندازِ گفتگو کی طرح  
تمہاری بات نہیں تم تو با وفا سحر ہے گلے ان سے، جو ایفائے ہمدردی ہے  
رخِ جبین کا ماجرا، تم سے، شمیم! کیا کہیں!  
کوچہِ غیر سے نہیں، اپنی گلی سے آئے ہیں  
مجھے ہے مفہومِ نظر کا، دل کا اشارہ جانے ہے  
ہم تم چپ ہیں، لیکن دنیا حال ہمارا جانے ہے  
ہلکی ہوائ کے اک جھونکے میں، کیسے کیسے بھول گئے  
گلشن کے گل پوٹن نہ جانیں، گلشن سارا جانے ہے  
شمعِ نثار، پھیلے پر شک، درد کا آنسو میں ہی گئی  
شام کا تارا کیسے ڈوبا، صبح کا تارا جانے ہے  
کیا کیا ہیں آئینِ تماشا، کیا کیا ہیں آدابِ نظر  
چشمِ ہوس یہ سب کیا جانے، وہ تو نظارہ چاہے



اپنے شمیم رسوا کو تم جانو ہوا سب ان کوئی  
 بستی ساری بچا ہے، سحر اسارا جانے ہے  
 شمیم! عہدِ گزشتہ کی گفتگو نہ کرو وہ دن گئے، وہ محبت گئی، وہ بات گئی  
 سکون کی چمک پر گرتے ہوئے، دیکھا ہے شیخ و برہمن کو  
 پھر میرے کندہ کی قیمت کیا، جب دیر و حرم یک جاتے ہیں  
 جو کہ رہے ہیں کہ آنی نظر نہ منزلِ دوست  
 وہ لوگ جانبِ دیر و حرم گئے ہونگے  
 غمِ عشقِ دل کو بجھے، جو لٹا جاو وانی  
 توجہاتِ محقر کا غم بے ثبات کیا ہے  
 جو مذاقِ رنگ و بو ہو، تو دلوں کا بھید کیسا  
 کہیں موجِ گل نے پوچھا کہ صبا کی ذات کیا ہے؟  
 خاموش نہ تھا دل بھی خواہید نہ تھے ہم بھی  
 تنہا تو نہیں گزرا، تنہائی کا عالم بھی

## مانی ناگپوری، بشیر خان

ان کا خاندان مدد اصل جھوپال کا رہنے والا تھا، جہاں سے ان کے جدِ مرحوم امیر خان ۱۸۵۷ء کی شورش کے زمانے میں ترک وطن کر کے ناگپور چلے آئے، اور پھر وہیں کے ہو کے رہ گئے۔

امیر خان کے چار بیٹے تھے: کریم خان، منیر خان، فیض خان، بشیر خان، سب سے بڑے کریم خان ہی بشیر مانی کے والد تھے۔ کریم خان کی شادی ناگپور کے مشہور سپہ سالار گل میر خان کی دختر امتیاز بی سے ہوئی تھی۔ امتیاز بی اپنی ناسخیال کی طرف سے ایک نو مسلم گونڈ خاندان سے تھیں، جو گونڈ حکمرانوں کے یہاں ملازم تھے۔ بشیر خان سے بڑی ایک بہن حور خانم تھیں۔ ان کا منفرد انہ شباب میں انتقال ہو گیا۔ گویا اس کے بعد بشیر خان اپنے والدین کی اکلوتی اولاد رہ گئے۔

بشیر خان اپنی ناسخیال میں ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو پیدا ہوئے، جہاں ان کے والد کریم خان، خانہ داماد تھے۔ اپنے زمانے کی فارسی، عربی، اور اردو تعلیم کے علاوہ دسویں و سبجٹک انٹرمیڈی بھی پڑھی۔ والد کا انتقال ۱۹۲۶ء میں ہو گیا، جب یہ آٹھ برس کے تھے؛ والدہ ۱۹۳۸ء میں سدھاریں۔ ان کی ساری تعلیم و تربیت نانائی گرائی میں ہوئی۔ ان کا ۱۹۵۹ء میں انتقال ہوا، کہتے ہیں کہ اس وقت ان کی عمر ۴۰ سال کی تھی۔ والدہ اعظم بالعقوب -

بشیر خان شروع سے مخفی اور کمزور قوام کے ہونے کے باعث کسی محفل کے نام کے گوشہ میں تھے۔ لہذا عمر سب کے مستقل ملازمت نہیں کر سکے۔ چنانچہ ایک فریب کی پیشگاہ میں کی کان میں ٹکری کی؛ معلق کی؛ اور کچھ جگہوں پر بھی عارضی کام کرتے رہے۔ لیکن آخر تک کم و بیش پریشان حال ہی رہے۔

ضعف معده کے دائمی مریض تھے۔ پھر کچھ اور پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔ انہیں میں مبتلا ہو کر میوزیول اسپتال، ناگپور میں علاج کی خاطر داخل ہوئے۔ وہیں ہفتے کے دن ۲ مئی ۱۹۷۵ء کو ایک حقیقی کابلا وا آگیا۔ اور اگلے دن (۳ مئی) وہ پھر بعد مومن پورہ کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

ان کی شادی اپنے چچا میزخان کی صاحبزادی انوری خانم سے ۱۹۳۸ء میں ہوئی تھی۔ لبرل دو سال بعد بیوی کا زندگی کے ایام میں انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد دوسرا نکاح مرحومہ کی چھوٹی بہن طاہرہ خانم سے ہوا۔ اس نکاح کے بطن سے آٹھ بچے ہوئے: چار بیٹے اور چار بیٹیاں۔ ماشاء اللہ سب زندہ و سلامت موجود ہیں۔

امانی بھی اسکول کے آنری درجوں میں تھے کہ شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا۔ اس زمانے میں پر وقار منظور حسین شورا اور محمد حبیب اللہ خان غصنفرتلمیذہ شفیق امر دہوی (ف: ۱۹۳۲ء) وہیں ہائی اسکول اسکول، ناگپور میں فارسی اور اردو پڑھاتے تھے۔ شہر میں بھی مولانا ناطق گلڈوشوی (ف: مئی ۱۹۶۹ء) اور ان کے تلامذہ کی موجودگی کے باعث شعر کے لیے فضا سازگار تھی۔ امانی بھی شعر کہنے لگے۔ انہوں نے کوشش کی کہ اقبال، احمد خان سہیل، انجم گرامی (ف: نومبر ۱۹۷۵ء) انہیں اپنی شاگردی میں قبول کر لیں۔ لیکن مرموم نے کسی وجہ سے معذرت کر دی۔ اس کے بعد مانی نے کسی سے مشورہ نہیں کیا۔ طبیعت بھی عزت پسند اور نام و نمود سے متنفر تھی، اس لیے کسی کے دہر نہیں گئے۔

افسوس کہ مجموعہ کلام زندہ ہی نہ نکل سکا، اگرچہ اسے خود ہی صحیفہ مصنف کے نام سے مرتب کر لیا تھا۔ اس کا مسودہ ان کے خاندان میں موجود ہے۔ اسی سے چند شعر

نہونے کے علم پر درج کر رہا ہوں جو ان کے شاگرد عرفان تنوخی اور محمد عبدالعلیم (ناگپور) کی ہیرانی سے حاصل ہوتے ہیں:

میں اور گرفتاری بڑھ جاتی، تو اچھا تھا  
 شرم آتی ہے گھر جاتے، چھوٹے ہوئے زباناں سے  
 سفیدوں کا شرم میں خیال جیسے لڑ پڑے  
 جو بات ان کے دل میں ہے، وہی ہے میری آرزو  
 نوازش غم و دواں سبھی پہ یکساں ہے گناہگار کا دل ہو کر بیگناہ کا دل  
 تیر و سناں نگاہ کو باندھ گئے سخن طراز  
 چھٹا گئی ہے پھول سے زخم کھلے ہیں بات سے  
 کام کچھ گردش دواں سبھی نہ آئی، مانی ا  
 پھر کہیں لوٹ کے وہیل دہرا آتے ہیں  
 الہ دانش نہ سوار بیگے جہاں کو، یارب! کوئی دہرا نہ، اسی آب، اسی گل سے اشا  
 باد و مسجد گزارانِ حرم صفا بستہ  
 تیری پلکیں ہیں کہ حجاج کا کعبہ میں ہجوم  
 کتنے دل ہو گئے احساسِ گناہ سے خالی  
 حسن نے دیکھ لیا، جب بیگناہ معصوم  
 تبصرے لاکھ ہو گئے، خالی رُخ جانان پر  
 ایک نکتہ ہے کہ کھلتا نہیں جس کا مفہوم  
 گم کردہ کیوں ہیں خلاؤں میں، یہ عالم کو کے دیوانے  
 مانی ایسی اپنی دنیا ہے شایانِ خوفِ شمس و قمر  
 بہتر ہے نگاہوں کی پناہ نگاہ مراد دل کچھ میں گرفتار نہیں ہوتے ہیں قاتل  
 دل کو محدود دانش پہ نہیں آتی ہے کچھ در علم سے ہاتھ آیا، نہ حکمت سے ملا  
 مانی! مہر کوئی مقام نہیں عشق کاران، دابر سمجھا

## مظفر حیدری، دلاور حسین

ان کا خاندان آگرے کا رہنے والا تھا، جہاں سے یہ لوگ ۱۸۵۷ء کے فوجی ہنگامے کے بعد ہجرت کر کے دلی پہنچے اور پٹنے کے مختصر قیام کے بعد کلکتے پہنچے۔ یہیں دلاور حسین ۱۹۳۰ء میں پیدا ہوئے۔

تعلیم کا آغاز مدرسہ عالیہ سے ہوا، جہاں پانچویں درجے تک رہے۔ وہاں سے فارغ ہوئے تو سان جینز اسکول میں پہنچے۔ لیکن کچھ صحت کی خرابی اور کچھ طبیعت کے آبائی پن کے باعث تعلیم میں کوئی ترقی نہ کر سکے، دسویں درجے کے امتحان سے پہلے ہی یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد یہ گویا ڈرکشا پتنگ بن گئے، جس کا کوئی مرکز نہ رہا ہو۔

روزگار کی طرف سے ہمیشہ پریشان رہے۔ جب کلکتے میں کوئی اطمینان کی صورت نہ نکلی، تو بھجی کی راہ لی کہ شاید وہاں کسی فلمی کمپنی میں محبت یا انگلیں لکھنے کا کام مل جائے۔ وہاں بعض احباب کے سہارے کچھ کام ملا، اور انھوں نے ایک دو فلموں کے گانے لکھے بھی، لیکن کوئی مستقل انتظام نہ ہو سکا اور ماضی بھی اتنا کم تھا کہ جلد ہی یہ دل برداشتہ ہو کر واپس کلکتے چلے گئے۔

ان کا بچپن اپنے نانا بابا کی سرپرستی میں گزرا تھا؛ وہ شعرا و موسیقی کے مہیا تھے۔ دلاور حسین بھی انھیں کے رنگ میں رنگے گئے۔ تعلیم کے دوران ہی میں ان کے بعض دوست شعر کہنے لگے تھے، ان سے بھی متاثر ہوئے۔ اور نانا جان اللہ کو

پیاسے ہو گئے۔ اب گویا سر پہ کوئی نہ رہا۔ انھوں نے نانا کے مختصر ذخیرہ کتب سے استفادہ کیا اور ان کا بار مونیہ لے کر موسیقی کی کونہیں بھلنے لگے۔ رفتہ رفتہ خود شعر کہنے کی تحریک ہوئی، اور انھوں نے ۱۹۴۴ء میں باقاعدہ اس میلان میں قدم رکھ دیا۔ شعر پر مستقل اصلاح کسی سے نہیں لی جو کچھ کہا، اُسے اپنے مطالعے اور ذوقِ سلیم کے پھر دسے پر مشاعروں میں سناتے رہے بالبتہ کلکتے کے بیشتر بزرگ اساتذہ سے راہِ درسم تھی، انھیں کے مشورہ سے مستفید ہوتے رہے۔ ۱۹۶۷ء میں ایک مختصر مجموعہ 'جامِ جم' کے عنوان سے اردو سجا، کلکتہ کی طرف سے چھپا تھا۔ اس میں ریاضیات، غزلیات اور نظمیں ہیں۔

ان کے کلام میں ہم عصر سیاسی حالات پر تنقید بہت نمایاں ہے، ترقی پسند تحریک کے اثر سے بھی یہ خالی نہیں۔ افسوس کہ عمر نے وفات کی۔ وہ سچاس برس کی عمر میں کینسر کے عارضے میں مبتلا ہو گئے، جس سے صحتیابی کی کوئی امید نہیں تھی۔ اس سے گھر اگر انھوں نے ۱۳ مئی ۱۹۷۵ء کی رات میں ڈوب کر خودکشی کر لی۔ اگلے دن دانش حاجی محمد حسن اسکو بر کلکتہ کے تالاب سے ملی۔ پسماندگان میں پوہ کے علاوہ دو بچے حرمانی یادگار چھوٹے۔

چمن والوں کے ہونٹوں پر ہیں شادابی کے افسانے  
 غمِ افسردہ کی ٹکٹاں کچھ اور کہتی ہے  
 سکوتِ بحر کو تم دائمی کہو، مگر مضطر!  
 سبک رفتاری موجِ رواں کچھ اور کہتی ہے  
 سوچا ہے کہ اک بت کو اب دل میں بسا بیٹھ گئے  
 دیران رہیگا یہ اللہ کا گھر کب تک!

ترت پر جموئی تسلی بھی سکون افزا ہے  
 پھر بھی مضطر! یہ سر، درد کا دریاں تو نہیں

ہماری داستان ابنا مکمل نہ نہیں سکتی  
 نہ بالذکر بھی گنتی تو آنکھ سے آنسو رواں ہونگے  
 خلوص ہو تو کہیں بندگی کی قید نہیں منگدے میں طواف حرم بھی ممکن ہے  
 رات کی بات کیا، رات گئی، بات گئی۔ صبح سے آنکھ ملاؤ کہ سحر ہوتی ہے  
 یہ رسم عام نہیں پھر بھی ہم نے دیکھا ہے  
 خود اپنی آگ میں پروئے جلنے لگتے ہیں  
 عجیب حال ہے اس دل کا ان دنوں مضطر !  
 ہنسی ہنسی میں بھی آنسو نکلنے لگتے ہیں  
 کینچ نفیس مقتل تو نہیں ہے، جان بھی اور لاکھوں پائے  
 صحن چمن کا ذکر نہ چیر دو، بال مہر کا نام نہ لو  
 تھے ان کی، میمانہ ان کا، جام ان کے ہر شیشہ ان کا  
 تلخی نے کا شکوہ کیسا ! کیف و اثر کا نام نہ لو  
 کل کی بات، سہتی کل تک، مضطر ! چھوٹ تھقی نہیں کہنے کی  
 آج قسم کھانے کے لیے بھی ان کے سر کا نام نہ لو

---

یہ ہمیں ملے کہ بھڑم آپ کا رکھا ہم نے  
 ہم کبھی حسرت دیدار سے آگے نہ بڑھے  
 حبش ہے تشنہ لبی کا شکوہ نظامِ فطرت سے میگسارو !  
 نگاہِ ساقی بدل گئی ہے مشراب کی کچھ کمی نہیں ہے  
 رباب و تیشہ و سیف و ظلم تراشے ہیں  
 ہیں خدا ہیں، ہمیں نے صنم تراشے ہیں  
 یہ منگ و خشت کو غفلت ہمیں نے بخشی ہے  
 ہمیں نے دیر ہمیں نے حرم تراشے ہیں

اضطرابِ دلِ ناقام سے ڈر جاتے ہیں  
 رات تو دوسرے ہم شام سے ڈر جاتے ہیں  
 تہمتِ عشق تو مہراج ہے ہم کو مضطر!  
 ہو گئے ودا ودا جو الزام سے ڈر جاتے ہیں

شبِ نئی رات ڈھلتی ہے، ڈھلنے دو! کھل اسی گناہیں اُرت بدلنے تو دور  
 صبحِ روشن کا سورج نکلے تو دور، ہر کئی پھول بن کر مکھڑھا تیگی  
 خلعتِ شبِ ہم لے دل! ہراساں نہ ہو ہمارے گن گن کے ناحق پریشاں نہ ہو  
 لاکھ سجاری سہی، رات پھر رات ہے خود گزرتے گزرتے گزر جائیگی

ہم ٹھہرے مدبوشتِ شرابی، پہیلی باتیں کرتے ہیں  
 ذہن میں واسطے کے بھی غلط ہو، یہ بھی تو ہو سکتا ہے  
 اکٹھے کا اذنِ جہنم بھی ہے بہت مایوس نہ ہو  
 عمر کا حاصل اک یہی پل ہو، یہ بھی تو ہو سکتا ہے  
 شامِ ابد کے دھندلے بادِ چھائے میں ہر سمت مگر  
 رات کئے پھر صبح ازل ہو، یہ بھی تو ہو سکتا ہے

مری چاہہ سازی کی فکر ہے، مرے ساتھ تیرا بھی ذکر ہے  
 مرا حال دیکھ کے، چاہہ مگر ترے نام تک تو پہنچ گئے  
 وہ نکاوہ ناڈ بھی ادھر، تو پیام تک تو پہنچ گئے  
 کبھی ہم کلام بھی ہوئے ہم کو کہ سلام تک تو پہنچ گئے  
 اب تو اظہارِ تمنا سے بھی جی ڈرتا ہے  
 اتنے سہمے ہوئے جذبات کہاں تھے پہلے

سنت جاں بھی ہے، جاں بلب بھی ہے  
 دل کا عالم جو کل تھا، اب بھی ہے



فطرتِ حسن کرتی کیا سمجھے  
 بے نیازی بھی ہے طلب بھی ہے  
 مضطر بردِ حشر بھی ٹھہرے گناہگار  
 وہ بچ گئے وہاں بھی، عجب اتفاق ہے  
 افسانہ خاموشی، یہ اشکِ غم، یہ شمعِ انجمن  
 چیلر دی کس نے بحری مغل میں پروا لے لی تھی  
 کیا جانے کیسی آگے، یہ شعلوں کا پتلا ہے، اور نہ دھواں  
 محسوس نہ ہوتا ہے یہی، جیسے کہ میں جلتا رہتا ہوں  
 فطرت میں ازل ہی سے میری، دیرنگی و ندرت ہے مضطر !  
 افسانہ تو ہوں میں ایک، انگر عنوان بدلتا رہتا ہے  
 کچھ اور مسافر بھی ہیں ہمراہ ہمارے \_\_\_\_\_ ہم اپنے سیفے کو ڈبو بھی نہیں سکتے۔  
 اسی سفینوں کا ڈوبنا بہتر \_\_\_\_\_ جن کو ساحلِ نظر نہیں آتا  
 ترے نازق کی لہر پہ ناز کرتا ہوں \_\_\_\_\_ ترا و حال تو خواب و خیال ہے اے دوست !  
 شب کی تنہائی مزہ دینے لگی \_\_\_\_\_ دن بھی اب یوں ہی گزارا چاہیے  
 منتظر کل بھی تھے کسی کے ہم \_\_\_\_\_ آج بھی انتظار کرتے ہیں  
 کم نظروں کے اور اک وگماں سے لگے \_\_\_\_\_ اسی مفسدہ پر دراز جہاں سے آگے  
 اے قافلے والو ! نہ رہاں پر شہر و \_\_\_\_\_ نزل ہے ابھی دور یہاں سے آگے  
 بجلی کی چمک قید کرو تو جا میں \_\_\_\_\_ کون سے کی لپک قید کرو، تو جا میں  
 انا کہ گھٹشن پہ تمہارا قبضہ \_\_\_\_\_ پہلوؤں کی ہلک قید کرو، تو جا میں  
 میخانے میں یہ پسند و نصیحت کیسی !  
 اسراف و ضاعت کی حکایت کیسی !  
 بے اپنی ہے، جام اپنا ہمسرا ہی اپنی  
 اے پیرِ مٹاں ! تیری اجازت کیسی !

## ذوالفقار علی بخاری، سید

ان کے خاندان کا مسقط الرأس وسطی ایشیا کا مشہور مرکزِ علم اسلامیت شہر بخارا تھا، جہاں سے ان کے اجداد اشعار و جویں صدی عیسوی میں ہجرت کر کے کشمیر حثتِ نظیر میں آجسے تھے۔ ایک زمانہ بعد ذوالفقار علی بخاری سے تین چار پشت اوپر یہ لوگ کشمیر سے نکلے، اور صوبہ سرحد کے دارالحکومت پشاور میں آ گئے۔ ان کے والد سید اسد اللہ شاہ بخاری کا شہر کے علما اور برگزیدہ اشخاص میں شمار ہوتا تھا شاہ صاحب مرحوم پیر کی حیثیت سے بھی معروف تھے، اور ان کے مریدوں کا حلقہ خاصا وسیع تھا۔

سید اسد اللہ شاہ بخاری کے تین صاحبزادے تھے۔ جن میں سے دو نے فاضلِ شہرت حاصل کی۔ سب سے بڑے پیر سید محمد شاہ تھے۔ یہ شعر بھی کہتے تھے؛ رفعتِ تخلص تھا۔ منجلی سید احمد شاہ بخاری تھے، جنہیں اردو دنیا "پطرس" کے نام سے جانتی ہے اور اگر چاہے بھی، تو انہیں بھلا سکتی۔ ان کا ۵ دسمبر ۱۹۰۵ء کو نیریا نک میں انتقال ہوا۔ اردو دالوں کی جیسی اور بیوقوفی کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوگا کہ آج تک ان کی سوانح عمری نہیں شائع ہوئی۔

سب سے چھوٹے بیٹے سید ذوالفقار علی بخاری تھے، جن کے بارے میں یچند سطریں پیش کر رہا ہوں۔

ذوالفقار علی ۱۹۰۴ء میں پشاور میں پیدا ہوئے۔ دسویں درجہ تک تعلیم بھی وہیں گورنمنٹ ہائی اسکول میں پائی۔ اس کے بعد مزید تعلیم کے لیے لاہور آ گئے۔ ان دنوں سبائیوں نے ”پیر“ کے سابقے سے کس طرح چھٹکارا پایا، اس کا قصہ ذوالفقار علی نے اپنی کتاب: ”سرگزشت“ میں بیان کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ سبائی جان کا پورا نام پیر سید احمد شاہ بخاری سخا، اور میرا پیر سید ذوالفقار علی شاہ بخاری۔ چونکہ والد مرحوم کے بعد ہم دونوں کسی سے بیعت لینے کے اہل نہیں تھے، لہذا ہم نے خیال کیا کہ ہمارا کوئی حق نہیں کہ پیر کا لفظ اپنے نام کا جزو بناتے رکھیں چنانچہ سبائی جان ”پیر احمد شاہ“ سے احمد شاہ ہو گئے، اور میں ”پیر سید ذوالفقار علی شاہ“ سے ذوالفقار علی بخاری بن گیا۔ پشاور میں ان کے اسکول کے ہیڈ ماسٹر ڈاکٹر تھے۔ وہ احمد شاہ کی صلاحیتوں کے پیش نظر اور خاص کر ان کی انگریزی میں تالیف کے باعث ان سے بہت محبت کرتے تھے؛ اور انھیں صرف ”پیر“ کے نام سے کہاتے تھے۔ لیکن لفظ پیر کا تلفظ اس طرح کرتے جس طرح یہ فرانسیسی میں بولا جاتا ہے، یعنی پیئر؛ بالکل اسی طرح جیسا کہ پیئر سوپ میں ہے (فرانسیسی پیئر، انگریزی میں پیئر ہے اور فرانسیسی میں پطرس۔ آپ نے حضرت عیسیٰ کے حواری سینٹ پیٹر کا نام سنا ہوگا؛ انھیں بھی یونانی میں (اور اسی سے عربی میں بھی) پطرس کہتے ہیں۔ غرض جب احمد شاہ نے لاہور کالج میں پہنچنے کے بعد انگریزی میں مضمون لکھنا شروع کیے تو ان پر وہ اپنے نام کی جگہ پیٹر لکھنے لگے؛ بلکہ انھوں نے اپنے استاد سے اپنی عقیدت اور ارادت کا اظہار یوں کیا کہ ان مضامین کے ساتھ اپنا پورا نام پیٹر ڈاکٹر لکھتے رہے چنانچہ اس زمانے میں ان کے جو مضامین لاہور کے انگریزی روزنامے ”سول اینڈ ٹری گزٹ“ میں چھپتے تھے، ان کے ساتھ نام پیٹر ڈاکٹر (Peter Watkins) ہی تھا۔

اب یہ قصہ ختم ہی کر لوں:

سید امتیاز علی (ج: ف: اپریل ۱۹۷۰ء) نے ۱۹۱۸ء میں ماہنامہ ”کبکشاں“

جاری کیا، بڑے شٹاٹ کا پرچہ سفایہ چونکہ اس وقت بیشتر صرف اول کے ایسوں سے تاج کے ذاتی مراسم تھا، وہ تاج کی فرمائش پر اس میں مضمون لکھ دئے گئے۔ انہیں میں احمد شاہ بخاری بھی تھے؛ یہ کالج میں تاج کے بہداشت بھی رہے تھے۔ بخاری نے ”کبکشاں“ کے لیے ایک سلسلہ مضامین لکھا، یونانی حکماء اور ان کے خیالات“ اور موضوع کی مناسبت سے ان پر اپنے اصلی نام کی جگہ ”پطرس“ کا قلمی نام استعمال کیا۔ ان کی ہدایت تھی کہ میرا نام نہ چھپاؤ نہ کسی کو بتایا جائے کہ یہ مضامین میرے لکھے ہوئے ہیں۔ پہلی دو تین سطروں میں تو ان کی ہدایت پر عمل ہوا، لیکن اس کے بعد ایک قسط پر کاتب نے ”سہواً“ پطرس“ کے ساتھ ان کا پورا نام ”احمد شاہ بخاری“ بھی لکھ دیا۔ اور یوں پر راز فاش ہو گیا کہ ”کون“ معشوق ہے اس پر وہ زنگاری ہیں؟ اب چونکہ سب کو معلوم ہو ہی گیا تھا، اس لیے اس کے بعد خود احمد شاہ بخاری نے بھی یہ قلمی نام اختیار کر لیا اور کھلے بندوں سے اپنی تحریر دلیں استعمال کرنے لگے۔

تو اسی موقع پر یہ چھوٹے سبائی ”ذوالفقار علی بخاری“ ہو گئے۔ اور بعد کو انگریزیت نے ترقی کی، تو اس میں تخفیف کر کے ریڈ۔ اے بخاری بن گئے۔

ان کے سرکاری ملازمت میں شامل ہونے کا واقعہ اتفاقاتِ زمانہ کی حیرتناک مثال ہے۔ ہوا یہ کہ ایک دن پشاور میں ان کے کسی دوست نے انہیں بتایا کہ اخبار میں جینام کا اشتہار چھپا ہے کہ ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے، جو انگریزی، اردو، فارسی، عربی، پشتو، پنجابی زبانوں سے واقف ہو۔ اس دوست نے مذاق سے کہا کہ سبلا بتاؤ، اتنی ساری زبانیں جاننے والا اس شخص کو کہاں ملیگا؟ وہ دوست تو صرف اتنا کہہ کر چلے گئے، ذوالفقار علی بخاری نے ”ٹریبیون“ اخبار کا وہ پرچہ تلاش کیا، جس میں اشتہار چھپا تھا اور چونکہ وہ کم و بیش یہ سب زبانیں جانتے تھے، لطف لینے کو مندرجہ اشتہار پتے پر درخواست بھیج دی، اور اس میں مشورہ طلبی کے لیے علامہ اقبال (ف: اپریل ۱۹۳۸ء)

اور پرنسپل سر محمد سعید کھنم لکھ دیے کہ اگر میرے بارے میں مزید پوچھ گچھ کرنا منظور ہو، تو ان اصحاب سے رجوع کیا جائے۔ قصہ کوتاہ، وہ ان اصحاب کی سفارش پر ملازم ہو گئے۔ یہ ۱۹۲۵ء کی بات ہے، جب ان کی عمر صرف ۲۱ برس کی تھی۔

فورٹ ولیم کالج، کلکتہ کے ختم ہونے پر حکومت ہند کے فوجی دفتر کے جنرل اسٹاف نے ایک امتحان کا بورڈ قائم کیا تھا، تاکہ اس کی مدد سے انگریز افسروں کی قابلیت اور اہلیت کی جانچ کی جاسکے۔ اس محکمے کا صدر دفتر شملے میں ستھانہ اشتہار اسی دفتر کی طرف سے شائع ہوا تھا، اور اسی بورڈ کے رکن نور الدین فقار علی بخاری مقرر ہوئے تھے۔

یہ بہت بڑے دہری کا عہدہ تھا۔ ان سے پہلے شمس العلماء خان بہادر مولوی محمد یوسف رنجوٹ (جون ۱۹۲۳ء) اس بورڈ کے رکن تھے جس جگہ بزرگ وفاق علی ہند کا تقرر ہوا تھا، یہ ۱۹۲۰ء میں رنجوٹ کے پنشن پر سبکدوش ہونے سے خالی ہوئی تھی۔ بخاری اس عہدے پر دس سائے دس برس تک رہے۔

اگرچہ یہی اور کلکتہ میں بعض لوگوں نے پہلے سے معمولی صلاحیت کے ریڈیو ٹرانسمیٹر لگا رکھے تھے، لیکن سرکاری محکمے کی حیثیت سے آل انڈیا ریڈیو یکم جنوری ۱۹۳۶ء کو قائم ہوا۔ اس کی تنظیم و ترویج کے لیے بی بی سی، لندن نے حکومت ہند کی درخواست پر مشنریل فیلڈن (دف: لندن ۲۱ جون ۱۹۳۷ء) کو ہندوستان بھیجا۔ ظاہر ہے کہ فیلڈن کو موزوں کارکنوں کی ضرورت تھی، جو اس نئے محکمے کی تنصیب و ترقی میں ان کے معاون ثابت ہو سکیں۔ نور الدین فقار علی بخاری کے ایک انگریز دوست نے فیلڈن سے ان کا نوکر کیا؛ بخاری نے بھی دھڑکتا بیچ دی، اور بالآخر انتخابی بورڈ نے ان کا ملی آپلیشن میں پروگرام ڈائریکٹر کے عہدے پر تقرر منظور کر لیا۔

فیلڈن آل انڈیا ریڈیو کے کنٹرولر جنرل تھے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ عہدے کا نام

کچھ دیکھ لیجیے، وہ نکلے کے سیاہ و سپید کے مالک تھے۔ لاڈ و لٹلڈن والی سرائے سے ان کی ذاتی ملاقات ہی نہیں، گہری دوستی تھی۔ اس لیے جیب بھی کوئی ٹھکانا نہ بدو غری قسم کی دشواری پیش آتی جس سے فیلڈن کو اپنی من مانی کرنے میں رکاوٹ محسوس ہوتی، وہ سیدھے ولنگڈن کے پاس چلے گئے اور ان سے جو حکم چاہا، جاری کرا لائے۔

ذوالفقار علی بخاری کی فیلڈن سے پہلی ہی ملاقات میں دوستی ہو گئی تھی۔ اور دوستی بھی ایسی کہ دونوں ایک دوسرے پر جان چڑھتے تھے۔ ستھوڑے دن بعد فیلڈن کی خواہش پر بریڈیسٹر احمد شاہ بخاری (پطرس) بھی وئی آ گئے۔ اوجھال وکی ریڈیو اسٹیشن کے ڈائریکٹر مقرر ہو گئے۔ اس پر ذوالفقار علی بخاری کو ترقی ملی اور یہ ان کے نائب اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائریکٹر بن گئے۔ ذرا خیال فرمائیے، بڑا بھائی اسٹیشن ڈائریکٹر اور چھوٹا بھائی اسسٹنٹ ڈائریکٹر؛ اور کنٹرولر جنرل فیلڈن، ان دونوں کا یارِ غار، گویا ان کی جیب ہیں۔ اس پر سرور دیوانی سنگھ مفتون (ف: جنوری ۱۹۵۷ء) نے سمجھتی کسی کہ ایک بی بی سی لندن میں ہے، اور ایک بی بی سی دہلی میں، یعنی بخاری برادرین کا رپورٹیشن جو آل انڈیا ریڈیو کی کرتا دھرتا ہے۔

ستھوڑے دن بعد جب ڈپٹی کنٹرولر کاؤس جی بہرام جی سیٹھنا کا بپتی تباؤ مل ہو گیا، تو ان کی جگہ پطرس ڈپٹی کنٹرولر بن گئے۔ اور ذوالفقار علی اسٹیشن ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ اسی زمانے کا ایک لطیفہ یاد آیا :

کسی نے پوچھا : حضرت! اب یہاں ریڈیو اسٹیشن پر دو بخاری ہیں۔ بات چیت میں جب تک پورا نام نہ بیا جائے معلوم نہیں ہوتا کہ آپ ان دونوں میں سے کن صاحب کا ذکر کر رہے ہیں ؟ محض بخاری کہہ دینے سے التباس کا اندیشہ ہے۔ کوئی ایسا نشان مقرر ہونا چاہیے کہ پورا نام بھی نہ لینا پڑے اور یسین ہیں ہو جائے۔ سامع نے کہا کہ اس میں کبہا مشکل ہے، بڑے بھائی (احمد شاہ بخاری)

’صحت بخاری‘ اور چھوٹے (ذوالفقار علی بخاری) غلط بخاری ، اس بات پر ایک لکھنؤیہ پڑا۔ لیکن یہ لطیفہ کچھ ایسا چپک کے رہ گیا کہ اس کے بعد مختلف دوستوں کی مجلسوں میں ان دونوں سمجھائیوں کی طرف واقعی صحیح بخاری اور غلط بخاری کے ناموں پر ہنسا سنا رہا ہوتا رہا۔

۱۹۳۷ء کے شروع میں حکومت ہند نے ’یا کیے فیلڈن‘ نے فیصلہ کیا کہ ہندوستان میں ریڈیو اور براڈ کاسٹنگ کو فروغ دینے کے لیے ضروری ہے کہ بعض لوگوں کو انگلستان بھیجا جائے جو وہاں بی بی سی میں کچھ دن رہ کر اپنے کام کی تعلیم و تربیت حاصل کر سکیں۔ اس پر دو آدمیوں کا انتخاب ہوا۔ ایک فیلڈن کے پرائیوٹ سیکٹر (مشترک چارٹر) اور دوسرے ذوالفقار علی بخاری کا۔ عرض سال پھر سے کچھ کم بی بی سی، لندن میں تربیت حاصل کرنے کے بعد بخاری واپس آئے، لیکن دلی پہنچنے پر انھیں معلوم ہوا کہ اب ان کا دلی میں قیام نہیں رہے گا چنانچہ یہ اسی عہدے پر بمبئی ریڈیو اسٹیشن بھیج دیے گئے۔ بمبئی ریڈیو کا موجودہ اسٹوڈیو اور دفتر انھیں کے زمانے میں تیار ہوا۔ قیام بمبئی کے دوران میں انھوں نے روزمرہ کے کام کے لیے گجراتی اور مراٹھی دونوں زبانیں اچھی خاصی سیکھ لی تھیں، اگرچہ خود انک انک کے بات کرتے تھے، لیکن سمجھنے خوب تھے۔

۴ ستمبر ۱۹۳۹ء کو دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی۔ عہدہ حاضر میں جنگ صرف فوجوں یا میدان ہی تک محدود نہیں رہ گئی ہے، بلکہ تربیتی کی پوری پوری آبادی اس کے نرغے میں آجاتی ہے۔ حکومت جب انک اپنے لوگوں کو اس بات کا یقین دلانا دے کہ جنگ مفاد عامہ کے لیے لڑی جا رہی ہے، اور سرکار کا موقف صداقت اور انصاف پر مبنی ہے، اسے عوام کی ہمدردی اور اعانت حاصل نہیں ہو سکتی۔ نہ صرف یہ، بلکہ فریقین غیر جانبدار ممالک کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے بھی پوری سعی کرتے ہیں۔ صورتِ بحال کی اس تبدیلی کا یہ اثر ہوا:

ہے کہ مروج تو لڑنے کو میدان جنگ میں جاتی ہے، اور حکومت کے تمام ذرائع نشر و اشاعت حرکت میں آ جاتے ہیں، لوگوں پر اسے واضح کرنے کو، اور انہیں اس بات کا یقین دلانے کے لیے کہ حکومت جنگ کرنے پر اس لیے مجبور ہوئی ہے کہ ملک کی آزادی، بلکہ ہستی اور وہ تمام اقدار جن کی لوگ قہر کرتے ہیں، دشمن کی وجہ سے معرض خطر میں ہیں، پس، عوام کا فرض ہے کہ وہ حکومت کے اقدام کی تابید کریں اور جنگ جیتنے کے لیے اس سے پورا تعاون کریں۔ چنانچہ جب جنگ شروع ہوئی، تو حکومت برطانیہ کی پراپیگنڈے کی مشین بھی پورے نڈھ شور سے حرکت میں آ گئی۔ بی بی سی، لندن نے بھی اپنی سگرمیاں چیز سے چیز ترک کر دیں۔ اس کے سامعین میں اردو بولنے والے دو محاذوں پر تھے، ایک خود ہندوستان میں، دوسرے، وہ ہندوستانی فوجی جو یورپ اور ایشیا اور افریقہ کے جنگ کے میدانوں میں ڈیرے ڈالے پڑے تھے۔ اس لیے بی بی سی نے اپنے محلے میں کئی اردو دان حضرات کا اضافہ کیا، جو نہ صرف اس کے نشریات کو بہتر بنانے کے لیے مشورہ دیتے، بلکہ حسب ضرورت مختلف محاذوں پر جا کر ہندوستانی فوجیوں سے ملنے، ان کی حوصلہ افزائی کرتے، اور ان کی حالت کی بہتری کے لیے منصوبے بناتے اور سفارشیں پیش کرتے تھے۔

اسی سلسلہ میں ذوالفقار علی بخاری بھی لندن بلا لیے گئے۔ حکومت برطانیہ کی وزارت اطلاعات نے ایک اتحادی ادارہ نشر و اشاعت قائم کیا تھا، بخاری صاحب اسی ادارے کے ہندوستانی رکن کی حیثیت سے گئے تھے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا، اس ادارے کے نمائندے میں یہ بھی داخل تھا کہ مختلف ممالک کے اصحابِ مجاز کو برطانی اور اتحادی پراپیگنڈے کی تائید پر آمادہ کرے۔ بخاری صاحب اس دوران میں یورپ کے کئی محاذوں پر دورے کو گئے تھے۔ اس زمانے میں انہیں عارضی طور پر میجر کا عہدہ بھی دے دیا گیا تھا۔

لندن سے واپسی کے تھوڑے دن بعد ہی ان کا تبادلہ سکھتے ہو گیا۔ یہاں انہوں



لیبٹکالی سکیں۔ ان کا بنگالی کا علم اور وسیعاً رائج راقی اور مراٹھی سے کہیں بہتر تھا۔ اس میں یہ مختلف تقریر کر سکتے تھے۔ سکتے سے انہیں پھر بہت جانا پڑا۔ ۱۹۴۷ء میں جب ملک کو آزاد کی ملی ہے، تو وہ یہی ہیں تھے۔

لیکن درمیان میں ایک بات رہ گئی۔ وہ یہی ہیں تھے کہ ۱۹۴۷ء کے اواخر میں انہیں امریکا کی مشہور فلسفہ ساز کمپنی میٹرو گالڈن مین نے انہیں تیار کرنے کے لیے امریکا بلایا۔ انہوں نے حکومت سے خدمت لی اور امریکا سدھارے۔ وہاں کوئی چھ مہینے قیام رہا۔ واپس آئے، تو تقسیم ملک کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ۱۹۴۷ء میں یہ بھی پاکستان گئے سو وہاں ریڈیو پاکستان کے (یہ نام بھی انہیں کارکھا ہوا ہے) اس سے پہلے نام پاکستان براڈ کاسٹنگ کارپوریشن تھا) ڈائریکٹر جنرل مقرر کئے گئے۔ وہ اس عہدے سے ۱۹۶۱ء یا ۱۹۶۲ء میں سبکدوش ہوئے۔ اگرچہ اس کے بعد بھی وہ اپنی وفات تک ریڈیو پاکستان سے بحیثیت مشیر وابستہ رہے۔

آخری تین چار سال دل کے عارضے میں مبتلا رہے۔ ۱۹۷۷ء میں وہ علاج کے لیے لندن گئے تھے۔ علاج سے مرض میں کچھ افاقہ ہو گیا، اور وطن واپس آ گئے۔ آغاز جولائی ۱۹۷۵ء میں واپس گئے اور ان کے سولے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ کمریشن ہوا، اتنے میں دل کی تکلیف بڑھ گئی۔ اس پر اسپتال میں داخل ہوئے، جہاں ان کا ہفتے کے دن ۱۲ جولائی ۱۹۷۵ء (یکم صبح ۱۳۹۵ھ) کو انتقال ہو گیا جنازہ اگلے دن الوارکو اٹھا، اور انہیں فی سی، ایچ سو ساٹھی کراچی کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ اولاد میں تین بیٹیاں ان کی یادگار ہیں۔

بہت لوگوں نے ان کی تاریخ وفات کہی۔ نیاں اکبر آبادی کا قطعہ تاریخ ہے، خبر مرگ نہ لے بخاری کی سن کو مری آنکھ سے ہو گئے اٹک جاری یہ تاریخ فکر رسا سے لی ہے جہاں سے لٹھے آج نہ لے بخاری

(۱۳۹۵)

تیس امر دہوی کے قلعے میں ذوالفقار حقائق پناہ سے ۱۳۹۵ ہجری برآمد ہوئے

ہیں۔

اس برصغیر — ہندوستان اور پاکستان میں ریڈیو اور براڈ کاسٹنگ کے فروغ اور ترقی میں ذوالفقار علی بخاری نے جو نمایاں خدمات انجام دیں۔ ان کا انکار ممکن نہیں۔ ان کی قربانت اور طباعتی کا ایک راز معترف ہے میں انہیں ۱۹۳۶ء سے جانتا تھا۔ اس میں شمع سحر مبالغہ نہیں کہ ان کی بذلہ سخی، حاضر جوابی، معاملہ فہمی کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ جن لوگوں کو ان سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا، ان سے کچھ کہا جاتے، تو انہیں مشکل سے اعتبار آئیگا۔

ڈراما اور موسیقی ان کے مغرب و مشرق تھے، علماً اور عملاً دونوں طرح۔ اور انہیں ان میں ایسی گہری بصیرت حاصل تھی کہ بڑے بڑے جُعا درمی ان کا لوہا مانتے تھے۔ غالب نے ایک جگہ عیش کی تعریف یہ کی ہے کہ کسی کو اپنا دلپسند مشغلہ بطور پیشہ اختیار کرنے کا موقع مل جائے۔ یہی ذوالفقار علی کے ساتھ ہوا، اور وہ زندگی سحر عیش کرتے رہے۔

انہیں نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ افسوس کہ ان کی تحریریں عموماً شائع نہیں ہوئیں، اگر وہ ہمیشہ خوب سے خوبتر کی جستجو میں رہے۔ خدا کرے اب شائع ہو جائیں!

انہوں نے تحریر کیا ”کراچی کے لیے اپنی یادداشتیں قلمبند کی تھیں۔ یہ ۱۹۶۳ء اور ۱۹۶۴ء میں ہفتہ وار اس پرچے میں چھپتی رہیں۔ بعد کو ان کا مجموعہ ”گزشت کے عنوان“ سے کتابی شکل میں شائع ہوا (کراچی ۱۹۶۶ء) معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے اس کا دوسرا حصہ بھی مرتب کر لیا تھا! یہ بھی چھپ جانا چاہیے۔ ذوالفقار علی بخاری شعر بھی کہتے تھے۔ وہ کلاسیکی انداز کے خوش فکر شاعر تھے۔ اگرچہ وہ نئے طرز فکر سے دامنِ اشاں نہیں گزرتے، لیکن بنیادی طور پر انہوں نے روایتی اسلوب سے رُوگردانی بھی نہیں کی۔ افسوس کہ ان کا مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا۔ ذیل میں نونے کے طور پر ان کے چند شعر پیش کیے جاتے ہیں!

اے میرے شہر سے آنے والو! کچھ تو کہو، ہاں کچھ تو کہو  
 اُس شہر کے گھر آباد ہیں، یا آباد ہیں زنداں؟ کچھ تو کہو  
 دامن کے چاک سے دور ہے گفتا چاک بگریباں، کچھ تو کہو  
 یا اب کے بھی میسر فرمے غری فیصل بہاراں، کچھ تو کہو  
 کیا جوشِ جنوں کا رنگ رہا؟ کیا وحشت کے سلسلے ہوئے؟  
 یا اب کے بھی بے فیض رہی پُرسی رحمتِ باراں، کچھ تو کہو  
 کیا صبح کو اب بھی بارِ صبا، پیغامِ محبت لاتی ہے؟  
 کیا شام کو اب بھی ہراتی ہے کاہلی پیچاں؟ کچھ تو کہو  
 کیا بزم میں اب بھی ساغر گئے سے چہرے روشن ہوتے ہیں؟  
 کیا شام میں اب بھی ہوتا ہے مغل میں چراغاں؟ کچھ تو کہو  
 وہ شہر کا دامنِ جو ہر ایک پہ کفر کا فتویٰ جسٹا مست  
 کس حال میں ہے وہ مروخا؟ اے مردِ مسلمان! کچھ تو کہو  
 ہاں موت بھی کو آتی ہے، ہم سب کو مرنا ہے، لیکن  
 اس شہر میں زندہ رہنے کا بھی کوئی ہے مکان؟ کچھ تو کہو  
 گم کروہ راہ، خاک بسر ہیں، ذرا شہر  
 اے تیز رو! غبارِ سفر ہوں، ذرا شہر  
 رقصِ نمود یک دو نفس اور بھی سہی  
 و دشمنِ ہوا پہ مثلِ شکر ہوں، ذرا شہر  
 اپنا خرامِ تیز نہ کر، اے سیمِ زیست!  
 بکھے مکہ ہوں، چراغِ سحر ہوں، ذرا شہر  
 مرموم سی امید ہوں، مجھ سے گریز کر  
 اپنا کسی دعا کا اثر ہوں، ذرا شہر

سجدۂ شوق کرے کون ادا، میرے بعد  
 آپ پھر تے رہیں، بن بن کے خدا، میرے بعد  
 ایک میں ہوں کہ مری یاد دلوں سے نہ مٹی  
 ورنہ ٹٹے کو تو کیا کیا نہ مٹا ! میرے بعد  
 میں ہوں سرسبز خزاں میں بھی بہاؤ کی طرح  
 کس کو ساس آئیگی یہ آبِ دہوا، میرے بعد  
 کس کو آئینکا اسیری میں رہا تی کا مزا  
 کس کو پہنا تیجے زنجیرِ وفا، میرے بعد

<p>دھل کی شب بھی بھر کر شب ہے،          تجھ سے شکوہ، سو یاد ہے          مرنے کا بھی کوئی سبب ہے          ساری دنیا کا وہ رب ہے          ایک سے بڑھ کر ایک غضب ہے،          میرے جنوں میں بھی اک ڈھب ہے          جس کی طلب تھی اُس کی طلب ہے          کوئی ہمارا بھی منصب ہے          عشق کا مطرب ہر بلب ہے          جن سے عداوت جب تھی ذاب ہے          مالِ عرب تھا، پیشِ عرب ہے</p>	<p>موجِ دل بہا ب طلب ہے          تو آقا ہے، میں بندہ ہوں          میرا جیسا تیرا خاطر          جس نے مجھ کو دل بخشا ہے          دل کا آنا، دل کا جانا          مجھ کو بس تیرا ہی جنوں ہے          اس دنیا میں، اس دنیا میں          ہم ہیں اور دیوار کا سایہ          حق کا نفع، اللہ اللہ          وہ بھی میرے دوست نہیں ہیں          دل حاضر ہے، دل کے مالک!</p>
--	--

<p>سب پیارے ہیں، کون چلائے          آنکھیں دیکھیں، جی لپٹائے          جب وہ کافر سامنے آئے</p>	<p>تیرا میرا منہ تکتے ہیں          حق کا جلوہ، اللہ اللہ          ایانوں کا اللہ سیلی</p>
--	---

اگر دے، اشیاء پر خدا کی کشش

محر سے لوٹ لوٹ کے آتا ہوں گھر کو میں

ہم شنا سا بحر کی تہ کے ہوئے اور ساحل کے تہم سہ کے ہوئے  
اس توقع پر رہے کا نئے طعنے دیکھ لوں دو گل کہیں یکے ہوئے  
ہم کو دیکھو، میکدے کے دشمنو! جو بھی کچھ ہم جیسا یہیں رہے ہوئے

پھر ہے گمراہیوں کی بھجھ کو تلاش پھر کوئی راہ پر نہ ہو جائے  
بھجھ کو محفل میں باریاب کر دے سجدہ گاہ، شگب دور نہ ہو جائے  
دانا دانا بہم شو و خسر من بھلیوں کو خبر نہ ہو جائے

عینب کی دو بیعت عشق، عشق کی عنایت غم  
غم ہزا و منت ہے، کوئی غم کو کیا جانے!  
اک صدا ہے جس پر ہم قص کرتے رہتے ہیں  
وجد میں جو آ جائے، اذیر دم کو کیا جانے!  
بزم میں تو ہم دونوں اجنبی سے رہتے ہیں  
کوئی تم کو کیا سمجھے، کوئی ہم کو کیا جانے!

بہت چو بچکے، جو درد دل کو درد دل سمجھتے ہیں  
غمز ہم درد دل کو ذلیلت کا حاصل سمجھتے ہیں

عشق ہے آخر، موت نہیں ہے ٹل جا میر کا ٹلنے مٹنے

تیرے اعلانِ گزشتہ مجھے یاد آتے ہیں غم فراموش تو ہوں، اے لطف فراموش نہیں

شورشِ عقل ہے برہم کن جمیع حال بہ تن حرف ہے تو میں بہ تن گوش بنیں  
مندرجہ ذیل ان کی آخری غزل ہے، جو انھوں نے اپنی وفات سے چند دن پہلے کہی  
تھی :

شام ہو، دوست ہوں ، بُنو بھی ہو	اور خدا رکھے تجھ کو، تو بھی ہو
ہر حق میں، ہوں صوفیائی کرام	میگساروں کی باؤ ہو بھی ہو
بزمِ یاراں میں، باہم آداب	تو ہی موضوعِ گفتگو بھی ہو
ہوا اگر تیرا طرزِ دستار	گل کی گلشن میں آبرو بھی ہو
اور باتوں کے ساتھ حسبِ محل	آنکھوں آنکھوں میں گفتگو بھی ہو
کچھ تو آئے نظر، سراب ہیں	کچھ تو انعامِ حبتو بھی ہو
وہن کا فیہ دلِ مسلمان ہے	ان میں ممکن ہے، ددِ بروکھی ہو

## نشر جالندھری، محمد عبدالحکیم خان

نشر جالندھر (پنجاب) میں ایک چھوٹا سا کھنڈہ میاں والا مولویاں (تحصیل بھو رو) ہے، محمد عبدالحکیم خان وہیں ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے، ضلع کی نسبت سے اپنے نام کے ساتھ جالندھری لکھتے تھے۔ بے بسنی بڑی مردم خیز رہی ہے وہ ہندوئیت کے بعض شہور علماء یہاں کی خاک سے اٹھے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے مرشد حضرت بدرالدین اولیاء جب کابل سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے، تو انھوں نے بھی یہیں قیام کیا تھا، بلکہ میانوالی مولویاں کی بنیاد ہی انھوں نے رکھی تھی۔

نشر کے والد مولوی محمد اشرف خان مقامی پرائمری اسکول کے صدر مدرس تھے۔ نشر کا تعلیمی دور بہت متاثر ہوا! اپنے درجے میں ہمیشہ اقل آئے۔ دوئیں کا امتحان انھوں نے گورنمنٹ ہائی اسکول، کوئٹہ سے پاس کیا تھا، جہاں اس وقت ان کے سہائی مولوی عبدالغفور خان مقیم تھے۔ اس امتحان میں بھی اول آئے، اور اس طرح لالہ جمعیت رائے گولڈ میڈل کے مستحق ٹھہرے، جو وہاں کے ایک رئیس لالہ جمعیت رائے نے اپنے مرحوم اکلوتے بیٹے کی یاد میں جاری کیا تھا۔ اس کے بعد وہیں اسلامیہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہو گئے۔

شاغری بہت کئی میں شروع کی۔ جب ایک مرتبہ گرمی کے زمانے میں اس باران سے خلق خدا بہت پریشانی تھی، ان کے استاد نے درجے کو بارش پر مضمون

مجھے کوکھا۔ نشتہ مضمون تو نشر میں نکلا، لیکن اس کے آخر میں اس شعر کا اضافہ کر دیا :

الہی! قبول اس کی کرے دعائیں  
کہ مہینہ کو ترستی ہے ساری خدائی

اس وقت ان کی عمر بمشکل دس برس کی ہو گی۔ کونٹھ میں فوجی ملازمت کے بعد واپس کے لیے کیڈٹ کالج تاقم تھا۔ اس میں اردو کے استاد کی جگہ خالی ہوتی۔ نشتہ نے بھی ٹیچر شپ کا امتحان پاس کر کے درخواست دے دی۔ اور مقابلے کے امتحان میں یہاں بھی اول آئے۔ اس پر کالج کے پرنسپل نے انہیں ڈیڑھ سو روپے کے مشاہرے پر ملازم رکھ لیا۔ یہاں بعض اوقات اساتذہ کو فیلڈ سر دس پر یعنی باہر بھی جانا پڑتا تھا۔ نشتہ نے فیلڈ میں جانے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ ہوا کہ ترقی کے تمام راستے بند ہو گئے، اور عمر سیر ڈیڑھ سو روپے سے آگے بڑھنے کی امید نہ رہی۔ اس پر انہوں نے کچھ مدت بعد ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔

اس کے بعد چندے، وکیل، (اور تیسرا) کے ایڈیٹر رہے اور سچرا لاہور آ گئے۔ اب انہوں نے مختلف ناشرین کے وہاں کام کرنا شروع کیا۔ بیسویں کتا میں معمولی اجرت پر لکھ کر دوسروں کے حوالے کر دیں، جو ان اصحاب کے نام سے شائع ہوتے۔ غرض ناشرین کے دارے نیا رہے ہوتے رہے، لیکن نشتہ غریب نے زندگی بھر کبھی غارتگی کا مشورہ نہ دیکھا۔ شہزی مولانا روم کا منظوم ترجمہ سیما ابکر آبادی (دف جنوری ۱۹۵۱ء) نے کیا تھا۔ اس کے لیے مشہور ناشر مولوی فیروز الدین (دف: اپریل ۱۹۴۹ء) نے انہیں دو پیسے فی شعر معاوضہ دیا تھا۔ سیما ابکر ابکر نے اس کے پانچ دفتر کا ترجمہ مکمل کر دیا اور اس کے بعد کام چھوڑ دیا۔ نشتہ نے نہ صرف اس ترجمے پر نظر ثانی کی، بلکہ خود چھپے دفتر کا ترجمہ اضافہ کر کے کتاب مکمل کر دی۔ یہی ترجمہ بعد کا ابام منظوم کے عنوان سے فیروز الدین اینڈ سنز کی طرف سے شائع ہوا۔



اس دوران میں نشتر نے ۱۹۲۳ء میں منشی فاضل اور ۱۹۲۵ء میں انٹر کے امتحان پاس کر لیے تھے۔ بی۔ اے کی تیاری کر رہے تھے کہ شادی ہو گئی۔ اس کے بعد کسبِ روزگار کا مسئلہ کھڑا ہو گیا اور یوں تعلیم سے دست بردار ہونا پڑا۔ نشتر نے شروع میں کچھ دن نظم لطافتی سے مشورۂ سخن کیا، لیکن جلد ہی استاد نے فارغ الاصلح قرار دے دیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نشتر کو حبد امناف بن پر پوری قدرت حاصل تھی۔ ان کے اپنے نام سے جو کتابیں شائع ہوئیں، ان میں سے بعض نام یہ ہیں: نشتر ادب، روضہ ادب، اشروح بالی جبریل وغیرہ۔

اٹوار ۲۲ جون ۱۹۷۵ء کو لاہور میں انتقال ہوا۔

افسوس کہ باوجود تلاش، ان کے دونوں دیوان مہیا نہ ہو سکے۔ ایک تذکرے میں تین غزلیں ملیں، انھیں میں سے چند شعر بطور نمونہ پیش کر رہا ہوں۔

رخصت ہوا شباب، زمانہ حمد رگیا  
وہ ہم، نہ وہ جواب، زمانہ بدل گیا  
پہلی سی وہ زمین نہیں، وہ آسمان نہیں  
دنیا ہے جیسے خواب، زمانہ بدل گیا  
ہنگامے عشقِ حُسن کے افسانہ ہو گئے  
اتحاد انقلاب، زمانہ بدل گیا  
ارشاد جو حضور کا ہے، ہاں بجا اور مست  
بدل نہیں جواب، زمانہ بدل گیا  
نشتر جو شکوہ کجِ تغافل ہوا کبھی  
ہنس کر دیا جواب: ”زمانہ بدل گیا“

یہ کفر نہ بحر ہے، ساحل ہے موجِ موجِ اس کی  
بظاہر ایک بھی ساحل نظر نہیں آتا

رواں رواں میں مسافر تلاش منزل میں  
اگرچہ جادۂ منزل نظر نہیں آتا  
یہ اشک اشک نہیں، تنگ اشک میں، نشتر  
جگر کا خون جو شامل نظر نہیں آتا

جو گلشن میں بہارِ فتنہ ساماں دیکھ لیتا ہوں  
تو دامن دیکھ لیتا ہوں، گریباں دیکھ لیتا ہوں  
نگاہ ویرانی، دوشِ ہیں تصویرِ محبت کے  
گلستاں دیکھ لیتا ہوں، بیاباں دیکھ لیتا ہوں  
خود اپنا رہنا ہوں میں، بیابانِ تنہا میں  
کہ ہر ذرے میں کوئے جاناں دیکھ لیتا ہوں

## منظر لکھنؤی، سید منظر حسن

نبیب الطرین یعنی دومیالی اور ناسیالی دونوں سلسلے امام دوم حضرت تاجی علیہ السلام سے جاتے ہیں۔ ان کے بزرگوں میں ایک صاحب نجم الدین سب سے پہلے سبزواری سے ہندوستان آئے۔ یہی لکھنؤ کے مشہور خاندان اجنبیا کے بھی مورث اعلیٰ ہیں۔ یہاں ان کی مناسب آؤ بھگت ہوئی اور نصیر آباد کا علاقہ بطور بجا گیر عطا ہوا۔ ایک زمانے تک خاندان نے خوشحالی کا دور دیکھا۔ لیکن کسی چیز کو وہ امن نہیں رفتہ رفتہ حالات بگڑتے گئے، یہاں تک کہ ان کے جد امجد سید وارث حسین صرف رئیس روضہ (ضلع رائے بریلی، یو، پی) ہو کے رہ گئے۔ منظر کے والد بزرگوار شمس العلماء مولانا سید صبط حسن کسی تعارف کے محتاج نہیں؛ بلحاظ خطیبان کا ملک بھر میں شہرہ تھا۔ ان کا چھٹبہ ۲۸ محرم ۱۳۵۴ھ (۲ مئی ۱۹۳۵ء) کو لکھنؤ میں انتقال ہوا اور وہیں امام باطنیہ غفران مآتب میں دفن ہوئے۔

منظر کی شہسخت تاریخ ولادت تو معلوم نہیں ہو سکی، لیکن اندازہ ہے کہ وہ ۱۹۱۴ء کے شروع میں اپنے آبائی مکان (بنجاری ٹولہ) لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی عربی و فارسی کی تعلیم گھر ہی پر مولانا آغا جون مرحوم کی نگرانی میں ہوئی، جو خاندان اجنبیاہ

مآخذ: سید باسط حسن، ماہر لکھنؤی، مرزا محمد اخفاق (شعید کالج لکھنؤ)؛  
کاظم علی خان صاحب (شعید کالج لکھنؤ)

کے نزدیک تھے۔ اس کے بعد سلطان المدارس نکھٹو میں داخلہ لیا، لیکن بدقسمتی سے اسی دوران میں ان کے والد مولانا سبط حسن کا انتقال ہو گیا، مجبوراً اس کے بعد انھیں تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔

تعلیم نامکمل رہ جانے سے قدرتاً دینی ترقی کی سب راہیں بند ہو گئیں، جس سے لازماً عمر بھر قلیل، بلکہ ناکافی آمدنی میں گزار کرنا پڑا۔ زندگی سبب مختلف پریشانیوں کی آماجگاہ بنے رہے۔ صحت ہمیشہ متوسطہ سطح کی رہی، نہ بہت اچھی، نہ بُری، لیکن آرام و آسائش کے مسلسل فقدان کے رفتہ رفتہ رنگ دکھایا، ۱۹۷۲ء میں تپ دق میں مبتلا ہو گئے۔ کافی دسائیں نہ ہونے کے باعث مناسب علاج بھی نہ ہو سکا۔ تپ دق اب جھلک نہیں رہا اور قابل علاج ہے۔ لیکن اس کا صرفہ ہنوز خاموش ہے! اور اسی کا سامان ان کے پاس نہیں تھا۔

بالآخر اسی مرض سے ۲۲/۲۳ جون ۱۹۷۷ء کی شب میں تقریباً ڈیڑھ بجے (یعنی ۲۳ جون کے ابتدائی حصے میں) اچھے گھر پر جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔ ۲۳ جون دوپہر کے وقت امامبارہ غفران مآب (نکھٹو) کے اندرونی صحن میں (شمالی پہاڑ کے مقابل) سپرد خاک ہوئے۔

بہت کم عمری میں شعر کہنے لگے تھے، اور یہ اثر سخا خاندانی ماحول کا۔ والد کا میدان علم و فضل میں ڈنکا بجاتا تھا۔ وہ شعر بھی کہتے تھے، خاطر تخلص تھا۔ منظر کے ایک چچا مولانا ظفر مہدی ماہنامہ سہیل کین "نکھٹو کے مدیر تھے؛ دوسرے مولانا سید کامل حسین کاکی (سکریٹری انس جعفر علی نان اثر رامپوری) شعر کہتے تھے اور مختلف علوم و فنون میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ خود منظر کے بڑے بھائی سید محمد حسن سالک تخلص اور چھوٹے بھائی سید باسط حسن ماہر بھی شعر کہتے تھے۔ (تیسرے بھائی سید محمد وارث حسن انگلستان میں مقیم ہیں) غرض یہ بھی شعر کہنے لگے۔ ساری عمر کسی سے اصلاح نہیں لی۔

ان کے قطعات کا مجموعہ "ہفت رنگ" کے عنوان سے چھپ چکا ہے، معلوم ہوا تھا

کہ ان کے برادرِ پسر و ماہرِ حساب ان کے تصاعد ”منظر و نظائر“ کے نام سے مرتب کر کے چھپوانے کا انتظام کر رہے ہیں۔ لیکن کچھ شائع نہیں ہوا (۷۸، ۷۹) اس کے علاوہ بھی ان کا بہت غیر مطبوعہ کلام (سلام، غزل و قطعوں) ان کے خاندان میں موجود ہے۔

منظرِ مرحوم ساری عمر بحرِ ترسے، تاتاہل کے جنال میں پڑے ہی نہیں۔ بڑی بڑے سنگ، سنگت اور باغ و بہار طبیعت پائی تھی۔ صاف دل اور مرتجانِ مرغ کے بڑے میں نہیں تھے۔ اپنے قریبی حلقہٴ احباب میں سب انہیں ”منظرِ سمیّا“ کہہ کر پکارتے ! اور وہ اس سے بہت خوش ہوتے تھے۔

اتما لیتد و اقالئیںہ ز اچون

کلام میں کوئی خاص بات نہیں۔ زبان پر قدرت ہے۔ فنی پہلو سے بھی بے عیب ہے۔

چند قطعات، ملاحظہ ہوں :

آبلہ دل کا سپوٹ جائیگا	رشتہٴ صبر ٹوٹ جائیگا
جامِ ہاستوں سے چھوٹ جائیگا	مسکرا کر نہ دیکھیے، ورنہ

جو حجابات ہیں، وہ اٹھا دیجیے	دل کی خاموش دنیا جگا دیجیے
ہو سکے تو صدا پر صدا دیجیے	آسرے ڈھونڈتی ہے نگاہِ دنا

نرا دنیا سے ہٹ کر دیکھ لیجیے	نقابِ درخ الٹ کر دیکھ لیجیے
بہانے سے، پلٹ کر دیکھ لیجیے	اگر ہے مصالحت سے چشمِ پوشی

نرا کچھ محبت کے ماروں سے کہہ دو  
جہیں کسی طرح جاں نثاؤں سے کہہ دو

بتاؤ تو، کیا فیصلہ ہے قصارا !  
جو منہ سے نہ بولو، اشاروں سے کہہ دو

زباں سے نہ رُودادِ غم کہہ سکیں گے  
نہ ایذائے شامِ اِلم کہہ سکیں گے  
یونہی دل کے ارمان، دل میں رہیں گے  
نہ تم کہہ سکو گے، نہ ہم کہہ سکیں گے

اب اوقیت، اوقیت نہیں ہے      زحمتِ شامِ فرقت نہیں ہے  
یہ ندامت سرِ قبر کیسی      جاؤ، کوئی شکایت نہیں ہے  
وقت کے ساتھ پھل کے نکل جاؤ گے  
پھیر لو گے نظر، چال چل جاؤ گے  
تخامِ کرم کیلجے کو رہ جائیں گے  
تم بدلتے بدلتے، بدل جاؤ گے

## حامد آلہ آبادی، حامد حسین

شیوخ صدیقی کے ایک متوسط الحال، لیکن معزز گرانے کے چشم چراغ تھے۔ ضلع  
الہ آباد کی تحصیل چائل میں ایک مختصر موضع ”بہکا“ ہے۔ یہ اسٹی کے بزرگوں نے آباد  
کیا تھا جب وہ عہد عالمگیری کے آخری زمانے میں یہاں آکر بس گئے تھے۔ حامد حسین  
جون ۱۹۳۲ء میں بہکا میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حکیم اختر حسین خاصی سماجی  
جمہیت کے مالک تھے۔ بزرگوں کی پیارا کردہ جا دار ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی نذر  
ہو گئی، انھوں نے اپنی محنت اور معاملہ فہمی، سوجھ بوجھ اور انتظامی قابلیت سے  
خاندان کو پھر سے اپنے پاؤں پر کھڑا کر دیا۔ اس سے املاک میں بھی وسعت ہوئی،  
اور وقار میں ترقی بھی۔

حامد حسین اپنے والدین کی سب سے بڑی اولاد تھے۔ ۱۹۵۸ء میں ان کے والد  
حکیم اختر حسین کسی مقدمے کے سلسلے میں پکڑی گئے تھے، وہاں بھری عدالت  
میں کسی مخالف نے انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اب خاندان کی پوری ذمہ داری  
حامد حسین کے کندھوں پر آ پڑی۔ یہی مصیبت کیا کم تھی کہ کچھ مدت بعد ۱۹۵۹ء  
میں حکیم اختر حسین کے بعض سببہ قاتلوں کا پراسرار طریقے پر قتل ہو گیا اور اس  
سلسلے میں جو بدوق استعمال ہوئی تھی، بد قسمتی سے تفتیش پر کھلا کہ وہ خود  
حامد حسین کی تھی (جو قاتلوں نے اسی جرم کے انتخاب کے لیے جواری کی تھی) اس

پر حامد حسین گرفتار کر لیے گئے۔ مقدمہ چلا اور اس سلسلے میں آٹھ مہینے جیل میں کاٹنا پڑے۔ لیکن بالآخر استغاثہ جرم ثابت نہ کر سکا اور یہ باعث بری کر دیے گئے۔

دسویں درجے تک تعلیم باقاعدہ اسکول میں پائی تھی۔ اس کے بعد ناسازگار حالات کے باعث یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ملازمت کے دوران میں پرائیوٹ طور پر انٹر اور ادیب ماہر اور ادیب کامل کے امتحانات پاس کر کے آخر کار بی۔ اے کی سند بھی لے لی۔ ملازمت محکمہ تعلیم میں رہی جہاں نیک نامی سے بسر ہوئی۔

وہ شعر تو بہت ابتدا میں کہنے لگے تھے، لیکن ۱۹۵۰ء سے اس پر زیادہ توجہ دینے لگے۔ یہ شوق انہیں گویا ورثے میں ملا تھا۔ ان کے والد حکیم اختر حسین بھی شعر کہتے تھے، اختر اور شبیم تخلص کرتے تھے۔ ان کے تین چار شعر دیکھیے جن سے ان کے انداز سخن کا کچھ اندازہ ہو جائیگا (اس سے مقصد یہ بھی ہے کہ اس طرح ان کے چند شعر محفوظ ہو جائیں)

حریص لذت، آزار، مجھ کو دیکھ کر، بہم دم!  
 کسی نے میرے دل میں جستجو سے لامکاں رکھ دی  
 حاضر ہیں آپ کے درِ دولت پہ دیر سے  
 ہوش و حواس، عقل و خرد، جسم و جاں سے ہم  
 اک بے نیاز، مشق و محبت کی یاد میں  
 اختر! خدا گواہ، گئے درجہاں سے ہم  
 کبھی بے آئینہ جلوں کی انسانی سہمی دیکھی ہے  
 اگر مقصود ہیں، لا شیشہ دل، دیکھنے والے  
 بسا اگ کون دمکاں پر یقین کی چال چلا  
 تو راز مجھ پہ کھلا کر کیا ہوں میں

پہلے مڑتوں حامد بیکا وی کے نام سے لکھتے رہے، بعد کو اجاب کے کہنے پر حامد حسین



حامد سمجھنے لگے۔ الہ آباد کے ماہنامے "مشجون" سے اس کے روزانہ سے تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ اگرچہ انھوں نے ابتداً غزل سے کی تھی، لیکن "مشجون" سے تعلق کے بعد نظم پر بھی توجہ کرنے لگے۔ اور اس میں کامیاب بھی رہے۔ "مشجون" میں کبھی کبھی تبصرے بھی لکھا کرتے تھے۔ ۱۹۶۷ء میں مشہور نقاد شمس الرحمن فاروقی کے ساتھ مل کر انھوں نے جدید شاعری کا ایک نمایندہ انتخاب "نئے نام" کے عنوان سے مرتب کیا تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے بچوں کے لیے بھی بہت کچھ لکھا؛ ان میں سے دو کتابوں "ایجادات کی کہانی" (۱۹۷۳ء) اور "سجارت کے نامور ساتھی" (۱۹۷۳ء) پر انھیں یو پی اردو اکیڈمی نے انعام دیا تھا۔

افسوس کہ ان کا مجموعہ "کلام ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا، اگرچہ اس کا نام "انٹرا کی خوشبو" مشہور ہو چکا تھا۔ اس میں کچھ ان کی بے نیازی کو بھی دخل رہا۔

۱۵ اگست ۱۹۷۵ء کو معمولی بیمار میں مبتلا ہو گئے؛ علاج ہونے لگا۔ انھیں مشاعرہ قید کے زمانے سے دل کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا، اور دل پہلے سے کمزور تھا؛ اب کچھ سچڑے بھی فضاثر پائے گئے، تو علاج کے لیے میڈیکل کالج، الہ آباد میں داخل ہو گئے۔ پانچ دن تک زینت اور موت کی کشمکش میں رہنے کے بعد ۱۵ دسمبر ۱۹۷۵ء کو رحلت کی۔ لاش ان کے وطن بہار گئی اور وہاں خاندانی قبرستان میں سپرد خاک ہوئی۔

۱۹۵۱ء میں ان کی شادی الہ آباد کے حوار کے ایک مقام "سید سراواں" میں ہوئی تھی۔ جبمافی اولاد میں چار بیٹے (اعظم، معظم، اسلم، اکرم) اور دو بیٹیاں (سرینا اور تمکین) اپنی یادگار چھوڑیں۔

افسوس کہ کلام آج تک جمع نہیں ہو سکا۔ کچھ غزلیں ماہنامہ "مشجون" میں ملیں۔ ان کی بیاض سے کچھ کلام شمس الرحمن فاروقی صاحب نے مہیا کیا جس کے لیے ان کا ممنون ہوں، اسی کا انتواء۔ بعد از مرگ پیش ہے :

پا مال جنوں مشہور تھا بھی کرینگے  
 یہ شرط اگر ہے تو ہم ایسا بھی کرینگے  
 مستقبلِ زرتیں پہ سب رو رہا بھی کرینگے  
 جینا ہے تو جیسے کاسہ ہاراجن کرینگے  
 خاکسترِ ماضی میں شررِ زندہ نے ولے!  
 کہتے ہیں کہ راہوں میں اجالا بھی کرینگے  
 ہم برس برس بیکار ہیں امروند کے غم سے  
 ہاں، ہم ہی علاقہ غمِ دوران بھی کرینگے  
 دشواریِ حالات، حوادث کے تھپیڑے  
 منزل کا یقین ہے تو گورا بھی کرینگے  
 یہ بزم کا عالم ہے، تو پھر اہلِ قضا  
 ساتی سے توجہ کا تقاضا بھی کرینگے  
 بیداریِ غم آج کہ ہر اک پہنچا ہے  
 کیا اہلِ جہاں اس سے کنارہ بھی کرینگے؟

کتابِ حقوق، لیکن بے ورق ہوں      یکے از کشتگانِ مَخلوق ہوں  
 مری پہنا تیوں کا راز سمجھو      مجھ دیکھو، طبقِ اندر طبق ہوں  
 ہزاروں طور ہیں فاشاک جن سے      انہیں سچا تیوں کی میں رشتی ہوں  
 ہزاروں لفظ ہیں لیکن ہر اک کی جیب خالی ہے  
 میرا فلاں لباسِ شاعری، یارو! مثالی ہے  
 لگے ہیں کان آوازوں پر، لیکن لفظ گونگے ہیں  
 گذرتے موسموں کی داستان سب سے نرالی ہے  
 کسی تعریف ہی کی رکشانی میں آشکو کھلتی ہے  
 بتانے کی ضرورت ہے، یہ کالی رات کالی ہے۔

ہیں تنہا نہیں ہیں جستجو کی دوڑ میں لیکن  
 ہمیں سے کس لیے پھر آج ہر ذرہ سوالی ہے  
 یہ یکتائی ہماری، ہم سے ہی منسوب ہے، حامد !  
 یہ اپنی وضع، اپنی طرز خود ہم نے نکالی ہے

اک شخص تھا سوا ب وہ بیاباں نورد ہے  
 اس شہر میں ہمارے سوا کون مرد ہے  
 چہرہ ہر ایک قدر مقابل کا نرد ہے  
 عشقِ نبرد پیشہ طلبِ کارِ مرد ہے  
 یک جہتی نگاہ کو آواز کون دے  
 ہر دفترِ خیال یہاں فرد فرد ہے  
 اس جستجو کی دوڑ میں یہ سبید بھی کھلا  
 رنگِ سخن تلاشِ معانی کی گرد ہے  
 غرنے سے لے لے کے جھانکیگا اصل رنگ  
 چہرے پہ ہم سبجوں کے اگر آبِ نرد ہے  
 دستِ سخن میں عیشہ باطل نہ دیکھیے  
 دشمن اگر چہ راہ کا ہر سنگِ نرد ہے  
 اس میں حرارتوں کی نئی روح پھونک دو  
 خواہش کی لاش ایک زمانے سے مرد ہے

یقین کی حد سے گزر کر تجھماں تک گئے ہیں	کہاں رہے اہلِ محبت کہاں تنگ گئے ہیں
یہیں تو ختم نہیں راہِ تجو، اے دوست !	چراغِ دل کے سہارے جہلِ تنگ گئے ہیں
روایتوں کے سمندر کو پیر کر، ہم لوگ	مقامِ عشقِ حقیقت نشانِ تنگ گئے ہیں
تھمارے نام سے، تم کو خبر بھی ہو شاید	ہزار سنگِ سیرِ دوستانِ تنگ گئے ہیں

منزل دمہ کا یقین کیسا  
اپنی نشہ ہیر کی خاطر ہی سہی  
ہل چڑھے آپ تو چلتے رہیے  
نگر سے باہر بھی نکلتے رہیے  
موج کی موت سے بچنے کے لیے  
اپنے قالب کو ہلکتے رہیے

کچھ گفتگو سے اس کو سروکار بھی تو ہو  
جکتے ہیں ہم بھی، کوئی خریدار بھی تو ہو  
یہ خامشی علامتِ اظہار بھی تو ہو  
ہاں اس کی طرح کوئی بازار بھی تو ہو  
جس کی بشارتیں ہیں کتابوں میں جا بجا  
یہ کاروانِ عشوق، یہ راہیں، یہ منزلیں  
تاریخوں میں ہم سہی اماں دھونڈتے چلیں  
لیکن وجودِ صبح سے انکار بھی تو ہو

آؤ، ان لمحوں کو ہم لوگ مقید کر لیں  
تاکہ آنکھوں میں یہ اندازِ جہاں رہ جاتے  
بات بننے کی نہ صورت، نہ کوئی شکل قرار  
پاس لے دے کے اگر، عجزِ زبان رہ جائے

آنکھوں کے ساتھ ذہن کا دروازہ بند کر  
ہر صاحبِ کمال پر یوں نہ ہر خند کر  
یہ ایسی دسی بات نہیں ہے اگرہ میں رکھ  
جو تیر کو مل گیا، اسے مٹی میں بند کر  
وہ تیرگی کا ذہر، یہ تابندگی کا قہر  
اب تجھ کو اختیار ہے، جو بھی پسند کر

## راشدان، ام (نذر محمد)

پاکستان کے ضلع گوجرانولہ میں، وزیر آباد در لائل پور لائن پر ایک خاصا بڑا قصبہ جو اب شہر کی حیثیت اختیار کر گیا ہے، اعلیٰ پور چٹہ ہے، یہ تحصیل کا صدر مقام بھی ہے تقسیم ملک سے پہلے اس کا نام "اکال گڑھ" تھا۔ اس زمانے میں یہاں کا سربراہ کاخاندان عائد میں شمار ہوتا تھا۔ (شاید اب بھی ہو)۔ اگرچہ یہ لوگ قوم کے جوئے تھے، لیکن انہوں نے دنیا مت کو اپنا پیشہ بنایا، اور پشتوں تک بنو عرب کے مکین رہے۔ سکھوں کے عہد میں ان کی خاصی عزت تھی اور ان کا یہ مقام انگریزی زمانے میں بھی قائم رہا۔ اسی خاندان کے ایک فروغ باب فضل الہی چشتی صوبے کے محکمہ تعلیم میں ملازم تھے۔ وہ جڈریج ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس کے عہدے تک پہنچے اور وہیں سے پنشن پر سبکدوش ہوئے۔ ان کے دو بیٹے تھے: نذر محمد اور عبدالماجد۔ یہی نذر محمد بعد کو، ام راشد کے نام سے دنیا سے شعر و ادب میں شہور ہوئے۔ ماجد صاحب بھی مدتوں محکمہ تعلیم سے منسلک رہے۔ وہ کسی زمانے میں ملتان میں سبکداری تعلیم کے دفتر میں کام کرتے تھے۔ آج کل غالباً کسی ناشر کتب کے یہاں نوکر ہیں

راشد صاحب یکم اگست ۱۹۱۰ء کو اکال گڑھ میں پیدا ہوئے۔ "خضر عمر" تاریخی

سے ایک صاحب نے مقام ولادت، کیلیان والا کہا ہے یہ شیک نہیں

نام ہے جس سے (۱۹۱۰ء) بچتے ہیں۔ ابتدائی تعلیم مقامی گورنمنٹ ہائی اسکول میں پائی جہاں سے ۱۹۲۶ء میں دسویں کی سند ملی۔ اس کے بعد گورنمنٹ انسٹرکٹ لائل پور پہنچے اور ۱۹۲۸ء میں وہاں کا نصاب مکمل کر کے لاہور چلے آئے اور گورنمنٹ کالج میں داخلہ لے لیا۔ بیسوں سے چار برس بعد ۱۹۳۲ء میں ایم اے (اقتصادیات) کی سند حاصل کی۔

ان کی شعر گوئی اکال گڑھ کی طالب علمی کے زمانے میں شروع ہو چکی تھی۔ روایت ہے کہ انہوں نے سب سے پہلی نظم ۱۹۱۱ء میں ”انسپکٹر اور بچیاں“ کے عنوان سے سات برس کی عمر میں کہی۔ ہوا یہ کہ ایک انسپکٹر صاحب ان کے اسکول کا مایہ نہ کرنے کے لیے آئے۔ ان کے سر کے گرد مقبضوں کا جھرمٹ منڈلا رہا تھا، جو ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں ان کے ساتھ منتقل ہوتا رہا۔ یہ نظارہ دیکھ کر نذر محمد کو سخت تعجب ہوا اور اس پر انہوں نے یہ نظم لکھی۔ اس نظم میں انہوں نے اپنا خالص ”گلاب“ لکھا تھا۔ ان کے والد جناب فضل الہی نے نظم دیکھی، تو بہت خوش ہوئے اور اس پر بیٹے کو ایک روپیہ انعام دیا۔ خود ان کے والد (یعنی راشد کے دادا) جناب غلام رسول جو پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر تھے، اور اردو، فارسی میں شعر بھی کہتے اور ”غلامی“ خالص کرتے تھے، جناب فضل الہی نے بیٹے کی یہ نظم اپنے ابا کی خدمت میں بھیج دی۔ دادا نے اس پر ہونہار پونے کو یہ شعر لکھا:

میرے میاں گلاب! دہن میں گلاب ہو

خوشبو سے تیری بابا ترا نیضیاب ہو

اور کہا کہ شعر گوئی سے اجتناب کرو، ورنہ کسی کام کے نہیں رہو گے؛ بس اپنی تعلیم سے کام رکھو۔ لیکن یہ نشہ ایسا نہیں، جسے ٹرسٹی اتار دے۔ چنانچہ ان کا یہ مشغلہ جاری رہا۔ کالج پہنچے، تو اس شوق نے اور ترقی کی اور پختگی اختیار کر لی۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے زمانے میں یہ کالج کی بزم سخن کے سکتر اور کالج کے

ماہانہ رسالے "راوی" کے اردو حصے کے مدیر مقرر ہو گئے۔ اسی زمانے میں ان کی غزلیں اور نظمیں ہمایون اور نگار میں بھی شائع ہوئیں۔ وہ شری بھی لکھتے تھے! اس میں زیادہ توجہ تنقید پر تھی۔ غرض کہ کالج سے فارغ ہونے سے پہلے وہ لاہور کے ادبی حلقوں میں شاعر اور ادیب کی حیثیت سے متعارف ہو چکے تھے۔

اس زمانے میں وہ "راشد و حیدری" کے نام سے لکھتے رہے۔ یہ نسبت انہوں نے اپنے خاؤ محمد حیدر کیلانی سے اظہارِ ارادت کے طور پر اختیار کی تھی۔ کیلانی صاحب سبھاٹی دروازہ، لاہور کے اسلامیہ ہائی اسکول میں مدرس ثانی (سیکنڈ ماسٹر) تھے۔ ۱۹۲۳ء میں نیرنگ خیال جاری ہوا، اور واقعاً "ستارہء درخشندہ" و ماہِ کامل شکاری بات ہو گئی۔ تاثیر اس کے ایڈیٹر تھے۔ ان کے ساتھ پورا نیلا زندان لاہور کا حلقہ ان کی پشت پر، چغتائی کی مصوری کے شاہکار بھی ہر شمارے میں شامل ہوتے۔ اور ان تمام خوبوں کے باوجود چندہ صرف تین روپے۔ لاہور! چھ مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ پیرچے کی اشاعت پانچ ہزار تک پہنچ گئی۔ اس پر بعض اور اصحاب کے منہ میں بھی پانی بھر آیا۔ حافظ محمد عالم نے "عالمگیر" اور حیدر کیلانی نے "قوس قزح" جاری کیے۔ "عالمگیر" تو چل نکلا، کیونکہ حافظ محمد عالم کا اپنا مطبع تھا اور ان کی مالی حالت بھی بودی نہیں تھی؛ لیکن "قوس قزح" نے دو ہی برس (۱۹۲۷-۱۹۲۹) میں دم توڑ دیا۔ خیر، یہ تو جملہ مقررہ تھا جو ذرا طویل ہو گیا۔ کہ یہ رہا تھا کہ ان، ام راشد ان دنوں راشد و حیدری کے نام سے لکھا کرتے تھے۔ راشد تخلیق بھی کیلانی صاحب ہی نے دیا تھا۔

کالج کے دور میں وہ اسی نام سے روایتی شاعری کرتے رہے۔ اس زمانے میں وہ اختر شیرانی (ف: ستمبر ۱۹۴۴ء) اور روش صدیقی (ف: جنوری ۱۹۷۱ء) اور سید عابد علی عابد (ف: جنوری ۱۹۷۱ء) کے زیر اثر رہے، بلکہ ایک مرتبہ روش صدیقی نے خود محمد سے کہا تھا کہ ابتدا میں راشد نے اپنے کلام پر ان سے صلاح

لی لیکن جلد ہی وہ مدافعتی عشقیہ اور فضا تہ مشاعرے کو ترک کر کے میراجی (فدائو مہر) اور صدق حسین شالہ کے ساتھ مل کر آزاد نظم نگاری کرنے لگے۔

ایم اے کرنے کے بعد اپنی ابتدا طبع کے باعث، انھوں نے چاہاکہ والد کے اثر سے کہیں محکمہ تعلیم میں ملازمت مل جائے۔ جناب فضل الہی اس زمانے میں شیخوپورہ میں تعینات تھے۔ یہ ان کے پاس پہنچے، لیکن یہاں کوہ کا مہیا بی نہ رہ سکتی۔ جلد ہی والد کا تباہ و برباد ملتان ہو گیا، اور یہ بھی ان کے ساتھ وہاں چلے گئے۔ یہ وہ زمانہ ہے، جب محکمہ پنجاب نے دیہات سدھار کا کام وسیع پیمانے پر شروع کر رکھا تھا۔ (سر) مالک ڈارنگ اس محکمہ کا کڑا دھڑا اور مشہور ترین اُن کے دست راست تھے۔ من جملہ اورو بانوں کے مختلف مقامات سے ایسے رسالے شائع ہونے لگے جن میں دیہاتی زندگی کی بہتری اور دیہاتیوں کی بہبودی کے موضوع پر مضامین چھپتے تھے۔ اسی طرح کا ایک ماہنامہ نکلتا تھا، ملتان سے بھی نکلتا تھا۔ شاید اس کے ادارہ تحریر سے وابستہ ہو گئے جہاں وہ دوبرس رہے، اور پھر ۱۹۳۳ء میں واپس لاہور آ گئے۔

لاہور کے علمی حلقوں میں وہ اجنبی نہیں تھے۔ مولانا احسن اللہ خان تاجور خجیب آبادی (ف: جنوری ۱۹۵۱ء) اس زمانے میں اپنا مشہور ماہنامہ "شاہکار" شائع کرتے تھے۔ انھوں نے راشد کو نائب مدیر کی جگہ پیش کی۔ شاہکار صرف ۳۵ روپے تھا، لیکن مزنا کیا نہ کرتا، تنخواہ کم ہونے کے باوجود راشد نے پیشکش قبول کر لی۔ مگر یہاں کی فضا سے جلد ہی دل اچاٹ ہو گیا۔ تاجور نے رسالے کا کاروباری صیغہ اپنے برادر بستی سلیمان خان کے سپرد کر رکھا تھا، راشد کی ان سے کسی بات پر چل گئی۔ "تنخواہ پہلے ہی ناکافی تھی، ۳۵ روپے میں مشادی بھی ہو گئی تھی جس سے ذمہ داریاں مضاعف ہو گئیں۔ انھوں نے تنخواہ میں اضافے کی درخواست کی، جو مولانا تاجور نے رد کر دی۔ اس پر دل برداشتہ ہو کر راشد نے استعفیٰ دے دیا اور ملتان کی راہ لی! اور وہاں کشر کے دفتر



میں کلرک بن گئے۔

ملتان کے زمانہ قیام کا ایک واقعہ قلیل ذکر ہے :

یہ خاکسار تحریک کے شباب کا زمانہ تھا۔ یہ تحریک ملاً سہنایت اللہ مشرقی اف : اگست ۱۹۶۳ء نے ۱۹۶۴ء میں شروع کی تھی۔ یہاں اس کے حسن وقوع پر بحث کرنا بھل ہو گا۔ جن لوگوں نے اس زمانے میں خاکساروں کو خاکی دروی ڈالنے، نندہوں پر سیلے رکھے، بازاروں میں نوجوی مارچ کرتے دیکھا ہے، وہی کچھ ان کے عزائم کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ راشد شروع سے نظم و ضبط کی زندگی کے قائل رہے تھے۔ انھیں خاکساروں کی تنظیم اور باقاعدگی بہت پسند آئی۔ غرض وہ اس تحریک میں شامل ہو گئے اور رفتہ رفتہ ضلع سمیر کے رضا کاروں کے سالار کے عہدے تک پہنچ گئے۔ لیکن ان لوگوں کی آمرتیت ان کے خلق سے نہ اتر سکی اور سال ہی سمیر بعد وہ اس سے الگ ہو گئے۔

ملتان کا یہ زمانہ ان کے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔ انھوں نے اپنی آمدنی میں اس کی غرض سے روسی مصطفی الیگزینڈرو پرین کے ناول "یاما" کا اردو میں ترجمہ کیا کہ شاید اس سے کچھ یافت ہو لیکن ناشر نے انھیں ایک جہہ بھی نہ دیا، بلکہ کتاب پر سوجنیت، ترجمہ ان کا نام تک شائع نہیں کیا۔

انقصہ صورت حال سخت نامنسل بخش تھی۔ خادم داری کی روز افزوں آمدوریا، تنخواہ قلیل، اور کام ان کے مذاق کے بالکل خلاف۔ ان کے لیے ملتان میں کوئی اور کشش بھی نہیں رہی، لیکن احتیاج انسان کو سب کچھ برداشت کر لینے پر مجبور کر دیتی ہے۔ بہر حال وہ یہاں سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے رہے۔ اور بالآخر مئی ۱۹۶۴ء میں آل انڈیا ریڈیو لاہور کے دفتر میں پروگرام اسٹنٹ کی نوکری مل گئی۔ چند ہفتے بعد اسی عہدے پر وکی تبادلہ ہو گیا اور یہاں ترقی کر کے پروگرام ڈائریکٹر کے عہدے تک پہنچے۔ ۱۹۶۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی اور ریڈیو کے محکمے کے ڈائریکٹر جنرل سید احمد شاہ

بھاری پطرس<sup>۹</sup> مرحوم (ف، دسمبر ۱۹۵۸ء) نے ادیبوں کی کمیپ کی کمیپ کو فوج میں عارضی کمیشن دوا کر محکمہ تعلقات عامہ میں سہرتی کرا دیا۔ اسی ریلے میں راشد سہی کپتان بن گئے اور عراق، ایران، مصر، سری لنکا (سیلون) میں چار برس گزار کر وسط ۱۹۶۱ء میں وطن واپس آئے، اور دوبارہ آل انڈیا ریڈیو سے منسلک ہو گئے۔ تھوڑے ہی دن لکھنؤ میں اسٹنٹ اسٹیشن ڈائریکٹر رہے تھے کہ ملک تقسیم ہو گیا اور بدھ پاکستان چلے گئے۔ پشاور و لاہور میں دو ڈھائی سال گزارنے کے بعد ان کا ریڈیو پاکستان کے مرکزی دفتر کراچی میں بحیثیت مدیر تعلقات عامہ تقرر ہو گیا۔ اس کے بعد کوئی دو سال پشاور میں ریجیل ڈائریکٹر بھی رہے۔

۱۹۵۲ء میں انھیں اقوام متحدہ (نیویارک) میں ملازمت مل گئی۔ اس سلسلے میں انھوں نے نیویارک، انڈونیشیا، پاکستان، ایران میں ۱۵-۱۶ برس گزارے ۱۹۶۳ء میں ملازمت سے پشن پرسبکدوش ہوئے، تو مستقل سکونت انگلستان میں اختیار کر لی۔ پہلے لندن میں ایک کرایے کے مکان میں مقیم رہے ۱۹۷۱ء کے اوائل میں "چیلنجر" میں اپنا مکان خرید لیا۔

ان کی پہلی بیوی ان کے ماموں کی بیٹی تھیں۔ اس بیگم سے ان کے پانچ بچے ہوئے، چار بیٹیاں: نسرتین، یاسمین، مشاہین اور حمزہ؛ اور ایک بیٹا: شہزادہ بھنگلہ سب سے بچے زندہ ہیں۔ شہزادہ پاکستانی سفارتخانہ برسلز (بلجیم) میں ملازم ہیں۔ (۱۹۷۵ء) بڑی دونوں لڑکیوں کی شادی ہو چکی ہے۔

اس بیگم کا اکتوبر ۱۹۶۱ء میں انتقال ہو گیا۔ اس زمانے میں وہ نیویارک میں مقیم تھے۔ یہاں ان کی چھوٹی بچی تمیزین یو این او کے اسکول میں پڑھتی تھی۔ اسکول میں اس کی استانی مس شیلہ انجیلیسٹی تھیں۔ اس خاتون کے والد اعلوی نسل کے اور ماں انگریز ہے۔ وہ خود ڈرامہ نگار ہیں۔ دونوں روماد اعلیہ کے انٹرنیشنل اسکول میں پڑھاتی رہیں اور جس زمانے میں راشد نیویارک میں تھے،

یہ وہاں یو، این، او کے انٹرنیشنل اسکول میں ملازم تھیں جب ماشد کی بیوی کا انتقال ہو گیا، تو انھوں نے دو سال بعد ستمبر ۱۹۹۳ء میں ان سے شادی کر لی۔ ان کے بطن سے ۱۹۹۷ء میں بیٹا پیدا ہوا جس کا نام انھوں نے 'نزیل' رکھا۔

جون ۱۹۷۵ء میں ان کے خسر مسٹر نجیلینی کا لندن میں انتقال ہو گیا، اور ان کی لاش جنونی لندن کے برقی شمشان میں جلائی گئی۔ ماشد بھی جنازے کے ساتھ تھے۔ جب لاش جل رہی تھی انھوں نے وہاں کے منتظیلین سے دریافت کیا کہ اس کا طریقہ کیا ہے؟ جب انھیں بتایا گیا، تو کہا یہ تو بہت آسان اور صاف خطرہ طریقہ ہے۔ بیوی سے کہنے لگے کہ جب میں مردوں، تو میری لاش بھی اسی طرح جلائی جائے۔ یہ بات انھوں نے بیوی سے پھر ایک موقع پر دہرائی، بلکہ جب ان کا بیٹا شہر یار برسلسزے لے کر لندن آیا، تو اس سے بھی کہا کہ 'میاں، میرے مرنے پر میری لاش برقی شمشان میں جلا دینا'۔

مسٹر شیلہ ماشد کا بھائی روما میں تھا۔ اس کی موت کا تار ختمہ بروہ روما چلی گئیں۔ روانگی سے پہلے انھوں نے ماشد سے کہا تھا کہ آپ بعد کو میری والدہ کو ساتھ لے کر روما آجائیے گا۔ ماشد ۱۰ اکتوبر کو اپنے مسکن چیلٹن ہم سے وہاں اسٹیڈ آئے۔ اسٹیڈ پر اترنے کے بعد وہ بکس ہاتھ میں لیے پیدل اپنی خوشدامن کے مکان گئے۔ انھیں انجنا تا کی شکایت پہلے سے تھی۔ ہاتھ میں بو جھل بکس لیے تقریباً میل بھر کے اس پیدل سفر نے انھیں بالکل نڈھال کر دیا۔ منزل مقصود پر پہنچنے کے کوئی دس منٹ بعد شام کے ساڑھے سات بجے ان پر دل کا دورہ پڑا اور اس سے پیشتر کہ کوئی طبی امداد پہنچ سکے، وہ جاں بحق ہو گئے۔ بیگم روما سے اور بیٹا شہر یار برسلسزے آئے، تو ۱۴ اکتوبر ۱۹۷۵ء دن کے چار بجے ان

یہ نام انھوں نے اپنے نام (نذیر محمد) کے پہلے تھے اور بیوی کے نام شیلہ کے آخری حصے سے قریب دگر بنایا ہے (وہ بیوی کو شیل کے نام سے پکارتے تھے) اور عربی میں نزیل کے معنی ہیں بہار

کے جسہ خاکی کو ان کی خواہش کے مطابق اجنوبی لندن کے برقی شمشان میں نذر آتش کر دیا گیا۔

چونکہ لاش کا جلانا، اسلام کی روایات کے خلاف ہے، اس لیے لندن میں تعیم میشر مسلمانوں نے تجیز و تحفین اور جنازے میں شمولیت نہیں کی تھی بیشکل سے آٹھ دن آدمی جنازے کے ساتھ تھے اور وہ بھی ان کے ذاتی دوست۔

راشد کے تین غریب چھپ چکے ہیں: (۱) مادرا (۱۹۴۲ء)؛ (۲) ایران میں اجنبی (۱۹۵۵ء)؛ (۳) لاؤ انسان (۱۹۶۹ء)۔ بعد کا کلام بھی مدون شدہ موجود ہے، اور یقیناً چھپ جائیگا۔ اس کے علاوہ انھوں نے بعض ترجمے کیے تھے، ان میں سے بھی تین شائع ہو چکے ہیں، کوہ پرین کے ناول ”یاما“ کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ ولیم سیروین کے ناول (Mupin) کا ترجمہ اور نورین آیز نے کا ناول (دقت کا آسمان) بھی چھپ چکے ہیں۔ آخری زمانے میں وہ جدید فارسی کا وسیع مطالعہ کر رہے تھے، اور انھوں نے ۲۰-۲۲ ایرانی مشاعروں کی تخلیقات کا اردو میں ترجمہ بھی کیا تھا، یہ تراجم بھی شائع ہو رہے ہیں

یہ کہنا مبالغہ نہیں ہو گا کہ جب ۱۹۴۲ء میں ان کا پہلا مجموعہ ”مادرا“ شائع ہوا ہے، تو ادبی اور تنقیدی حلقوں میں گویا سہو بخال سا آگیا۔ اس سے پہلے ہیئت کے تجربے تو ایک زمانے سے ہو رہے تھے، لیکن کہا گیا کہ انھوں نے صنعتِ ابہام کو بدعنا حد تک استعمال کیا ہے اور مغربی عربانی کھلے بندوں ان کے ہاں ہے، انہی اس سے پہلے کہیں اور نہیں ملتی۔ یہ جارحانہ تنقید میشر ان اصحاب کی طرف سے ہوئی، جو دکتوریائی عہد کے اخلاقی قواعد و ضوابط کے زیر اثر عورت اور اس کے متعلقات کا برسرِ عام و کر سبھی بد اخلاقی (بلکہ گناہ) تصور کرتے تھے۔ حیاتِ انسانی انسانی نے تو اپنی تنقید، نام راشد پر کے عنوان سے کتنا بچے کی فکری میں شائع بھی کر دی تھی۔ دلی نمبر ۱۹۴۴ء، لیکن ان کے بچے راشد نے ان مخالفانہ حملوں کی پروا نہ کی، اور اپنی انتخاب کردہ راہ پر گامزن رہے۔ ”لاؤ انسان“ کے شروع میں

ان کا ایک طویل مصاحبہ (انٹرویو) چھپا ہے، جس سے ان کی شاعری کے کئی گوشے روشنی میں آتے ہیں، اور اس سے ان کے کلام کے سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ بہر حال، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اردو شاعری کی تاریخ میں راشد کا مقام محفوظ ہے۔

نمونے کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

### بوئے آدم زاد

بوئے آدم زاد آئی ہے کہاں سے ناگہاں ؟  
دیو اں جنگل کے ستارے میں ہیں  
ہو گئے زنجیر پا خود ان کے قدموں کے نشاں !

یہ وہی جنگل ہے جس کے مرغزاروں میں صدا  
چاندنی راتوں میں وہ بیخوف و غم رقصاں رہے  
آج اسی جنگل میں ان کے پاؤں شل ہیں، ہاتھ سرد  
ان کی آنکھیں نور سے محروم، پتھرائی ہوئی  
ایک ہی جھونکے سے ان کا رنگ زرد  
ایسے دیوؤں کے لیے بس ایک ہی جھونکا بہت  
کون ہے باسبر مرد ؟

ایک سایہ دیکھتا ہے چھپ کے ماہ و سال کی شاخوں سے آج  
دیکھتا ہے بے صدا اثر و لیدہ شاخوں سے انہیں  
ہو گئے ہیں کیسے اس کی بو سے ابتر حال دیو  
بن گئے ہیں سوئم کی تشال دیو

ہاں اتر آئیگا آدیزادان شاخوں سے مات  
حوصلے دیووں کے مات !

گداگر

جن گندرگا ہوں پہ دیکھا ہے نگاہوں نے بہو  
یا سیر عورت کی آنکھوں میں یہ سہم  
کیا یہاں دتے شہرہ جاتینگے بس شہروں کا وہم  
میں گداگر اور مرا دیو زہ فہم

راہ پیمانی دعا اور عافیت کوشی گدا کا سنگ پا ،  
آ رہی ہے ساحروں کی ، شبہ سازوں کی صبح  
تیز پا ، گرداب آسا ، ناچتی ، بڑھتی ہوئی  
اک نئے سدرہ کے نیچے ، اک نئے انسان کی ہو  
تابہ کئے روکینگے ہم کو چارٹو !

کیا کہینگے اس نئے انسان سے ہم  
ہم تھے کچھ انسان سے کم ؟  
سنگ پر کرتے تھے ہم باران سنگ  
ستھی ہماری ساز و گل ، نغمہ و بھرت سے جنگ  
آدمی زادے کے سایے سے بھی تنگ ؟

داشتہ

میں ترے خندہ بیباک سے پہچان گیا  
کہ تری رُوح کو کھاتا سا چلا جاتا ہے

کھوکھلا کتنا چلا جاتا ہے، کوئی الم زہرہ گداں  
میں تو اس پہلی ملاقات میں یہ جان گیا

آج یہ دیکھ کے حیرت نہ ہوتی  
مذہبی آنکھوں سے چپ چاپ برسنے لگے اشکوں کے سحاب  
اس پہ حیرت تو نہیں تھی لیکن  
کسی دیر رائے میں بسنے ہوئے خوابیدہ پرندے کی طرح  
ایک مبہم سا خیال  
دفتہ ذہن کے گوشے میں ہوا بال فشاں  
کہ تجھے میری تمنا تو نہیں ہو سکتی  
آج لیکن مری بانہوں کے سہارے کی تمنا ہے صرف  
یہ ترے گریے فناک سے میں جان گیا —  
تجھ سے وابستگی شوق بھی ہے  
جو چکی چیلنے میں بیدار وہ دلسوزی بھی  
مجھ سے، مجبوراً نزل جس پہ ہیں مجبوراً نزل !  
نفسِ خود میں کی تسلی کے لیے  
وہ سہارا بھی تجھے دینے کو آمادہ ہوں  
تجھے اندوہ کی دلیل سے جو آزاد کرے !  
کوئی اندیشہ ہے تو یہی  
تیرے ان اشکوں میں اک لمحہ کی نو میدی کا پُر تو ہو لیکن  
اور جب وقت کی امواج کو ساحل مل جاتے  
یہ سہارا تری رسوائی کا اک اور بہانہ بن جاتے  
جس طرح شہر کا وہ سب سے بڑا مرد لٹیم

جسم کی مژدہ شبانہ دے کر  
 بن کے رزاق، تری تذلیل کیے جاتا ہے  
 میں بھی باہنوں کا سپارہ دے کر  
 تری آئینہ کی توجہ بن مجرم بن جاؤں  
 سبا ویران

سلیماں سر بزانو اور سبا ویران  
 سبا ویراں، سبا آسیب کا مسکن  
 سبا آلام کا انبار بے پایاں  
 گلیاں و سبز گل سے جہاں خالی  
 ہوائیں تشنہ باہاں  
 طیور اس دشت کے منقار زیر پر  
 تو سرمہ دو گلواناں  
 سلیماں سر بزانو، اور سبا ویران

سلیماں سر بزانو، ترغشتر و غلگین، پریشاں مٹو  
 جہاں گیری، جہان بینی، نقطہ طرآنہ آہد  
 محبت شعلہ پڑاں، ہوس بوسے گل بے بو  
 ز، زانہ و ہر کتر چو  
 سبا ویراں کہ اب تک اس زمین پر ہیں  
 کسی عیار کے غار نگروں کے نقش پا باقی  
 سبا باقی، نہ ہر دے سبا باقی  
 سلیماں سر بزانو

اب کہاں سے قاصدِ فرخندہ بے آئے  
 کہاں سے، کس سب سے کاسۂ پیری میں تے آئے



## شورش کشمیری، عبدالکریم (آغا)

ابو کا خاندان کشمیری، ذات برہمن، گروت ڈاوتھی۔ بزرگوں میں کوئی مشرف باسلام ہو گیا تھا نہ اب ان کے پردہ اوسر سنگر سے ہمارا جاگلاب سنگھ کے عہد میں تغل مکان کر کے امرتسر (پنجاب) میں آئے تھے۔ لیکن ان کے دادا امیر بخش آکھی بات پر ان سے ملازم ہو کر لاہور چلے آئے اور ایک دو (لاٹا رکھ) پر ایک تودرنگا کر کشمیری باقر خانی اور قلیہ بیچنے لگے۔ خوب کما اور خوب اڑایا۔

ان کے دو بیٹے تھے، ایک عبدالکریم کے والد نظام الدین (ف: ۱۳) پر مئی ۱۹۵۶ء ہمارے دوسرے ان سے بڑے جن کا عین غفلت و شباب میں عمر ۱۶-۱۷ سال تک محرقہ سے انتقال ہو گیا۔ باپ کی تو تم پرستی نے انہیں سمجھا یا کر بیٹا اس لیے ہاتھ سے نکل گیا کہ ہر وقت بکھنے پڑھنے میں مشغول رہتا تھا۔ انہوں نے حفظ و تقدم کے طور پر چھوٹے بیٹے کو اسکول سے لے لیا کہ اس پر کئی لمبے نہ آئے۔ اکلو مایا اور گھر میں فراغت لاڈ چاؤ کی کمی نہیں تھی۔ لیکن جاہل رہ گیا کوئی ستر بھی نہ سمجھا۔ جب تک باپ کا کامدار عروج پر رہا، یہ بھی عیش کرتے رہے۔ لیکن باپ کے چوبیس تھے، ان کے لیے تو تاروں کا خزانہ بھی کفایت نہیں کر سکتا تھا۔ دہر پڑھنے لگی، تو فکر ہوئی کہ بیٹا کیا کر لیا! ایک دوست کی دسترس سے ایک مین کے کا درخانے میں ملازم ہو گئے۔ دو ایک سال میں یہاں چل نکلے، تو ریلوے دفتر میں جگہ مل گئی۔ لیکن بعد کو پرانے ہمارے نام کے منبر مالک کے اصرار پر واپس چلے

آئے، اور پھر کہیں اور نوکری نہیں کی۔

عبدالمکریم ۱۴ اگست ۱۹۱۷ء کو لاہور میں پیدا ہوئے، تعلیم دیوبند، ہائی اسکول، انارکلی، لاہور میں پائی۔ ۱۹۱۶ء-۱۹۲۸ء کا ہندوستان سیاسی سرگرمیوں کے باعث شعلہ و تہلکہ مچا رہا تھا۔ سامنے کیشن میں کسی ہندوستانی کا شان نہ کرنا اور سہلک نے اپنی توجہ تھیوٹریا اور اس سے تحریک آزادی کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ نوجوانوں پر اس کا خاص طور پر بہت گہرا اثر ہوا۔ شہر خفیہ اور دہشت پسند جماعتیں قائم ہو گئیں۔

اسی زمانے میں عبدالمکریم نے ایک ہندو دوست کے ساتھ مل کر، بال بھارت سبھا قائم کی۔ عبدالمکریم نے بہت کم عمری میں مولانا ظفر علی خان (ف: نومبر ۱۹۵۶ء) کے دوڑنے "زمیندار" کا باقاعدہ مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ یہ اخبار گھر میں آتا تھا، ان کی دادی نے اسے پڑھا کرتی تھیں۔ عبدالمکریم نے یہ عادت انھیں سے لی۔ زمیندار کی ڈاک ظفر علی خان کی خطابت اور صحافتی شاعری۔ ان سب باتوں کا نوجوان عبدالمکریم کے کردار اور مستقبل کی تشکیل میں بڑا اثر تھا۔

اب عبدالمکریم باقاعدہ سیاسی تحریک میں شامل ہو گئے۔ انھوں نے مسکے پہلی تقریر جولائی ۱۹۳۵ء میں شہید گنج کے منگے کے دفن میں شاہی مسجد لاہور میں کی۔ اس پر گرفتار کر لیے گئے، مقدمہ چلا، اور دو سال قید اور تین سو روپے جرمانے کی مندرجہ لیکن اپیل میں جرمانہ معاف ہو گیا، اور یہ ایک ماہ کی حوالات اور تین ماہ کی قید کے بعد مل چکا تھا۔

لیکن اس کے بعد جیل جانا گویا آئے دن کی رسم بن گئی۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۹ء تک ہریانہ جیل میں گزرے، اور ستمبر ۱۹۳۹ء سے آدھ ۱۹۴۴ء تک سسلی پانچ سال، اگرچہ مناسبات برس کی ہوتی تھی۔ حالات کی سنگینی کا کچھ اندازہ اس سے کیجیے کہ ۱۹۴۴ء تک یعنی جب ان کی عمر صرف ۲۷ برس کی تھی، وہ اس کا ایک تہائی (یعنی ۹ برس) جیل میں بسر کر چکے تھے۔ (دوبی ۱۹۳۹ء میں وہ مجلس اہلکار میں شامل

ہو گئے۔

اب سوال یہ تھا کہ لبر اور حالت کی کیا صورت ہو۔ ان کی صلاحیتوں اور اوقات و طبع کو دیکھتے ہوئے احباب نے سوچ بچاؤ کے بعد طے کیا کہ ان کے لیے ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا جائے۔ ایک سمدرد و مختصر دوست نے دو خزانہ دار پے کا عطیہ دیا جس سے مکتبہ احرار کے نام سے ایک ادارہ وجود میں آیا۔ لیکن یہ نام ہی اسے لے ڈوبا۔ شہید گنج کے قہقہے کے بعد مجلس احرار کی ساکھ عوام میں کوڑی بھری نہیں رہی تھی۔ اب بھلا ان کے نام پر قائم کردہ ادارہ کیونکر کامیاب ہو سکتا تھا؟ نتیجہ یہ ہوا کہ اگرچہ اس کتبے کی طرف سے تین کتابیں شائع ہوئیں، لیکن نفع جو کبھی رہا ہو، عبدالمکریم کو اس میں سے ایک پائی نہیں ملی۔ رفتہ رفتہ سارا سراپہ بھی شغلوں کی سہل انگاری اور نا تجربہ کاری کے باعث ضائع ہو گیا۔

اب سب لوگ ان سے شادی کے لیے اصرار کرنے لگے۔ بالآخر ۲ مئی ۱۹۴۵ء کو ان کی انبائے میں شادی ہو گئی۔ دھن (نور زیدہ) ان کے اموں کی بیٹی تھیں۔ یہ انھیں لے کر لاہور واپس پہنچے، تو دعوتِ اہلبیت میں دوسرے احباب کے ساتھ مولانا ظفر علی خان گیا تھے۔ انھوں نے اوجھڑاؤ میں شعر کا قطعہ کہا:

گرجم یکے قاصد یہ مسرت نہ پیام آیا  
کہ انبائے سے شورش ایک پھندہ ناسی و طغی لایا  
سرے دل سے دعا نکلی کہ اس جہنم کے سرور  
نہی کی رحمتوں کا اور خیر کے فضل کا ساتا  
مبادک ہو تمہیں شورشِ بیری خاندانِ باوٹی  
تسے گھر آگئی اک اور انگریزوں کی فریاد

بعض وجود بہت باہر کھڑے ہوتے ہیں، خاص طور پر بیوی۔ تھے دایہ جڑھ جاتی ہے اور انسان میں کام کرنے کا تیا دل اور نئی ہنگام پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی صورت یہاں بھی پیش آئی۔ شادی کے بعد عبدالمکریم نے انتہائی سنجیدگی اور فرض شناسی کے احساس سے مستقل

آمری کے وسائل پیدا کرنے پر زور تھی، اور بفضل اس میں انھیں کامیابی ہوئی۔ انھوں نے مختلف ماحول کے ان سے اجرت پر کام لیا۔ ان کے مسودوں کی تصحیح، ترتیب، نظر ثانی کے علاوہ خود بھی کچھ لکھتے، اور اس طرح چار پانچ سو روپے ماہانہ یافت ہونے لگی۔ پھر مشہور کانگریسی لیڈر لالہ سٹری داس (وفات، جولائی ۱۹۶۹ء) کے داماد پرچھو چندر کے دوستوں ذمے میں وزیر پنجاب بھی رہے) ساتھ مل کر ایک پبلشنگ ہاؤس قائم کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد (وفات، فروری: ۱۹۵۸ء) کی مشہور کتاب 'غبارِ طرہ' کا دوسرا ایڈیشن (جس میں موسیقی سے متعلق ایک خط کا اضافہ تھا) اسی ادارہ نے شائع کیا تھا۔ اس ادارے کی طرف سے بعض اور کتابیں بھی شائع ہوئی تھیں، لیکن تقسیم ملک میں اس کا سارا اثاثہ برباد ہو گیا۔

آزادی ملک سے پہلے مجلس احرار کی طرف سے تھوڑی مدت کے لیے ایک روزنامہ 'آفاقہ' نکلا تھا۔ اس کے شعبہ ادارت میں کئی نام تھے، لیکن یہ امر واقع ہے کہ اس کا بیشتر کام شوخی ہی کرتے تھے۔ لیکن یہ پرچہ دولت مستعمل ثابت ہوا۔ تقسیم ملک کے ساتھ ہی یہ بند ہو گیا۔ تقسیم کے ساتھ ہی انھوں نے مجلس احرار سے اپنا تعلق ختم کر دیا اور اس کے بعد کسی سیاسی جماعت کے رکن نہیں بنے۔ اب انھوں نے صاف کواپنا اور ڈھنڈا بھونٹا بنالیا۔ ۱۹۴۷ء میں انھوں نے اپنا سہفہ 'وطن چان' جاری کیا، جو آج تک باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔

سلسلہ قید کی زندگی نے ان کی صحت خراب کر دی تھی اور وہ اکثر بیمار رہنے لگے تھے۔ ۲۷ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو تیز معدہ کا شدید درد پڑا جس پر بغرض جلان ہوسپتال (لاہور) میں داخل ہو گئے۔ دو تین دن کی دواؤں سے کچھ افادہ ہو گیا، سب نے اطمینان کی سانس لی لیکن بعد ۲۴ اکتوبر کی شب میں طبیعت ایک گھنٹہ پھر خراب ہو گئی اور نصف شب کے تھوڑی دیر بعد (ساتھ سے) ۲۵ اکتوبر ۱۹۷۵ء کے آدلی نقت حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال پا گیا۔ ان کا انتقال لاہور کے ایک مشہور ہسپتال میں ہوا اور ان کو وہاں سپردِ خاک کیا گیا۔

جان بحق چھو گئے۔ جنازہ بروز سبت ۲۵ اکتوبر کی شام میں اٹھا اور میانی صاحب کے (مشہور قبرستان) میں سپرد خاک ہوئے۔ چادر لٹکے اور سات لڑکیاں جسافانی یادگار چھوڑیں۔

رئیس امر وہوئی نے ماتحت بھیجے !

یاد شورش میں ہے اشکوں کی تراوش! لے دل!  
 اور نیسے میں غم بھر سے سوزش! اے دل!  
 سوزش غم میں نہاں فکر کی کاوش! اے دل!  
 مائل شورش میں غم ہے غم شورش! اے دل!

۶۱۹۷۵

ان کی نیلیم جیسا کہ بچپن میں، ناممکن رہ گئی تھی۔ لیکن انھوں نے وسیع مطالعے سے یہ کسی پوری کر لی۔ خوش بختی سے انھیں اپنے عہد کے شاہ پر علم و ادب کی رفاقت اور صحبت کے مواقع ملے اور انھوں نے ان سے پوری طرح استفادہ کیا۔ ان پر مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا طغر علی خانؒ، اور سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کا خاص اثر رہا۔ مولانا آزادؒ سے شعر کا پرشکوہ انداز سیکھا؛ مولانا طغر علی خانؒ کے تتبع میں صوفی شاعری وغنیاد کی؛ اور عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی پیروی میں وہ شعلہ بیان خطیب بن گئے۔ مولانا آزادؒ کی معنوی شاگردی پر انھوں نے خود یوں فخر کا اظہار کیا ہے:

کس ذلیل قلم کار سے تعلق کیا!

را کا شکر ہے، تلمیذ ابوالکلام ہوں میں۔

موضوعاتی ہنگامی شاعری میں طغر علی خانؒ کو جو یہ طویل حاصل تھا، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ شورش اس میدان میں ان کے قدم بقدم چلے اور اس میں ایسی جہت خاک کا میابی حاصل کی کہ خود مولانا طغر علی خانؒ کو یہ مسئلہ دنیا بڑی

شورش سے مراد شے ہے، اور وہ اذلی

میں دھن کا کھم ہوں، تو وہ ثانی بہر باب

اسی باعث رشید احمد مدنی نے کہا تھا: شورش کشمیری ابوالکلام کے طنز، نظم اور غزل علی خان کے بہتہ افشا کا وارث ہے ؟

انھوں نے مختلف اوقات میں اپنے کلام پر مولانا ظفر علی خان، جہور نجیب آبادی اور احیاء دانش سے اصلاح لی، بلکہ احسان قادری سوانحی میں لکھتے ہیں کہ پہلے یہ الفت تخلص کرتے تھے، شورش تخلص انھیں احسان ہی نے دیا تھا؛ نیز وہ آخر تک اپنا کلام انھیں دکھاتے رہے۔ وہ کبھی کبھی اسراء / اسرار بصری کے قلمی نام سے بھی لکھتے رہے۔ یہ نام انھوں نے ۱۹۲۲ء میں جیل سے رہائی اور گھر پر نظر بندی کے دوران میں اختیار کیا تھا کیونکہ ان کی نقل و حرکت اور تحریر و تقریر پر پابندی عائد تھی۔

نظم و نثر کا خاصا ذخیرہ ان کی زندگی میں شائع ہو گیا تھا۔ ان میں چار کتابیں (۱) ہسٹری ٹائٹل، (۲) دو چراغِ فضل (۱۹۷۲ء) (۳) ادوی ملک سے پہلے کی سوانحی (۲) پس دیوارِ دہقان (۱۹۷۲ء) سے پہلے، جیل کی دس سالہ مالتا (۲)؛ (۴) موحسے واپسی (عبد القیوم) میں ایسری کے ۲۲۲ دن کی کہانی (۴)؛ تغز خدمت (ساہیوال جیل کے تین مہینے سترہ دن کے حالات) گویا خود نو شخص سوانح کا حصہ ہیں (۵) "شب جاے کہ من بودم" سفر نامہ مجاز ہے

ان کے کلام کے تین مجموعے شائع ہوئے۔ (۱) گفتنی ناگفتنی (۲) چہ قلندرانہ گفتنی (۳) الجباد، الجباد، انھوں نے بعض شاہرہ عید کے تاشراتی خاکے بھی لکھے تھے۔ (۱) حسین شہید سہروردی (۲) حمید نظامی (۳) میان انقلاب و دین (۴) حیدر عطا اللہ شاہ شجاعی۔ چہرے: مختصر خاکے (دکراچی ۱۹۷۵ء)

ایک کتاب اس بارادریں "بزمِ تہ خانے کی کہانی ہے" فیضانِ اقبال "میں علامہ اقبال کے خطبات، مقالات، ارشادات اور خطوط "کا افسردہ و عصاہ" (درس) پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں اقبال کے خیالات کو دس مختلف عنوانوں کے تحت جمع کیا ہے۔ اور کبھی کبھی کتابیں ہیں۔

ان کا کلام بہت قسا ہے۔ بطورِ نمونہ صرف ایک شعر نظم پر ان کا فکر تاہوں۔

## شیرالدواب عند اللہ

زبان بگڑی، قلم بگڑا، روش بگڑی، چلن بگڑا  
 خود اپنے ہاتھ سے کافر گردن کا پیر بن بگڑا  
 چلا کھینز کا جھکڑ کہ شرق و غرب کا نب اُسے  
 اُنہی دشنام کی آندھی، مزاجِ اہرمن بگڑا  
 جیا منقود، غیرت ننگوں، خونِ خدا غائب  
 کچھ اس انداز سے بدعت فروشوں کا چلن بگڑا  
 کروں طولِ سخن، تو بات حرفِ ناروا ہوگی  
 کلامِ مختصر یہ ہے کہ ہر لات و روشن بگڑا  
 میں اکڑ سوچتا ہوں کس طرح سے ان کو سمجھاؤں  
 یہ جو کچھ کر رہے ہیں، اس سے نظمِ انجمن بگڑا  
 یہی وہ گفتگو ہے، ناز ہے جس کی بلاغت پر  
 یہی وہ مہم ہے، جس سے اسلوبِ سخن بگڑا  
 خدا کے ایک بندوں کو کہاں تک گالیاں دوں گے؟  
 کر دے کیا، اگر اس پر خدا سے ذوالیقین بگڑا  
 "گئے منہ بھی چڑانے، دیتے دیتے گالیاں ماحیا!  
 زبان بگڑی تو بگڑی تھی، خبر سب سے دہن بگڑا"

## ہزار لکھنوی، سید حسن

ان کے مورث نقوی سادات میں سے تھے۔ دعایت ہے کہ ان کے بزرگ عہد شجاع الدولہ (۱۷۵۳ء - ۱۷۸۵ء) میں ایران سے لکھنؤ آئے اور یہاں بلند مراتب پر فائز ہو گئے۔ سید حسن ہزار نے شاعری گو یا ورثے میں پائی۔ ان کے والد سید جعفر حسین عرف محمد صاحب شعر کہتے اور بہادری سے لکھتے تھے؛ وہ سائنات القوم سید علی نقی صفی لکھنوی (ف، جون ۱۹۵۰ء) کے شاگرد تھے۔ لالہ مرزا رام نے انہیں فصاحت کا شاگرد دکھا ہے، لیکن ہزار ایک تحریر میں انہیں صفی کا شاگرد کہتے ہیں۔ ممکن ہے، دونوں سے یکے بعد دیگرے شوق رہا ہو، یا شاید لالہ مرزا رام کو غلط اطلاع ملی ہو لکھنؤ کی انجمن معین الادب اپنی ادبی سرگرمیوں اور خدمات کے لیے کسی زمانے میں معروف تھی۔ اس کے سالانہ مشاعرے بڑے بزرگ واقعات ہو کر تے تھے جن میں باہر کے شاعر بھی شریک ہوتے۔ بہادریوں اس انجمن کے سکریٹری۔ جب ان کا انتقال ہو گیا، تو ان کے احباب نے ان کے لکھنؤ کی تجویز پر اس انجمن کا نام بدل کر "انجمن بہادری ادب" کر دیا۔

بہادریوں کے والد ہی تھے۔ ان کے علاوہ نئے آغا صاحب لکھنوی، حکیم محسن آغا صاحب آفتاب، سید محمد ہادی، عزیز بھی ان خاندان کے فرد تھے۔ گویا ان کے پچیس میں چاروں طرف کاخند: سید علی ہمدی (خیر الدین کے بیٹوں)، سید ابوالفضل لکھنوی اور کاظم علی خان صاحب (خیر الدین کے بیٹوں)۔



شاعری کا چہرہ چا تھا۔ گھر کی مشورات تک اس سے مستثنیٰ نہیں تھیں۔ ہزار نے ہی  
 احوال میں پورے پائی۔ بچپن ہی میں وہ اپنے والد بہار کے ساتھ مشاعرے میں جانے لگے  
 تھے؛ وہاں اپنے والد ہی کے کہنے ہوئے چند شعریہ ردیتے۔ ہزار نکلیں بھی والد کے نکلیں  
 جاہ کی مناسبت سے اختیار کیا تھا۔ انیس کو بہار کا بھی جلد انتقال ہو گیا، اور یہ ان  
 سے استفادہ نہ کر سکے۔ بالآخر جب اقامتہ شاعری کرنے لگے تو مولانا عبد الباقی انکی  
 زلف، بخوری ۱۹۴۶ء) سے اصلاح کا رشتہ قائم کر لیا۔

ہزار کی ٹھیک تاریخ ولادت معلوم نہیں ہوگی۔ والد کے بعد ان کے چچا ماسٹر جی حسین  
 ان کے کفیل ہوئے۔ وہ انھیں اپنے ساتھ سینا پورے گئے اور وہاں ان کا گورنمنٹ  
 ہائی اسکول میں داخلہ ہو گیا؛ ۱۹۴۱ء میں دسویں کی سند ملی۔ اس کے بعد تعلیم جاری نہ رکھ  
 سکے اور مذہبی شاعری کی اُنھیں کوئی اور کام کرنے کی فرصت دی۔ اگرچہ انھیں تعلیم  
 پھر زیادہ نہیں تھی، لیکن انھوں نے ذاتی مطالعے سے اس کی بہت حد تک تلافی کر لی  
 تھی۔

وہ شروع میں لکھنؤ پرنسپل بورڈ میں لازم ہوئے لیکن یہاں غالباً زیادہ دن نہیں رہے۔  
 ۱۹۴۷ء کے الگ بھگ راجا رانے گڑھے انھیں آباد دہرائی شاعر مقرر کر دیا۔ بعد کو  
 وہ راجا صاحب موصوف کے ادبی سکریٹری بھی بن گئے۔ ایک موقع پر خوش ہو کر راجا صاحب  
 نے انھیں تین تہے سونے کا میڈل اور "عندلیب" میں خطاب عطا فرمایا تھا۔

انھیں تپ دہی کا پرانا نانا، خضہ تھا۔ اس کے علاوہ خون کے کم و پاؤ اور زہل کی تکلیف بھی تھی۔  
 بہت علاج ہوئے۔ اپنی حکومت نے بھی علاج کے لیے امداد دی اس سے حالت کچھ بہتر ہو  
 گئی۔ ۳ نومبر ۱۹۷۷ء کو کبھی کام سے کا پورہ گئے۔ وہیں شام کے وقت ایک چوڑی میں  
 دل کا شیدہ دردہ پڑا۔ اور آنا نا جان بخت ہو گئے۔ اگلے دن (۴ نومبر ۱۹۷۷ء)  
 کو کا پورہ ہی میں باطنیوں کے کچھے کے سامنے ٹیکہ جٹو شاہ میں سپردِ خاک کر دیئے گئے۔  
 کہاں عمر بسر کی، اور کہاں کی سن تھی۔ سچ ہے "فَاَنْذِرِيْ نَفْسِيْ يٰ اَيُّهَا الْمَرْءُ  
 نَفْسِيْ يٰ اَيُّهَا الْمَرْءُ عَلَيْنَا خَيْرٌ"

وے گڑھ کے قیام کے زمانے میں شادی کی تھی، اس جنگم کے بطن سے ایک بیٹی (لیکن) ہوئی  
یہ اشاء اللہ زندہ ہیں اور اپنے خاندان کے ساتھ نکستھیں رہتی ہیں۔ ہزاروں اس بیوی کا  
جلد ہی انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد انھوں نے کارج پشانی نہیں کیا، بقیہ عمر تحریروں میں  
گزر ادوی۔

انھوں نے غزل، سلام، قصیدہ، نظم، بہت کچھ لکھا۔ انھوں نے کوئی مجموعہ کلام ان کی  
زندگی میں شائع نہیں ہوا۔ تلاش بسیار کے باوجود ان کا کلام دستیاب نہیں ہوا۔ صرف  
ایک غزل ملی، اسی کو چون کا توبہ ہیں کر رہے ہیں۔

جلو، حق آشنا، آج منہ باطل نہیں  
صاحبان فکر جو چاہیں، تیرے وہ فیصلہ  
یرے ماتھے کی پیکر، ہیں جلالِ شرفی  
اب خدا ہی نالو ابن جائے تو ہے اور رہا  
ظلم و جانے کے لیے بھی حوصلہ دو کا رہے  
ایک ہے اپنے لیے، وہ دھوپ یا چھانو ہو  
ہیرانی سے تری، بستر تغافل تھا ترا  
اپنی عزت و عہد شاہی کی حدود سے دودھ

کوئی بھی سینہ مرے دل کا مقل نہیں  
میں ہی کہتا رہو لگا، میں کسی قابل نہیں  
میں بغیر بیٹو اتو ہوں، مگر سائل نہیں  
دور میری حدِ ماکاں میں کہیں ساحل نہیں  
جنگل کے ذہن اعلیٰ کا کوئی تامل نہیں  
ہم مسافر ہیں، باری کوئی بھی منزل نہیں  
وہ بھی کوئی بات ہے، جس کا کوئی حال نہیں  
شویشِ طوفان وہیں عشرتِ ساحل نہیں

اسے ہزار ہا اس دور میں حلقہ کی منزل قرار دے

یہ صولے صولے، آوازِ شکستِ دل نہیں

## طالب دہلوی شیش چندر سکینہ

دلی کے ایک متمول کاشتہ (سکینہ) گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد راسے صاحب ہمیشہ داس (انگریز) جیٹ (سکینہ) کا اہلہ چھاؤنی میں شراب فروش کا بڑا وسیع کاروبار تھا۔ کسی زمانے میں پورے پنجاب (قبل آزادی) میں مسکراہٹ کا ٹھیکہ اسی خاندان کے پاس تھا۔ خاندان کے قوتی کا اہلہ کچھ اس سے کہیے کہ دلی میں دریائے جہاں کا پرانا پل طالب کے دادا راسے صاحب ساگ رام (ف: ۱۹۱۷ء) نے حکومت سے ٹھیکہ لے کر تعمیر کروایا تھا۔ ایک مرتبہ انھوں نے کالکٹ کے مندر دلی کے پاس کاشتہ بڑا دلی کا جلسہ کیا۔ اس میں آٹھ ہزار آدمی نے شرکت کی تھی، سب لوگ راسے صاحب ساگ رام کے مہمان تھے کہا جاتا ہے کہ اس جلسے پر ان کا ایک لاکھ روپیہ خرچ ہوا تھا

زادہ بدلتے دیر نہیں بگتی۔ کچھ دے صاحب ہمیشہ داس کی تہاوت کے جوڑے توڑے ناواقفیت اور بڑی حد تک آسامیوں کی بے ایمانی کے باعث کاروبار میں سخت نقصان ہوا۔ جن لوگوں سے لینا تھا، انھوں نے دینے سے انکار کر دیا، جنہیں لینا تھا، وہ تقاضا کرنے لگے۔ راسے صاحب نے کسی لوگوں کو اپنی ضمانت پر مختلف جگہ سے قرض دوار کھا تھا، قرضداروں نے یہ حالت دیکھی تو اپنے واجبات کا مطالبہ ان سے کر دیا، اور یہ بھی دینا پڑے۔ غرض یہ کہ دیکھتے دیکھتے لاکھ لاکھ ہو گیا۔ لیکن کسی چیز کو دوام نہیں جس طرح وہ وقت بھن گئی اور خاندان پھراپنے پانوں پر کھڑا ہو گیا۔

طالب کی پیدائش ۱۳ فروری ۱۹۱۰ء کو انبالہ چھاؤنی میں ہوئی تھی۔ اس سے ایک چھوٹے بھائی ایش چند ایم اے دلاوت ایکم ایچ ۱۹۱۵ء میں، جنہوں نے صافیت کو بطور پیشہ اختیار کیا۔ اس کا والدہ جیات ہیں۔

طالب کی ابتدائی تعلیم انبالہ چھاؤنی میں ہوئی اور انہوں نے ۱۹۲۷ء میں بنارس وکس این اسکول، انبالہ چھاؤنی سے دسویں کی سند لی۔ اس کے بعد ریاضی، طبیعیات، کالج، دہلی میں داخلہ لیا جہاں سے ۱۹۲۸ء میں دہلی یونیورسٹی سے انٹر کا امتحان پاس کیا۔ اسی دوران میں ۹ اپریل ۱۹۲۷ء کو ان کے والدہ اے صاحبہ ہیش داس کا انتقال ہو گیا۔ انٹر کے بعد انہوں نے بی اے میں داخلہ لیا تھا لیکن گھر کے تبدیل شدہ حالات کے پیش نظر وہ تعلیم جاری نہ کر سکے، اور یہ سلسلہ مجبوراً منقطع کرنا پڑا۔ رفتہ رفتہ جب حالات سدھ گئے اور پھر فرصت نصیب ہوئی، تو انہوں نے بی اے ۱۹۳۲ء میں ہندو کالج، دہلی سے پاس کیا۔

ایش لاکھ نے، پھر بھی سوال لکھ کا بہت اچھے تھے، تاہم ان کے فضل و کرم سے گھر کی مالی حالت اس قدر خراب ہوئی کہ انہیں بسراواتا کے لیے کسی نوکری کی ضرورت پیش آئی، لیکن یہ کار کی زندگی بھی تو نہیں کشتی، اور ۱۹۲۷ء سے شریک بن گئے تھے، پھر اس میں اپنے بھوپیا نشی بہادر بیہار برق و لوی رف: فروری ۱۹۳۶ء سے شروع کیا۔ برقی خود آفا شاعر بن گیا رف: مارچ ۱۹۳۰ء کے شاگرد تھے۔ اس طرح گویا طالب کا سلسلہ داخلہ کے واسطے سے خاندان ذوق سے جاملے۔

شیر گونی کے شوق نے طالب کو اس کا کردہ صفائی چینگے۔ اس دن نے بیوش بندھو گپتا رف: نومبر ۱۹۲۸ء کے اخبار ”نیچ“ کا طویل بولتا تھا۔ طالب صحافت کی تربیت حاصل کرنے کو اس کے دفتر پہنچے کسی معاد غصے یا تنخواہ کے بغیر چھ ماہ وہاں کام کیا۔ اس کے بعد حکومت ہند کے ”اسٹار آف جیکل“ (ادو) ، امپکن ریلوڈ، ڈسٹریکٹ (ہماچل) اور بعض اور پرچوں سے تعلق رہا۔ کہیں طویل، کہیں مختصر، لیکن کسی جگہ غنفل تعلق قائم نہ کر سکے۔

ان کی وضع داری کا ایک قصہ سنئے:

سچہ چھا اس طرح کہ برقی کی بوجا، طالب کے والد (دے ہیش داس) کے گئے چھا کی صاحبزادی بنیں۔

نشی ہمارا بیجا رہا، برق کا انتقال بہت اچانک اور انفرسناک حالات میں ہوا تھا۔ ۱۲ فروری ۱۹۳۶ء کو وہ اپنے دوست صاحب شگن چندوشن پانی پتی کی صاحبزادی کی شادی کی تقریب میں شرکت کے لیے پانی پت گئے؛ وہی کے کئی اور شعرا بھی گئے تھے۔ وہیں شب میں ان کی طبیعت خراب ہو گئی، اور اسی حالت میں حرکت قلب بند ہو جانے سے حث پٹ ہو گئے۔ صاحب نے ۱۹۳۷ء میں ان کی برسی کے دن اپنے مکان پر ایک شاعرے کا انتظام کیا۔ اس کے بعد ۱۹۴۶ء کو چھوڑ کر چونکہ اس سال فرقہ وارانہ فسادات کے باعث فضا بہت کدھائی، یہ سلسلہ بلاناغہ ۱۹۵۰ء تک جاری رہا۔ ۱۹۵۱ء میں شری حتر گیت سبھلے پنکیش کی کو آئندہ یہ شاعرہ ان کی عبادت میں ہوا کرے۔ وہاں ۱۹۶۱ء میں پیسواں (جولہ) منتر ہوا، اور اسی کے ساتھ یہ سلسلہ بند کر دیا گیا۔

۱۹۳۲ء میں ان کی شادی گوالیار کے ایک معزز گھرانے میں ہوئی، چند رکاردی بیوی کا نام تھا، اولاد میں خدا نے تین بیٹے اور ایک بیٹی عطا کی۔ تینوں بیٹے صغیر سن میں واداع منفا وقت وے گئے، یہ بیٹی (سنگیت) بچہ دم زندہ ہیں۔ ان کی شادی ڈاکٹر روشن مرادی نائل سیکٹ کے ساتھ ہوئی تھی؛ جو آج کل کیلیڈ اسکے شہر ہیلٹن کے اسپتال میں ماہر امراض داخلی کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ میاں بیوی اپنے بچوں کے ساتھ وہیں مقیم ہیں۔

طالب صاحب اپنی بیٹی اور اس کے بچوں سے ملنے کے لیے وسط ۱۹۷۰ء میں کینیڈا گئے تھے۔ وہاں سے تھری ماہیں آئے۔ پہلا ہجرت بالکل ٹھیک تھی۔ لیکن کسے معلوم تھا کہ موت اتنی قریب ہے۔ ۱۳ نومبر ۱۹۷۰ء صبح کے وقت فالج کا حملہ ہوا؛ ۱۵-۱۶ کی شب میں ڈیڑھ بجے علی الصبح (ارون اسپتال ہی میں جان بحق ہو گئے۔

طالب کو نظم و نثر دونوں سے یکساں مزاولت تھی۔ ترجمہ بھی اچھا کرتے تھے۔ ان کے ترجمہ شدہ افسانے مختلف رسالوں میں منتشر ہوئے ہیں۔ ان کی یہ کتابیں بچپن چلی ہیں: (۱) دن والا، شعری انتخاب؛ (۲) حمد و ناکام؛ برق صاحب سے متعلق مضامین؛ (۳) یادگار ورتنا؛ برق صاحب سے متعلق مضامین (۱۹۳۵ء تا ۱۹۶۱ء)؛ ہمارے حسین (دلی ۱۹۴۵ء)؛ (۵) انوار نظر؛

(۶) خدنگ ناز؛ (۷) خشتان کفی (دلی ۱۹۵۱ء)؛ (۸) کشمیر کی سیر، سفرنامہ (دلی ۱۹۶۶ء)  
 (۹) سبز و بیگانہ: مغرولوں کا انتخاب (دلی ۱۹۶۸ء)؛ (۱۰) یہ کتنی دلی (۱۹۳۷-۱۹۴۷ء)  
 کی دلی کی ادبی سرگرمیوں کی داستان (دلی ۱۹۷۵ء)

کلام نچتہ ہے جس میں ابتذال کا شاہد تک نہیں مضمون آفرینی کی کوشش ہر صفحے سے عیاں ہے کلام نچتہ اور بے عیب ہے۔ کہیں کہیں زبان کی چاشنی بھی ملتی ہے چند شعر بطور نمونہ درج ذیل ہیں:

کسی کو غم کس کا ہے، کسی کو غم کس کا ہے بے عنوانِ دگر، سب ایک ہی افاد کہتے ہیں  
 مری غلطی تھی مہ دیتے اگر نگاہ بے نگاہ دی ہے تو مجبورِ اختیارِ سوں میں  
 دھول جو تنگ نظر ہے اس قدر بھرا اسی میں وسعتِ کون و مکان نکلیگی  
 اس قید کا مزاجیں ہر ایک کو نصیب بھینے کا لطفِ حلقہ دار درسن میں ہے  
 یہ اختیارِ اوشا ہے ہر ایک نفس نہ برز میں یگانہ و بیگانہ ایک ہے  
 سکونِ دلی نہیں جس کے نصیب میرا بابا اے کہیں کبھی میسر خوشی نہیں ہوتی  
 محبت، امارے کھر دیں ہے محبت کا کوئی مذہب نہیں ہے  
 محبت، حسن ہے، حسنِ آخری ہے محبت، حسن سے بڑھ کر عیس ہے  
 بھروسہ کیا کرے کوئی کس پر! جو اپنا ہے، وہی اپنا نہیں ہے  
 ہوئے جاتے ہیں آپ کیوں برہم ہم زمانے کی بات سمجھتے ہیں  
 تم پر اپنا گماں ہوتا ہے تم سے جب دل کی بات کہتے ہیں  
 لذت ہے بہار کی خسراں سے جب موت نہیں، حیات کیا ہے!  
 محرومِ دید ہی رہی، یہ اور بات ہے حیرانگاہ تک تو عبادی نظر لگی

اے عقل میں بھی تنہا سمجھو جسے احساس ہو تنہائی کا

ہم کو بڑھ کے کچھ ان سے طا؛ وقت آیا ہے پذیرائی کا

گل ہوئی ہے نہاں تو دل سے، نظریں ان کے ڈل گئی ہو

یہ دل لگی ہے، تو باز آئے، خباب! ہم بس دل لگی سے

تجسس زور مضبوطی سے کہہ دو یقین کیسے کسی کو آئے  
تھکے وعدے کا تھیک ہی کیا، تھکی کسی سے کبھی کسی سے  
دکھینگے کیا یاد رکھنے والے کو آئے تھے نیرم آٹ گل میں  
جو زندگی کے یہ چاروں بھی کٹے نہ طالب نہیں خوشی

دکھ دنیا آسان بہت ہے      دکھ سہنا آسان نہیں ہے  
دلفت خود عنوان ہے اپنا      اس کا کچھ عنوان نہیں ہے  
اوروں کے جو کام مڑ آئے      کام کا وہ انسان نہیں ہے  
مجھ سے ذکر کرے کوئی آشیانے کا      جن پرست ہوں، مجھ سے حسن کی بات کرو  
اب غوشی میں بھی بھر آتی ہیں ہمدردی آنکھیں

وقت بے وقت کی ہر ساعت کہاں تھی پہلے!  
شاہوگماں کوئی اس طرح داؤد محبت میں      کر دہ اپنا، نہ دل اپنا، نہ پہلو میں جگر اپنا  
کرم سے، دوسے، اخلاق سے، ہر مرد و گھ      مرا جی ہے، بنائے تو دل دشمن میں گھر اپنا  
پروے میں عنایت کے جو ہوتا ہے نمایاں      ناقابلِ برداشت ہے وہ جو روقتاب اور  
دیر پردہ بھی دیکھا، تجھے بے پردہ بھی دیکھا      وہ شانِ حجاب اور تھی، یہ شانِ حجاب اور  
یاد بھولے سے کرینگے نہ کبھی      اور، بھولے سے اگر یاد آیا!  
یاد آتا تھا بہر حال جسے      شام بھولے، تو سحر یاد آیا

عجیب لطف ہے، کھاتے ہیں اور بھی تمیں      جب اعتبار کے قابلِ سخن نہیں رہتا  
وہ ایک میں، جو ہر اقراء پر یقین کروں      وہ ایک تم، جسے پاس سخن نہیں رہتا  
عشرت ذات نہیں وصلِ دگر بر موقوف      تنگِ فطرہ ہے سمندر میں فنا ہو جانا  
دل کی آواز کو کہتے ہیں، خدا کی آواز      ہو مبارک اسے دنیا کی صدا ہو جانا  
نہ فرق آیا ازل سے زینتِ گلزارِ بہشتی میں

بہادر اس کی، بہادر جادواں معلوم ہوتی ہے  
یہی چشمِ قبول اس کی طرف مائل نہیں شاید  
ابھی ہر سن، سہی راگناں معلوم ہوتی ہے

یہ خوش فہم ہے اپنی، یا لگاؤ ناد کا حسادہ

تہنیں اب بھی اب تو عالم تیری پاؤں معلوم ہوتی ہے

تیری محفل میں پہنچنے کو تو ہم بھی پہنچے  
کچھ اس انداز سے اپنوں نے نواز اچھوئی  
تھر جانوں کی نظر آئی، نہ ایا توں کی  
شفقتیں یاد بہت آئی ہیں بیگانوں کی

بہر معوان ہو کر ہی دیکھا، وہ جو ہوتا ہے

ترے اندیشہ سود و دنیاں سے کچھ نہیں ہوتا

کبھی راضی برضا ہو کے بھی دیکھو طالب! ہر نفس، کوشش و تدبیر کہاں تک اسخو

مفسس، تنگ نہیں، عیب نہیں، جرم نہیں

لیکن افلاس کا احساس بُرا ہوتا ہے

بات بادیک ہے، شکل سے سمجھ پاؤ گے

جس کو کہتے ہیں دعا، وہ بھی گلا ہوتا ہے

بے دہانی زبان ہو کے رہی ہر نظر داستان ہو کے رہی



## محوی صدیقی لکھنوی، محمد حسین

لکھنؤ کے ایک سرگودہ خانہ خاں کے فروختے، جس میں دین اور دنیا دونوں کا اجتماع تھا۔ ان کے دادا مولانا محمد صادق علی تجید عالم اور حافظ قرآن بزرگ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انھیں "میلیات" میں بھی یرغیوں حاصل تھیں۔ ان کے فرزند حافظ علی حسین تھے۔ وہ بھی اپنی خانہ خانی روایات کے وارث اور عربی فارسی کے عالم تھے۔ فارسی میں شریکتے تھے؛ نو ذمہ لکھنوی تھے۔ بڑھاپے کے لیے خطاطی اور خوشنویسی کا پیشہ اختیار کیا، اور اسی سلسلے میں اس زمانے کے مشہور و مطبوعہ نو کشتہ میں تیس روپیہ ماشاہرہ پر ملازم ہو گئے۔ یہی زمانہ ہے، جب نواب صدیقی حسن خان مرحوم (ف ۱۸۹۰ء) نے بھوپال میں تصنیف و تالیف کا کام شروع کرنے پر شروع کیا اور ریاست میں اس کے لیے ایک باقاعدہ دفتر کی تشکیل کی۔ انھوں نے فنی نوں کشور (ف ۱۸۹۵ء) کو لکھا کہ آپ کے یہاں تعلق و نسخہ کا جو بہترین کاتب ہو اسے بھوپال بھیج دیجیے۔ اس پر نش صاحب موصوف نے حافظ علی حسین صاحب کو بھوپال جانے پر آمادہ کر دیا۔ یہ جب بھوپال پہنچے، تو تو نواب صاحب موصوف نے ان کی بہت آؤ بھگت کی اور اپنے ہاں کی کتابت کا جملہ کام ان کی نگرانی میں دے دیا۔ پچاس روپیہ ماہانہ تنخواہ منظور ہوئی۔ نواب صاحب کی زندگی تک وہ یہ کام کرتے رہے۔ ان کا انتقال بھی بھوپال ہی میں ہوا۔ وہیں قبرستان "گلچہ شہیدان" میں مدفون ہیں۔

بہن حافظ علی حسین ہمارے محوی متذہبی کے والد بزرگوار تھے۔ محوی لکھنوی میں ۱۵ مئی

۱۸۹۱ء (۶ شوال ۱۳۰۸ھ) کو پیدا ہوئے۔ تعلیم کا مرحلہ آیا، تو اس کا انتظام گھر پر ہوا۔ اس کے بعد فرنگی محل کے مدرسہ نظامیہ میں داخلہ لیا۔ اور تکمیل اپنے والد کی نگرانی میں بھوپال میں کی، مدرسہ احمدیہ سے عربی کی، اور مدرسہ سلیمانہ سے فارسی کی سند فیضیت پائی۔

تکمیل تعلیم کے بعد ۱۹۱۱ء میں لکھنؤ آئے اور یہاں "الناظر" سے وابستہ ہو گئے۔ یہاں ۱۹۱۶ء تک یعنی پانچ برس ۱۱ء اور اس کے انتظامی اور پھر ادارتی شعبے میں کام کرتے رہے۔ اسی زمانے میں ان کی شاہرہ عہدہ عبدالحلیم شرر، فصاحت لکھنؤ، علی محمد عارف لکھنؤ، پیادے صاحب رشید، جانب دلوی، وحید الدین سلیم، چنگیت لکھنؤ، کبر الہ آبادی و حیزہ سے ملاقاتیں رہیں۔ اس سے انھیں اپنے دل و دماغ کی غنی صلاحیتوں پر چلک کرنے اور انھیں برص کا دلانے میں بڑی مدد ملی۔ ۱۹۱۴ء میں انجمن ترقی اُردو کا ایک جلسہ لکھنؤ میں ہوا تھا۔ یہیں محوی کی ملاقات مولوی عبدالحق مرحوم (ف، اگست ۱۹۶۱ء) سے بھی ہوئی، جس سے بعد کو انھیں بہت فائدہ پہنچا۔

۱۹۱۶ء میں ان کے والد حافظ علی حسین بہت بیمار ہو گئے۔ اس پر محوی صاحب لکھنؤ سے بھوپال چلے گئے، اور وہاں انھیں ریاست کے دفتر تارخ میں عربی مترجم کی جگہ مل گئی، ان کی کتاب "ازواج الانبیاء" لکھنؤ ۱۹۱۶ء میں اسی زمانے میں لکھی گئی تھی۔ دو سال بعد ۱۹۱۸ء میں وہ لکھنؤ واپس آ گئے۔ یہاں انھوں نے اپنا "دارۃ ادبیہ" قائم کیا۔ "انسانی ترقی" کی تصنیف اور شاعری اس زمانے میں ہوئی۔ (لکھنؤ، ۱۹۱۹ء)

لکھنؤ میں کوئی سال بھر قیام رہا، مگر ان کا مولانا عبدالصمد آزاد سجانی (ف، جون ۱۹۵۷ء) نے انھیں کانپور طلب کیا۔ آزاد سجانی مرحوم کا نام سادہ سی تحریر کا آزادوی اور تحریر کی عظمت میں بہت نمایاں ہے۔ انھیں فلسفے سے بہت شغف تھا۔ اسی لیے وہ اپنا نام سجانی ربانی لکھا کرتے تھے۔ انھوں نے کانپور میں "مدرسہ البیات" قائم کیا تھا۔ محوی صاحب کو اسی مدرسے میں عربی پڑھانے کے لیے بلا یا گیا تھا۔ محوی سال بھر کانپور میں رہ کر علی گڑھ چلے گئے، ہمارے جامعہ ملیہ کے شعبہ تصنیف و تالیف میں کام کرتے رہے۔ اسی زمانے میں انھوں نے

”مطابق ناصری“ اوتار دینچ فیروز شاہی“ کا ترجمہ کیا۔

جیسا کہ بیان ہوا، اتفاقاً غلامی ملازمہ کے زلنے میں ان کا مولوی عبدالحق مرحوم سے تعارف ہو گیا تھا جو ننگرہ پور دگا کی طرف سے پریشان تھے، اور اپنی استعداد اور مستحضر کے باوجود انھیں کہیں جہم کر بیٹھنے کی جگہ نہیں ملی تھی، انھوں نے مولوی عبدالحق سے رجوع کیا اور دینچ کی درخواست کی، موصوفت و جواں اور موہنا دہیوں کی جو صلاح فرمائی پر ہمیشہ تیار رہتے تھے، انھوں نے عوی کو اورنگ آباد بلایا جہاں وہ خود اس زمانے میں کالج کے پرنسپل اور انجمن ترقی اردو کے سکریٹری تھے۔ سو درپہ ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی تھی، لیکن جب یہ اورنگ آباد پہنچے، تو مولوی صاحب نے ان خود پر بڑھا کر ایک سو چار روپے کر دی۔ یہ ۱۹۲۲ء کی بات ہے اور ننگرہ پور میں ان کا قیام ۱۹۲۹ء تک رہا۔ اس زلنے میں وہ انجمن کی انگریزی راءد و کشری کی ترتیب میں بھی شریک رہے تھے۔

۱۹۳۰ء میں وہ دہلی چلے گئے۔ اولاً حالیہ عریک کالج میں عربی کے استاد رہے، بعد کو مدائنہ یونیورسٹی میں مدرس (لیکچرر) مقرر ہو گئے۔ یہاں سے ۱۹۵۲ء میں سکندرش ہوئے بیان کی قضیہ فی الواقع زندگی کا سب سے بار آور زمانہ ہے۔ یہاں انھوں نے دیوان میر محمد سید دہلوی ۱۹۳۵ء و واقعات (ظفری) اور دیوان (ظفری) اردو فارسی (۱۹۳۶ء) میر کینیل خان (جمہوری کا انور نامہ ۱۹۳۲ء) اور کلیات فارسی (۱۹۵۵ء) و کلمات اشتراف سرخوش (۱۹۵۱ء) مرتب کیے؛ ان پر دیباچے اور حواشی لکھے؛ اور یہ سب کتابیں مدائنہ یونیورسٹی کے زیر اہتمام شائع ہوئیں۔

دہلی میں اس سلسلہ منقطع ہونے کے بعد انھوں نے بھوپال میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ پڑھنے لکھنے کا سلسلہ یہاں بھی جاری رہا۔ یہاں انھوں نے بچوں کے لیے کئی کہانیاں لکھیں جو اسی زمانے میں شائع ہو چکی تھیں۔

انھیں شعر گوئی کا شوق دہشتہ میں ملا تھا۔ ان کا کلام ۱۹۰۰ء سے موقت ایضاً و رسائل میں شائع ہونے لگا تھا، لیکن ابھی تک انھوں نے کسی سے باقاعدہ اصلاح کا تعلق پیدا نہیں کیا تھا۔ ۱۹۱۰ء میں انھوں نے احمد علی شوق قدوائی (ف: ۱۹۲۵ء)

کی شاگردی اختیار کی اور استاد کی زندگی بھران سے مشورہ کرنے رہے۔ اب بھوپال میں منتقل قیام اختیار کرنے کے بعد انھوں نے اپنا کلام بھی جمع کرنا شروع کیا یعنی کلام "نعت فردوس" کے نام سے چھپا (بھوپال، ۱۹۸۶ء) اور با حیات کا مجموعہ "آبادی کے عنوان سے (لکھنؤ، ۱۹۸۱ء)۔ اس سے مدتوں پہلے ایک طویل نظم "شاعر کا دل" کے عنوان سے بھی چھپی تھی (مداس، ۱۹۳۸ء) لیکن افسوس کہ طریقات کا دیوان نہیں چھپ سکا، حال آنکہ ان کی بڑی ترقی یافتہ محو یہ محفوظ ہو جائے کسی زمانے میں ان کے شاگرد جو ہر جاندوڑی نے ان کے سوشلوں کا ایک مختصر مجموعہ چھاپا تھا۔ (لکھنؤ، ۱۹۳۸ء) اب یہ بھی پایاب ہے۔ بہر حال، اگر پورا کلام نہیں، تو ان کا ایک نامیدہ انتخاب شائع ہو جانا چاہیے۔ انھوں نے ادب و نظم و نثر کا بہت ذخیرہ چھوڑا ہے۔

ستمبر ۱۹۷۶ء سے حالات کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس سال میزمن کی تکلیف تھی۔ ہر طرح کے علاج کیے لیکن کسی سے فائدہ نہیں ہوا۔ ۱۹۷۳ء تک بالکل ذرا درنزار ہو گئے؛ اٹھنا، بیٹھنا چلنا پھرنا تک دیکھنا ہو گیا۔ اسی میں بدھ کے دن ۱۹ نومبر ۱۹۷۵ء صبح آٹھ بجے کے بعد صبح قفس منہری سے پرواز کر گئی۔ "اتاقہ و اتانائیدہ راجنوت"۔ بھوپال کے شاہی قبرستان "ہرشہ باغ" میں دفن ہوئے۔ سید حسن ہمدانی حکیم بریلوی (جامعہ ملگ، نئی دہلی) نے تادمخ کہی جس کے پہلے مصرع سے عیسوی اور دوسرے مصرع سے ہجری سال برآمد ہوتا ہے :

اتھر گیا دنیا سے کیسا خاں شیریں نقال (۱۹۷۵ء)

خادم اور دربان مرحوم نوی لکھنوی (۱۳۹۵ھ)

عمری مرحوم نے اپنی زندگی میں چار نکاح کیے۔ پہلی بوی لکھنؤ کی تھیں۔ شادی کے ایک سال بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ دوسری شادی بھی لکھنؤ میں ہوئی۔ ان کے ایک چچہ ہوا تھا جس کے بعد وہ مسلسل بیمار رہنے لگیں۔ پہلے ان کی موت ہوئی اور پھر ان کی بیوی چل رہی تھی۔ تیسری بوی بھوپال کی تھیں۔ ان سے دو لڑکے ہوئے؛ (۱) حامد حسین صدیقی، جو آج کی نیکو کار لکھنؤ میں مدرسہ شعبہ اردو ناویں۔ (۲) محمود حسین؛ دروازہ انقلاب بھی

بھئی کے دفتر میں ملازم ہیں۔ چوتھی بیگم بھی بھوپال ہی کی تھیں۔ ان سے تین صاحبزادے (سعید حسین، جمیل حسین، میر حسین) اور ایک صاحبزادی (نور جہان بیگم) ہیں۔ انشا اللہ سب اپنی اپنی جگہ خوش و خرم ہیں۔

ذیل میں چند شعر بطور نمونہ کلام ملاحظہ ہوں، جو ان کے صاحبزادے میرزا الموی (میرزا حسن) کے عنایت کردہ کلام سے انتخاب کیے گئے ہیں:

اندھے طلسمِ حال سننِ فریب کچھ تجھ سے کہنے آئے تھے یاد اب مگر نہیں  
ہمیں کیا ہے ابھی، افسانہ شب نے اظہار کا بھی شوق ہے، رسوائی کا دہریہ  
نعمتِ شکرِ جفا، اہل نظر نے پائی، واہو! شکرِ بیدارِ شکر میں رہے  
خلاقِ حیش بھی پامال، ذوقِ علم بھی اندر وہ

یہ کیا ہم شکستِ خاطرِ دل کی زندگی بانی ہے!

لگاؤ شوق بھی نکام، ذوقِ عشق بھی رسوا

مگر دل ہے کہ سرشارِ فریبِ رشادانی ہے

معتوٰر کی نظر، شاعر کا دل، سجدے میں ہیں دونوں

جوانی بن کے وہ حسن واداکا شاہکار آئی

وہ پھیلی چاندنی، تارے وہ چھٹکے، چاند وہ نکلا

وہ صبحِ عید کے پیکر میں شامِ انتظار آئی

ہر کام پر تباہی ہے راہیں نئی نئی — اس عقلِ نکتہ رس سے بھی اکٹا رہے جن ہم

ہ عدم کے جانے والے، ہیں تمھارے ہی تو خیدا

کوئی رہ گیا ہے پیچھے، کوئی بے باز ہے

گیا دل بھی جوانی بھی، نشاط و کیف کے دل بھی

تنا جس کو کہتے ہیں، وہ دیوانی نہیں جاتی

بس ہوں ناور، سارے جاں کے حادثات — انہاں ہوتے ہیں مشتِ خاک کے

فدائے بعد آج جو نظریں ہوئیں دوچار — وہ بھی کس اشتیاق سے دیکھا کیے مجھے

اب یہ پتا چلا کہ وطن کیوں عزیز ہے      مدت کے بعد گھر کو جو آئے سفر سے ہم  
تو ہی بتا، دل دیوانہ پھر کہاں جائے!      جو اپنے گھر کے لیے ہے، دیر سے در کے لیے  
دلوں سے یاس و نصرت، درد و نصرت، بیکسی و نصرت

وہ جانِ حسن، جانِ آرزو، جانِ شباب آیا  
ذکرِ جن، ذکرِ نصیحتیں، خدا کی شان!      کسے کسے غم میں اور دل آزاد ہو گیا  
ہوں پر آہ، بایں اٹک سے ترا، ہاتھ دل پر ہے  
کسی کی یاد ہے، اور رات کا خاموش منظر ہے  
سکون کی شویش آباد جہاں میں آرزو کیسی!

اوسے ناداں! یہ نعمت کبچہ تربت میں میسر ہے  
رہنے سے بھی کچھ دل کی تسکین نہیں ہوتی      کچھ روز محبت میں یہ کام بھی کر دیکھا  
مے عزم و وفا کی لاج دکھائی، سخت جانی سے

ہجوم آرزو میں دردِ جینا کوئی آساں تھا؟  
رو رہا ہے دل، مگر اندری بیخودیاں      ہنس رہے ہیں ہم زمانے کو دکھانے کے لیے

## بسل آبادی اسکھ دیو پرشاد سنہا (نشی)

۱۱ نومبر ۱۸۹۹ء کو الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن بھوانی پور (ضلع رائے بریلی) ہے۔ جہاں سے ان کے جد امجد کسب معاش کے سلسلے میں الہ آباد آئے، اور پھر یہیں کے ہو گئے۔ بسنل کے والد کا نام نشی بشینور دیال سنہا تھا۔ خاندان کی سکونت الہ آباد کے مشہور محلے میر گنج میں رہی، جس میں نرو خدا نائی بھی رہتا تھا۔ کالیستھوں کی طرف غارتی سے رغبت ان کے حلقے میں بھی آئی۔ تعلیم ڈرن ہائی اسکول اور کالیستھ پائشار کالج، الہ آباد میں ہوئی۔ ابھی تعلیمی مرحلہ ہی میں تھے کہ شعر کہنے لگے۔

۱۹۱۸ء میں نوح مالدی (ف: اکتوبر ۱۹۶۲ء) کی شاگردی اختیار کر لی۔ لیکن بعد کو کس بات پر ان سے قطع تعلق ہو گیا۔ چونکہ اب ان کی مشق کافی ترقی کر چکی تھی اور زبان و بیان پر بھی تھکوت چھل ہو گئی تھی، لہذا اس حادثے سے انھیں کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا۔ الہ آباد اور نواح میں ان کے شاگردوں کا خاصا وسیع حلقہ تھا۔ پڑھتے بھی خوب تھے، ان کے کلام میں سوز سے زیادہ نشاط کا عنصر نمایاں تھا۔ کلام کے دو مجموعے "جذبات بسنل" اور "افکار بسنل" کے عنوان سے چھپ چکے ہیں۔ اول پدمیا چمر عبد اللہ کے قلم سے ہے، اور دوسرے پربرتیا جادو کپرو کے قلم سے۔ لیکن اس پر بھی ایک زمانہ گزر گیا، ابھی بہت کلام غیر مطبوعہ ہو چکا۔

ملدی عمر الہ آباد کے میونسپل بورڈ میں ملازم ہے۔ وہاں سے سبکدوش ہوئے، تو اس کے بعد

کہیں اور ملازمت نہیں کی، اس کی ضرورت بھی نہیں تھی؛ بس اوقات کے لیے خدا کا دیا بہت کچھ تھا۔

صحت عموماً ہمیشہ اچھی رہی اور انھوں نے خاصی لمبی عمر پائی۔ چند دن کی معمولی علالت کے بعد ۲۳، ۲۴ نومبر ۱۹۷۷ء کی درمیان شب (گویا ۲۴ نومبر کے ابتدائی اوقات) میں حرکت قلب بند ہو جانے سے جان بحق ہوئے۔ موت سے ایک دن پہلے انھوں نے تازہ غزل بھی تھی، جس میں مصرعہ تھا،

بسل آیا ہے اکیلا، بسل جائیگا اکیلا

لیکن اسے غلط کر دکھایا ان کے ۳۸ سالہ بیٹے شیو شنکر لال نے جب بسل کی حتماً میں آگ لگائی جا رہی تھی، تو شدہ شنکر لال مدد کے کی تاب نہ لاسکے، اور آٹا قاتا ان کے طلب کی حرکت بند ہو گئی

بسل کا مشغری رشتہ ناز دی کے واسطے سے داغ دہلی سے ملتا ہے۔ داغ اسکول نے زبان کر سلیس اور صاف ستھرا رکھنے میں جو خدمات انجام دی ہیں، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اس میدان میں داغ کے شاگردوں میں نوح کو اور بھی امتیاز حاصل تھا۔ بسل اپنے استاد کے دنگ میں اس مدد تک رنگے ہوئے ہیں کہ بیشتر اوقات دونوں کے کلام میں امتیاز محال ہے۔ انھوں نے خود بھی خاندان داغ کا فروغ ہونے پر اکثر فخر کیا ہے سکتے ہیں؛ یہ کس کے منہ میں دبا ہے، جو کہ سکے بسل!

مری زبان نہیں، داغ کے گھبرانے کی  
ہمارا سلسلہ ہے خاندان داغ سے بسل! — تجھے جو یہ کھنا، وہ یہ کھئے اور وہ زبان ہم  
چند شعر دیجیئے۔

عشق میں ملتی ہے مرکز، اہل دل کو زندگی لطف ہستی نہیں کے دور میں پاتا ہوں میں  
وقت اخیر موت کے آشادیکھ کر — احباب رو دیئے رنج، بیسا وہ دیکھ کر  
مٹ گئی شمع کی تنویر وہ مبادات کے ساتھ

خاک بھی اب نظر آتی نہیں پروازوں کی



تہ دے ، تہے کو جے سے ، اٹھنا غیر ممکن ہے

دکھا۔ سکی ہیں جو گردشِ تقدیر ، دیکھینگے

آپ لی محفل سے اٹھنے کا نتیجہ یہ ہوا ————— تنگ آکر اٹھ گئے دنیا کی بھی محفل سے ہم  
ذاتی نیند ، ذاتی قضا ، نہ آئے آپ ————— تڑپ تڑپ کے شبِ انتظار دیکھ لیا

محفلِ ادب میں آیا موسمِ گل ، اٹھ دے جوانی پھولوں کی

اب پھول کے بلبل کہتی ہے ، پھولوں سے کہانی پھولوں کی

گلش میں نہ کیونکر دل پہلے ، وہ سنتے ہیں میں شادمانی

پھولوں سے قضا بلبل کا ، بلبل سے کہانی پھولوں کی

بلبل سے تقدیر سے مشک ، تقدیر اسی کی اھی ہے

چل پھر کے صبا ہی چوتھی ہے ، کیا کیا پشانی پھولوں کی

ہر موج ہے اک پردہ سازِ بہت ————— کھینے کو جابوں سے ہے راہِ بستی

کوششِ دا بھرنے کی کرد ، اے بلبل! ————— غرقابِ قضا ہو گا ، جہازِ بستی

## قاصر، برہم ناتھ دت (چودھری)

ایک تہذیب سوبیال برہمن خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کی ذراعت و ت، اور گٹ بھار دہا،  
تھی اور پیدا ہوئے ۳۱ ستمبر ۱۸۹۱ء کو صبح پانچ بجے ویرم دھان تحصیل شکر گڑھ، ضلع  
گودا پور (اصل پاکستان) میں یقیناً بھی جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے انہیں کے بزرگوں  
کا بایا ہوا ہے۔

ان کے والد چودھری گوران دھان صاحب تعلیم یافتہ بزرگ تھے۔ اس نسل کے دستور کے مطابق  
اُردو اور فارسی کا پائیزہ فوقی رکھتے تھے، انگریزی میں بھی دوسرے کے شریافت تھے۔ لیکن انہوں  
نے گھر کی زمینداری کی دیکھ بھال کے علاوہ اور کوئی کام نہیں کیا۔ چودھری گوران دھان  
کے دادا یعنی قاصر کے چچا علی (اشنی) ہمیشہ اس نامی کے قاصر اور رہا اور جاسو جیت گھر  
کے دیہاری اور شیر تھے۔ بعد کو قاصر کے دادا اشنی شکر داس نے دیہان کا نوک کئی اور  
اپنی جاداد کی نگرانی پر کتفا کی۔ اس سے معلوم ہوگا کہ بفضل گھر میں علم و فضل بھی تھا اور دولت بھی۔  
یہ قاصر نے خود اپنی تاریخ ولادت دیکھ گئی ہے: ۱۳ جولائی ۱۸۹۱ء زمانہ زمانہ پات پات ہے)۔  
بھادوں ۱۹۴۸ء (جری ۱۵) جنوری کی دوسری تاریخیں ایک دوسرے کے مطابق نہیں  
۱۳ جولائی ۱۸۹۱ء مطابق ہی ۱۳ ستمبر ۱۹۲۷ء کی ہے؛ اور ۱۹ بھادوں ۱۹۴۸ء کی کو ۱۲ ستمبر  
۱۹۷۱ء کی۔ ان کے صاحبزادے فاکر دھان ناتھ دت کے نزدیک ۳۱ ستمبر ۱۸۹۱ء کی تاریخ مرثیہ ہے کیونکہ  
بکری تاریخ انہوں نے دیکھی کئی جگہ ملتی ہے؛ غالباً عیسوی تاریخ کے تیس میں غلطی ہو گئی

چودھری گوداں دتتا مل بٹے پتھر اور سجدہ و قسم کے ارکان تھے۔ انیسویں کران کا انجام بہت  
الٹا کہ حالات میں پولیو جب ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کا اعلان ہوا، اور فیصلہ ہوا کہ گوداں دتتا  
کی تفصیل شوگر مقرر (ویرم ڈٹان سمیت) پاکستان کا مقصد لیگی، تو اعزہ و اقارب کے مشورے  
اور راضیوں کے باوجود انھوں نے ویرم ڈٹان سے ہجرت کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ  
یہاں سب میرے دوست ہیں، میری کسی کا مخالف، نہ میرا کوئی دشمن۔ مجھے یہاں کیا تکلیف ہے  
کہ میں اپنا جزم بھوم اور مزدوروں کا وطن ترک کر کے کسی اور جگہ جاؤں!۔ یہاں تک کہ  
انھوں نے پاکستان سے اپنی وقتی اور اخلاص اور وفاداری کے اعلان کے طور پر اپنے مکان  
پر پاکستانی جھنڈا بھی لگا دیا۔ لیکن تقدیر کا نوشتہ پورا ہو کر رہا۔ چند دن بعد لوگوں نے  
ان کے گھر پر حملہ کر دیا، اور انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اب لیاپنے کی تمام نظریں کا دوسرا پہلو دیکھیے۔ قاصر صاحب اس زمانے میں امرتسر میں مقیم تھے۔  
قسمت کے فیصلے کی بنا پر ان کا مکان جونیوں نے اس لیے مندرائش کر دیا کہ انھوں نے اپنے  
مسلمان دوستوں اور ان کے خاندان کے افراد کو یہاں پناہ دی تھی۔ دلاور حسین (پرنسپل)  
ایم، اے اداکائی، امرتسر، شیخ حاتم الدین راحمدی لیٹڈ، مولانا محمد حسین عرش، مشہور  
شاعر اور عالم وغیرہ انھیں پناہ گزینوں میں تھے۔ قاصر صاحب کا بیش قیمت کتابخانہ بھی  
اسکا حاذقے میں چل کر دکھ چوگیلہ وہ کہا کرتے تھے کہ بے مکان کے چل جانے کا اتنا افسوس  
نہیں، جتنا الہیہی کتابوں کے تلف ہونے کا، جو مجھے جان سے زیادہ عزیز تھیں  
میں ان کے والدین وفات کے واقعے کو بیان کرتے ہوئے بہت دوڑا چکا تھا۔

قاصر صاحب کے ابا اپنے اپنے گوردے کے مشورے سے ان کا نام برہم داس رکھا تھا،  
لیکن انھوں نے بعد کو اسے بدل کر برہم ناتھ کر لیا کہ بہر حال، داس (غلام) سے ناتھ  
راہٹک آتا، بہتر ہے۔ پڑھنے لکھنے کی منزل آئی، تو انھیں مقامی پرائمری مدرسے میں  
بشمار کیا گیا۔ یہاں پانچویں درجے تک تعلیم کا انتظام تھا۔ مڈل کے درجوں کے لیے کسی جوانوار  
جانا پڑا۔ اور دسویں کی ضد دیال سنگھ بائی اسکول، لاہور سے حاصل کی۔ اب انھوں نے  
دیاندرا سنگھ ویدک کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ لیکن خدا معلوم کیا جوگ پڑا کر پڑھنے لکھے۔

سے دل اٹھاٹ ہو گیا، ہفتکل سال بھر یہاں رہے ہو گئے۔ والد نے دیکھا کہ بیٹا بڑھنے کی گول کام نہیں۔ تو اسے پولیس میں بھرتی کرادیا۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنے اثرو رسوخ سے اسے جلد ترقی دلوں اور تھانیدار بنوا دیں۔ لیکن یہ پیشہ صاحبزادے کی پسند کا نہیں تھا چنانچہ جب وہاں سے حاضری کا پروانہ آیا، تو یہ حاضر نہ ہوئے۔ والد کو اس کی خبر ملی، تو سخت ناراض ہوئے، اور اپنی خلقی کا اظہار اس طرح کیا کہ کہا، اگر بھادی نہیں مانتے، تو جاؤ جہاں سینک سائیں، وہاں چلے جاؤ۔ والدہ، جب یہ ابھری دس بارہ برس کے تھے، حنف سدا رخصتی تھیں۔ گھر میں اور کون تھا، جو والد کے اس جنسی حکم پر احتجاج کرتا یا انہیں پناہ دے سکتا تھا؟ یہ بھی اپنی بیٹ کے بچے، پاپیا وہ گھر سے نکل کھڑے ہوئے، اور کہاں کہاں کی خاک چھانسنے کے بعد قلیل تنخواہ پر شاہ ر ضلع گورداسپوہکے ایک تاجر کے ہاں کوئی کچا پھرا کی کے ساتھ دتی چلے گئے اور یہاں ایک در آمد برآمد کا کام کرنے والی تجارتی فرم میں ملازم ہو گئے۔ کوئی سال بھر یعنی ۱۹۱۲ء تک یہاں رہے۔ اس کے بعد امرتسر چلے گئے اور وہاں ایک دوسری فرم دیسری پھلی رام بھادی لال کے ہاں ملازمت کرنی، ان کی بدیہی فرموں سے خط و کتابت ان کے ذمے تھی۔

تدقیر بعد انھوں نے یہ ملازمت ترک کر دی اور امرتسر ہی میں اپنا ذاتی کاروبار شروع کر دیا۔ وہ یہاں سے سو قی مانگا دساؤ کو برآمد کرتے تھے۔ بخر پر موجود ہی تھا اور محنت مشقت گنتی میں پڑی تھی۔ اس پر زود قلم، اور سب سے بڑھ کر ایمان داری اور خلوص گویا کامیابی کے تمام اسباب موجود تھے۔ خدا نے برکت دی اور وہ کامیاب تاجر بن گئے۔ بدیہی مشینوں میں ان کی بڑی سلکھ تھی اور وہاں کے تاجروں کو ان پر بھروسہ تھا، ان کی تین تین جینے کی ہنڈ دی بھیج ہو جاتی تھی۔ ان کا یہ کاروبار ۱۹۵۴ء تک بہت کامیابی کے ساتھ چلتا رہا۔ اس سال حکومت نے درآمد برآمد پر سخت پابندیاں عائد کر دیں۔ عرصے کے ساتھ صورت بھی آہستہ آہستہ جواب دینے لگی تھی، اور وہ کچھوٹی اور لطیف سے کام کرنے کے لائق نہیں رہے تھے۔ لہذا انھوں نے یہ سلسلہ بند کر دینے میں عافیت دیکھی، اور اس کے بعد بہتر علم و ادب کے لیے وقف ہو گئے۔

شہر گئی انھوں نے ۱۹۰۷ء میں شروع کی، جب وہ بنوڑا آٹھویں درجہ کا طالب علم تھے؛ مگر پانچ چھ برس تک کسی سے مشورہ نہیں کیا۔ جب ۱۹۱۲ء میں امرتسر گئے، تو حکیم فیروز الدین فیروز دہلوی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔

حضرت فیروز دہلویؒ اس پایے کے صاحبِ علم و فضل بزرگ تھے، جن پر خطہٴ پنجاب کی بجا طور پر ناز ہو سکتا ہے۔ انھیں ماں کی کما حقہٴ قدر نہیں ہوئی، جس کے لیے ان کی گوشہ نشینی اور استغنا بھی بہت حد تک ڈرتے دار ہیں۔ ۱۸۸۲ء میں امرتسر کے ایک سربراہ آدودہ کشمیری گھرانے میں پیدا ہوئے۔ خاندان میں پشتوں سے حجرات کا سلسلہ چلا آ رہا تھا قیمت کی بات، کاروبار میں لاکھوں کا خزانہ ہوا۔ ان کے والد اس صدمے کی تاب نہ لا سکے، اور حرکتِ قلب بند ہو جانے سے آٹا خانہ جان بحق ہو گئے۔ اس وقت فیروز الدین احمد کی عمر بھی ڈیڑھ دو برس کی تھی۔ کئی کئی بار دادوا خٹین نے خود رو کر دی، اور فیروز الدین احمد کو یا ہوش بٹھانے سے پہلے ہی قتل کر دیا ہو گا۔ بلکہ لایا گیا تھا، لیکن انھیں اتنا س۔

جہاں وہ وقت کی ڈیٹی کالے پڑے ہوں، وہاں تعلیم کا کیا سوال! سن شعور کو سنبھلے، تو ہوواں نے ختم بیٹے کو محلے کی مسجد کے محنت میں بھیج دیا۔ وہاں قرآن اور عربی تو پڑھنا ہی تھی، لیکن اس سے کہیں زیادہ انھیں پڑوس میں رہنے والے ایک ایرانی بزرگ سے فیض پہنچا۔ ان سے رفتہ رفتہ فارسی میں وہ حجرات پیدا کر لے جس نے انھیں بعد کو بگڑاؤ، بدزگاد بنا دیا۔ دس برس کے تھے، جب قرآن اور دینیات کی بیشتر کتابیں ختم کر چکے تھے۔ لیکن کسبِ معاش کا مسئلہ اتنا اہم تھا کہ انھیں لازماً کوئی کام کرنے کی ضرورت تھی۔ اس پر انھوں نے نوکری کا پیشہ اختیار کیا، جس سے اپنا اور ماں کا پیٹ پالنے بھر کر کماؤ ہونے لگی۔ رفوٹری محنت اور دیدہ دہیزی کا بعد وقت کی کام ہے۔ تاہم اس سے جو وقت بچتا، اس میں مختلف موضوعات کی فارسی اور عربی کی ادنیٰ کتابوں کا مطالعہ بھی جاری رہا۔ لیکن وہ نوکری سے عاجز آ گئے۔ آخر اسے چھوڑ کر چوٹگی میں محروم ہو گئے کہ اس میں فراغت اور تعلیم حاصل کرنے کے نسبتاً زیادہ امکانات تھے۔

چونکہ خدا نے دل و دماغ کی صلاحیتیں بہ وجہ وافر و دیوت کی تخلیق، بہت جلد، کسی استاد کی مدد کے بغیر، ترقی کی منازل طے کر کے اُردو اور پنجابی میں شعر کہنے لگے جس نے مٹا، اس نے داد دی، دل بڑھایا اور یوں ان کی شہرت نہ پھیلنے لگی۔ اور تو اور یہ مقامی ماہر نے ”میسما“ کے ترکیبی جگہ خالی ہوئی، تو اس پر ان کا شعور ہو گیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہن سال استاد مولانا احمد حسن شوکت میرٹھی (دف: دسمبر ۱۹۲۲ء) نے ”مجتہد السنہ شرقیہ“ کے بلند بانگ دعوے کے ساتھ اساتذہ کے کلام پر حرج و قدح کا طوفان مچا کر دکھایا تھا۔ فیروز ظفرائی نے ”میسما“ میں خود مولانا شوکت میرٹھی کے کلام لکھا جائزہ لینا شروع کیا، اور ستم یہ ہوا کہ اس کی خامیاں دکھا کر اصلاح بھی دے دی۔ شوکت سے کوئی جواب نہیں آیا، تو چپ سا دھری۔ اس پر فیروز ظفرائی نے ایک اور چٹکی لی اور اپنے پرہیز میں اعلان کر دیا کہ چونکہ مولانا شوکت نے ہمارے اعترافات پر خاموشی اختیار کر لی ہے، اس سے ہم نیچبہ نکالنے پر مجبور ہیں کہ انھوں نے ”کل اعتراف“ اور اصلاحوں کو تسلیم کر لیا ہے اور اس میں انھیں کوئی کلام نہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا، تو وہ ضرور مدلل تردید کر کے ہمیں تائب کرتے۔ مولانا شوکت نے دیکھا کہ پانی ترسے گزر رہا ہے۔ لہذا وہ اتر سر پہنچے اور مقامی مشہور عالم مولوی شاعر اہلنامہ تشری کو بیچ میں ڈال کر فیروز ظفرائی سے مصالحت کر لی۔ یہ واقعہ ۱۹۰۳ء کا ہے، جب فیروز ظفرائی بمشکل ۲۲ برس کے تھے۔

”میسما“ بند ہو گیا، تو فیروز ظفرائی نے اپنا ذاتی ماہنامہ ”ایشیا“ جاری کیا۔ لیکن اس کے بجائے سراسر یہ درد کا تھا، اس کا نام ”ایم کرناں“ کے پس کی بات نہیں تھی۔ کاہن باری تجربہ بھی براے نام تھا۔ اس لیے پرچہ جلد ہی بند ہو گیا۔ اس دور میں ”دیکل“ اخبار کا ملک بھر میں غلغلہ تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد (دف: فروری ۱۹۵۸ء) اس کے مدیر اور مولانا عبد اللہ حمادی (دف: اگست ۱۹۴۷ء) مترجم تھے۔ فیروز ظفرائی ان کے معاون مقرر ہو گئے، ان کا کلام نظم و نثر بھی دیکل میں چھپنے لگا۔ لیکن جب ۱۹۰۶ء میں مولانا آزاد دیکل سے الگ ہو گئے، تو فیروز ظفرائی نے بھی یہ تعلق منقطع کر لیا

شمس الاطیحا حکیم غلام جیلانی لاہوری (د: فروری ۱۹۶۶ء) کو اپنے تصنیفی کام کے لیے ایک معاویہ کی ضرورت تھی، جو عربی اور فارسی میں جہادِ حقانہ کا حامل ہو۔ انھوں نے شاہ قزوین طبرانی کو لاہور بلا لیا۔ یہ ساڑھے تین برس دہاں رہے حکیم غلام جیلانی کے نام سے جو عربی کی کئی کتابوں کے تراجم شائع ہوئے ہیں، ان میں سے بعض قزوین طبرانی ہی کا کاغذ نامہ ہے۔ بقیہ کچھ اور اصحاب کی کاوشِ طبع کا نتیجہ ہیں، حکیم غلام جیلانی ایک استادِ رفیق الاطیحا بھی شائع کرتے تھے۔ اس زمانے میں قزوین طبرانی کے کئی مضمون (منتقل اور تراجم) اس میں بھی چھپے تھے حکیم غلام جیلانی کا تصنیفی پروگرام مکمل ہو گیا، قزوین طبرانی واپس امرتسر چلے آئے اور یہاں اپنا مطب کھول لیا۔ اس سے شہر کے اصحابِ علم و فن کو مزید فائدہ پہنچا کر بلا ناہنہ آئے، ان کے پاس بیٹھے اور استفادہ کرتے رہے۔ جہاں تک مطب کے ان کا ذریعہ معاش بننے کا تعلق ہے، وہ مقصدِ اراۓ تھا۔ اب انھوں نے کوئی اور مددگار اختیار کرنے کی کوشش کی۔ بالآخر ٹھہری کو خاصی وغیرہ پڑ جانے پر محکمہ تعلیم میں شامل ہو جائیں۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ انھوں نے کس مدرسے میں باقاعدہ تعلیم نہیں پائی تھی، نہ کوئی سند ان کے پاس تھی؛ اور محکمہ تعلیم میں ڈگری کے لیے یہ لازماً تہہ بہہ اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ اس پر انھوں نے دوستوں کے کہنے سے پنجاب یونیورسٹی کا مشقی داخلہ کا امتحان پاس کر لیا۔ اس کے بعد آسانی سے اسلامیہ اسکول امرتسر میں فارسی کے مدرس مقرر ہو گئے۔ پھر اسی حیثیت سے جوں تیار ہو گئے اور دو ڈیڑھ برس وہاں رہنے کے بعد واپس چلے آئے۔

اس کے امرتسر پہنچے، تو ”دکیل“ کے مدیر اعلیٰ مقرر ہو گئے۔ لیکن یہ اس اتحاد کا گویا منہ بولا تھا۔ جلد ہی اس کے مالکوں میں باہمی اختلاف پیدا ہو گیا۔ جب معاملات کسی طرح نہ سلجھے، تو ان لوگوں نے پرچہ ہی بند کر دیا۔ قزوین طبرانی پھر پروڈگار ہو گئے۔ جلد بعد انھیں حمایتِ اسلام لاہور نے انھیں اپنے شعبہ تالیف و تصنیف میں مصحح کی امانت پیش کی اور انھوں نے قبول کر لی۔ انھیں کے پاس جتنے مستودے آتے تھے، ان کی زبان کی فصیح و خیرہ ان کے فرائض میں داخل تھی۔ لیکن اب انھیں لاہور کی آب و ہوا اور اس

نہیں آئی؛ سلسلہ بیمار رہنے لگے۔ اس لیے متعفی ہو کر مریض واپس آ گئے۔ اس کے تھوڑے ہی دن بعد ۱۹۳۱ء کو اس کو بیمار دے ہو گئے۔ عمر چار سال کی بھی نہیں تھی۔ ان کے شاگرد رشید حکیم محمد حسین عرشا نے تاریخ کہی،

ترتیبِ فرودِ طغرائی کہ باد جلوہ انگن اندر نورِ خدا  
جنتش سالہ وفات از عاقلے بے تامل گفت : "مغفورِ خدا"

آدم بربرِ مطلب، ناصر صاحب کبھی ۱۹۱۲ء میں ان کے تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ وہ استاد کے عاشق تھے۔ ان کی تحریروں میں جہاں کہیں ان کا نام آیا ہے، ان کے علم و فضل، قابلیت و صلاحیت، قناعت و ثقافت، شفقت و عظمت کے اعتراف اور تعریف میں ان کی زبان سوجھتی ہے۔

ان کی شادی ۱۹۰۵ء میں چندادن خان (ضلع جہلم) کے شری و حنفی رائے جعفر کی صاحبزادی ویران دیوی سے ہوئی تھی جناب و حنفی رائے کے تحت متحول اور خاندانی آدمی تھے اور ان کی بہت وسیع جادو بھی۔ وہ ریاست جھالاڑ میں تحصیلدار کے عہدے پر فائز تھے، لیکن بہادر جا کی نفس حرکت سے دل برداشتہ ہو کر استعفیٰ دے دیا اور وطن واپس چلے آئے۔

ناصر صاحب کے دو بیٹیاں دشانق اور شکرلہ اور ایک بیٹا (دشو) اناتھ ڈانڈا ہوئے جو ی ۱۹۲۷ء میں انتقال ہو گیا۔ جب ناصر صاحب کی عمر صرف ۳۶ برس کی تھی۔ مگر میں خدا کا دیا سب کچھ تھا صحت اور صورتِ شکل میں کبھی کوئی کمی نہیں تھی۔ سب نے دوسری شادی کا مشورہ دیا، مگر اصرار کیا۔ لیکن اس مردِ خدا نے سب کو جواب دے دیا۔ دشو اناتھ اس وقت صرف سال بھر کے تھے (ولادت ۲۰ مارچ ۱۹۲۶ء)۔ ناصر صاحب نے کہا کہ میں ان بچوں کے لیے ماں اور باپ بن کر ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت کروں گا۔ کبھی کسی اور چیز کی ضرورت ہے نہ آرزو۔ اور یہ انھوں نے کر دکھایا۔ اس کے بعد وہ عمر بھر عجز رہے۔

تعلیم و فن کے بعد بیشتر زمانہ امرِ قسری میں گزرا۔ وفات سے کوئی نو سو پینے پہلے اپنے بیٹے دشو اناتھ دتا کے پاس کو روکشیتر میں رہنے لگے تھے۔ دشو اناتھ صاحب کو وراثت کا بیڑا لاہور میں ایم اے کے طالب علم تھے کہ ملک تغیر ہو گیا، اس پر اس نے مشرقِ پنجاب یونیورسٹی



سے ایم اے کیا اور پھر ۱۹۵۵ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے دوبارہ ادب میں ایم اے کیا۔ اس کے بعد ولایت چلے گئے اور وہاں کیمبرج یونیورسٹی سے ایم لٹ کی سند حاصل کی۔ آج کل گورنمنٹ یونیورسٹی میں محکمہ شعبہ پنج اور سوشل سائنس فیکلٹی کے ہیں۔

فادر صاحب کا ذیابیطس کا مرض پرانا تھا؛ دل کا عارضہ بھی تھا۔ زندگی کے آخری ۲۵ برس کم و بیش علالت ہی میں بسر ہوئے۔ یہی کیا کم تھا کہ کیتس ہو گیا۔ لیکن موت کا بہانہ عارضہ بول ہوا۔ ۲۵ نومبر ۱۹۷۵ء کو حرکت قلب بند ہو جانے سے دگرگئے عالم جاوہر ہو گئے۔ انھوں نے موت کا جس خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا اور جیسے آخر تک خاندان کے مختلف افراد اور دوسرے حاضرین سے باتیں کرتے رہے۔ ذہن برباد اور دست و پا چتر تھا۔ منور تھا۔ حقیقتاً ان کی موت سے ایک عظیم انسان ہم سے جدا ہو گیا۔ ایسا خود ادا اور نڈر آدمی دیکھنے میں نہیں آیا۔ وہ سیاسی تحریک کے نلے میں قید رہے تھے؛ جلیا نوالہ بارخ اور قس کے اٹناک سانحے کدقت دہان موجود تھے اور اسی کے بعد ان کی گرفتاری عمل میں آئی۔ لیکن اس کے باوجود کہ بعد کے دنوں میں ان کے تمام سیاسی اکابر سے ذاتی تعلقات تھے، انھوں نے انعامِ بدعا و خدمت طلب کرنا تو دیکھا، کبھی اس کا ذکر تک نہیں کیا۔

وہ سید وسیع المطالعہ شخص تھے۔ چونکہ فاضل اور انگریزی میں دستگاہ کامل تھی، اس لیے تمام عالم اور فلسفہ اور تاریخ کا خاص طور پر مطالعہ کیا تھا۔ اسی سے ان کی اپنی زندگی بالکل قدیم فلاسفہ اور روحانی پیشواؤں کی شے چوگئی تھی۔

متعدد کتابیں ان سے یادگار ہیں: (۱) ڈال ڈال، (۲) پات پات (مکتوبات، ۱۹۶۰ء تا ۱۹۶۲ء) پرجم ضیا (۱۹۶۱ء)؛ (۳) جواہر پارے (۱۹۶۲ء تا ۱۹۶۳ء)۔ گد باد رکلام (۱۹۶۳ء تا ۱۹۶۴ء)؛ (۴) اہل بیف (۱۹۶۳ء تا ۱۹۶۴ء) ہومر (۱۹۶۵ء تا ۱۹۶۶ء)؛ (۵) میراجائی (۱۹۶۶ء تا ۱۹۶۷ء)؛ (۶) ذکر و فکر (کلام، ۱۹۶۷ء)۔ منکر مکتوب ایہ میں وہ خطوط جمع کیے تھے، جو ان کے احباب نے ان کے نام لکھے تھے۔ ان کی شریعت و دل کا نمونہ ہے۔ سلامت اور راجا جی۔ میان ان کے جو بہر خاص تھے۔ چونکہ علم و ادب پر نگری نظر تھی اور حافظہ بہت قوی تھا، انہیں بچے نقطہ نظر کے اجابت کے لیے تحریر میں تادیبی اور مذہبی تعلیمات کثرت سے استعمال

کرتے تھے، حکومتِ برصغیر نے ان کے اعزاز میں انھیں ۱۹۶۹ء میں پدم شری، کا اعزاز عطا کیا تھا۔

اب ان کے چند شعر دیکھیے۔

وہ تلنگاہ میں ہے بغیر آزما قاصر! چلو کہ وقت ہے اب قسمت آزمائی کا  
 کسک کیسی ہے یہ دردِ ہنساں کی سینس ہم بھی تو، قاصر! آپ کا داڑ  
 رہنے کا لطف خاک ہے ہدم! جہاں میں جیسا ہے اپنے بس میں نہ موت، اختیار میں  
 ہزارا بنے ہم، ہزارا بار سے جہاں میں نقشِ کفِ پلے دہراں کی طرح  
 حرم میں، دیر میں کیا اختلاف ہے قاصر! یہاں بھی ان کے طلب گار ہیں وہاں کی طرح  
 بشر کو چاہیے آہستہ کہ ہو، اسے قاصر! دم نہ کہ بھی سرداہ دل کو کھانے کیلئے  
 بلبل کو دیکھنا ہوں کہیں، گر جھن سے وہ روتا ہوں رازدار کہ خود ہوں وطن سے دور  
 حسیں ہیں اور بھی دنیا میں لیکن محبت ہو گئی ہے کچھ نصیب سے  
 کسی کے گیسو درخ کی یہ دھن ہے غرض ہے کھڑے ہم کو، نہ دیں سے  
 بتاؤ، دل دیے کس کو، قاصر! نظر آتے ہو کچھ اندو گیس سے  
 یہ سادگی بھی عجیب دگی ہے، اسے قاصر! کسی نے وعدہ کیا، تم نے اعتبار کیا  
 کیا کہوں خود کو شادینے کے قاصر فائر سے

دائے غرض میں بن گیا، امٹی میں مل جانے کے بعد

شودش سرسوم گل پر نہیں ہے مختصر جوش و خروش جو ہے بار بار ایک برس  
 کیسے دن لگتے ہیں، قاصر! گردشِ تقدیر دل ہے کچھ حد سے زیادہ متعذر! ایک برس  
 لے جا کے اُس گلی میں، یہ دل نے کہا تھے پہنچا دیا بیتاں رتبے، آگے ترانِ نصیب!  
 ساتھ ہی اس کے نکل آئیگا دل میرے سینے سے نہ ظالم! پتھر کھینچ  
 آخِ شب، وقت ہے تاثیر کا دل سے قاصر! تارِ شبگیر، کھینچ  
 ہوتی ہے ان کی پاؤں میں، "نہیں" بھی لی ہوئی

اقراد بھی وہ کرتے ہیں، انکا دل کی طرح

اپنے ہی چلو میں دشمن ہو، تو کوئی کیا کرے !

دل مارا آشنا کا آشنا کا ہو گیا

ہو اسے باغ کی ہے، ہمصیفر واکس کو آگاہی

یہاں کجِ قفس ہی میں ہوئے ہیں بال پر پیدا

حالت پر چھو نہ زندہ گاؤں کا

ہے کرم مرگب ناچھانی کا

آلامِ عشق، راحتِ بہیم سے کم نہیں اسے بواہوس ! یہ زخم بھی رجم سے کم نہیں

منصہ دیکھا کرم کو جرم پر تو حسرتوں بیگناہی بول اٹھی میں بھی گہنگا دوں میں ہوا

خمنے سود و زیاں کے اس تجارت میں نہیں میں دل و جاں سے محبت کے خریداروں میں ہوا

نہیں آسنا کبھی نالہ بوں تک ہمارا ضبطِ غم ہے کیا نقاں سوز

دوسے دل میں جگہ ہے، ذہری فصل میں اب وہ اخلاص کہاں اوز کے نظاں میں

آنکھیں مری کھلی ہیں، اسیری میں ہمصیفر کجِ قفس میں خاک کہوں ہمارے دل

زندگی کا کوئی مقصد نہیں، تاحصر معلوم خواب دلچسپ ہے، پر حالِ تعبیر نہیں

مرچھوٹے کو سنگِ سہراہ کم نہیں دیوانگی میں کیا ہے دردِ بام سے عرض

دسوائیاں کسی کی محبت میں ہیں تو ہوں مطلب ہے انگ سے نہ ہیں نام سے عرض

تاحصر ہواں پہ حالِ دل را دستکش اتنی ہی بس ہے شکوہِ ایام سے عرض

نادسا آہ، حدِ چرخ، زمانہ دشمن اپنی بگڑی ہوئی تقدیر بنائیں کیونکر

کیا رُخِ محبت میں مجھے فریاد و شیون نے

اگر تابِ تھیل ہو، تو دنیا را زداں کیوں ہوا

سراخ ان کا اگر پاؤں، تو اسے اس قدر چھو

جہاں ہو کر عیاں کیوں ہو عیاں ہو کر نہاں کیوں ہوا

یہ جانتا ہوں کہ آجھی نہیں ہے جلالی

ہو ضبطِ خاک، اگر دل کو تاب ہی نہ

## ابوالکلام آزاد

اک جہاں علم و فضل، اک کاٹنا عقل و روش  
 روشِ اعلیٰ ہے نہیں کے نام پیغامِ روش  
 ایک کو و استقامت، پیکرِ عزم و ثبات  
 ایک بحرِ سیرانِ داد سے کائنات  
 ایک دل، دامنِ اسرارِ نگاہِ ذات  
 اک نظرِ بینندہ، نظارہٴ حسنِ صفات  
 تھے صفات اس کے نقطِ شروعِ فروغِ حسنِ ذات  
 ذات تھی اس کی نقطِ نظارہٴ حسنِ صفات  
 اس کی شخصیت میں نہاں ایک بساطِ کجاں  
 ایک بزرگِ محل میں انصافِ تگ و بے گناہاں  
 وارثِ عہدِ قدیم و خالقِ عصرِ جدید  
 مصدقِ فکرِ سلیم و مخزنِ خلقِ حمید  
 مرجعِ اہل سیاست، رشدِ اصحابِ دی  
 مکتبِ انوارِ عرفان، مشرقِ بہرِ بغیر  
 روم میں تیغ و سنان، اور بزم میں باغ و بہار  
 ایک طرحِ آتشِ فشاں، اور دوسرا رخِ لالہ بار  
 سورتِ مسور کن سے، یوسفِ مصرِ جلال  
 نعلی و کش سے، کلیمِ طورِ عرفان و کمال  
 زندگی افزا، حیاتِ افروز، اس کا سرِ سخن  
 ہر تخلیقِ مقاصدِ عزم اس کا حرفِ کلام  
 اس کے ہر لفظ میں صد ویزِ علم و آگہی  
 اس کی اور دنیا کے سوسے رنگوں میں شادابی

شرح و ملت کا امیں، نقد و سیاست کا امام  
 وہ فصاحت کا، بلاغت کا، جہانت کا امام  
 جس نے دیکھا اور سمجھا طرز و طور و بالکل  
 اس پر ثابت ہے کہ ہے یہ دور دور و بالکل  
 قربا بایہ کہ تار یک سر و نخ گرد عیاں  
 عبد و در ملک مصر، آزاد در ملت شاں  
 جس کے اک اک لفظ میں پنہاں تھی جانک  
 بزم میں جس کا حکم تھا نشانِ زندگی  
 جس کا لفظی سحر افکن سر بہر تفسیر تھا  
 جس کا فکر عرشِ پیادہ ہر کی تفسیر تھا  
 ملک ہے محروم آج اُس عظمت کو اسے  
 تشنہ ہے ذوقِ ادب اُس کدورت کا اسے  
 سرزمینِ مہند و تفتِ یاس بے اندازہ ہے  
 دفترِ علم و بصیرت آج بے شیرازہ ہے  
 آسمانِ راقی بود گرجوں بیاد بر زمیں  
 بہر خواستہ حضرتِ آزاد، امیر ملک دیں



بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ان کی تعلیم اسی نوج پر شروع ہوئی۔ لیکن والد کی موت بعد وصال نے اس کا رخ بدل دیا۔ حالات مجید ناساز گار تھے، اور گرد و حلیوں اور محدود وسائل دشمن اور بدخواہ زیادہ۔ ایسے میں بھی اس دورِ قیم نے محنت نہیں ہادی اور مالی مشکلات اور مناسب مشورے کے فقدان کے باوجود اپنا تعلیمی دور نہایت شاندار مرتبے پر بسر کیا۔ ابتدائی تعلیم بھی طور پر ہر رائج میں ہوئی۔ یہاں زیادہ تر اُدوسے مزدورت رہی۔ اس کے بعد لکھنؤ گئے اور خیریت آباد ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا، پھر وہیں سے لے گئے۔ بہر حال اس کے بعد تعلیم زیادہ بہت کامیاب رہی۔ اسکول کے زمانے میں ہر درجے میں اول آئے اور ہر مضمون میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرتے رہے۔ بالآخر ۱۹۱۷ء کیننگ لائے لکھنؤ سے بی۔ اے کی سند لے لگے جس (۱۹۱۷ء) ایم اے میں داخلہ لے لیا تھا، لیکن زندگی خراب ہو جانے کے باعث امتحان میں شامل نہ ہو سکے۔

اسی زمانے میں صوبہ متحدہ شمال و غرب (حال اتر پردیش) میں ایک نئی اسمبلی نکل۔ کام یہ تھا کہ صوبے میں جو کتاب چھپے، اس کے ضروری کوائف سرکاری گزٹ میں شائع ہوں۔ اپریل ۱۹۱۸ء میں شید مسعود حسن کا اس اسمبلی پر آفر ہو گیا۔ وہ یہاں ساڑھے تین سال رہے۔ انہوں نے خود کوئی جگہ لکھا ہے کہ میں نے اس دوران میں مختلف علوم کی چھوٹی بڑی تقریباً دس ہزار کتابیں مطالعہ کیں، ظاہر ہے کہ ان میں ہر طرح کی ضخامت کی کتابیں ہونگی۔ کچھ بھی چھوڑا نہ اوسطاً آٹھ کتابوں کے مجموعی صفحات ۲۵۰۰۰ سے کم کیا ہونگے! اور یہ مطالعہ مسلسل تین برس تک جاری رہا۔ صرف یہ نہیں وہ ان مطبوعات کی فہرست بناتے، ہر ایک کا خلاصہ تیار کرتے، اور اس پر تبصرہ لکھتے۔ یہ کوائف ان کے سرکاری گزٹ میں ہر تیسرے جیسے جیسے تھے۔ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس مقدار مطالعے کا ان کے دل و دماغ کی تشکیل اور علم و عرفان کی تکمیل پر کیا اثر ہوا ہوگا! یہ حقیقت ہے کہ بعد کی زندگی میں ان کی محنت کی عادت اور تصنیفی فطرت کی بنیاد ہی دلنے میں پڑی۔

ہا کش! کرنی اشد کا بندہ ان مظلوم کا کھوج لگا کر انہیں مع کر دیتا۔

۱۹۲۲ء میں انھوں نے الہ آباد یونیورسٹی سے "ای ٹی" درجہ پڑھنے کی سند حاصل کی اور اس کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول، فسخ گڑھ میں مدرس مقرر ہو گئے۔ لیکن اس کے چند سال بعد ہی انھیں لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر کے عہدے کی پیشکش ہوئی۔ حال آنکہ اس نے عہدے کی تقاضا اور مستقبل کی توقعات سے عہدہ کی حد تک سے کہیں کم تھیں، انھوں نے مع غمخوارہ کو خیر باد کہا، اور اپنے وطن بانی لکھنؤ چلے آئے، جہاں اردو کی خدمت کے مواقع زیادہ تھے۔ یہیں سے انھوں نے اثنائے ملازمت میں ایم اے (فارسی) کی سند درجہ اول میں حاصل کی (۱۹۲۴ء) اور اس نمایاں کامیابی پر انھیں یونیورسٹی کی طرف سے طلائی تمغہ بھی عطا ہوا تھا۔

وہ درجہ بدرجہ اردو کے سلیس لکچر (۱۹۲۴ء) اور اسی ریڈر (۱۹۲۴ء) اور صدر شعبہ اردو فارسی (۱۹۳۰ء) مقرر ہوئے۔ آخر کار طویل اشتغال کے بعد ۱۹۵۳ء میں پروفیسر مقرر ہوئے، اور ۳۲ سالہ کامیاب ملازمت کے بعد یہیں سے ۱۹۵۴ء میں سکندرشہ جوشیہ ان کے زمانہ تہذیب میں لکھنؤ یونیورسٹی میں علم و تحقیق کی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ سچ ہے شیعہ لاکھ اندھیرے میں کیوں نہ دکھ دی جائے، اس کا اور گرد و منورہ ہوتا ہے۔ ان کی بدولت یونیورسٹی کا نجانے کے مشرقی شعبے میں بھی بہت ترقی اور توسیع ہوئی۔

وہ ابھی تعلیم کے ابتدائی مراحل بھی طے نہیں کر سکے تھے کہ ۱۹۱۰ء میں انھیں دوسرا نمونہ عارضہ لاحق ہو گیا اور اس کے بعد وہ سات آٹھ برس تک مسلسل اس کا شکار رہے۔ برہمنی سے بعد کے زمانے میں اس پر تخیل کی شکایت متسلز اور بوجھ۔ قوام شروع سے کچھ کمزور تھا، ان عوارض نے اور بھی تبدیل کر دیا۔ کوئی اور ہوتا، تو ہتھیار ڈال دیتا۔ یہیں آفریں ہے ان کی تہذیب پر کہ انھوں نے نہ تعلیم سے ہاتھ اٹھایا، نہ کبھی محنت سے جی حرا یا۔ خدانے بھی مدد کی اور وہ طام کا شکار کے باوجود ترقی کے منازل طے کرتے چلے گئے۔ اردو سے انھیں دلچسپی ہی نہیں، عشق تھا۔ ان کی دوسری دلچسپی فارسی سے تھی۔ اس شوق کی تسکین کے لیے انھوں نے ۱۹۳۲ء میں فارسی کے گہوارے اور ہندستان کی تاریخ و تمدن کے منبع ایران کی سیاحت کی۔ واپسی پر عراق گئے اور وہاں قاضی



کی زیارت کرتے ہوئے وطن واپس آئے۔ یہ سفر خاص علمی ذوق و شوق کا نتیجہ تھا۔ مولانا محمد حسین آزاد کے سفیر ایران کے بعد اپنی نوعیت کا غالباً دوسرا سفر تھا۔

مسعود صاحب ۵۶ برس تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔ ان کی سب سے پہلی کتاب ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ ذیل میں ان کی نصف صدی کی مطبوعہ کتابوں کی فہرست ملاحظہ فرمائیے :

۱۔ اشفاق و فدا (۱۹۲۸ء) انگلستان کے ملک مشرق وسطیٰ میں سن کی طویل نظم ایک لکڑیوں کا نثری ترجمہ، دیباچے اور حواشی کے ساتھ۔

۲۔ ولستان اُردو (۱۹۲۵ء) بچوں کے لیے نظم و نثر کے اسباق۔

۳۔ حامی شاعری (۱۹۲۷ء) اس میں اُردو شاعری پر حواشی اعتراض کیے جاتے ہیں ان کا مثلاً جواب دیا ہے۔ اسے حالی کے مقدمہ شاعر شاعری کا مترجم بنانا چاہیے۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی۔ ۱۹۷۱ء تک اس کے گیارہ ایڈیشن خود مصنف نے طبع کیے۔ ان کے علاوہ چودا شاعریوں نے اسے شہین مرتبہ ان کی اجازت کے بغیر چھاپ لیا۔

۴۔ فرنگ اشفاق (۱۹۲۸ء) اس میں فارسی عربی کے تقریباً ۱۲۵۰ اشعار کا ترجمہ اور محل استعمال بتایا ہے۔ اس کے مزید دو ایڈیشن ۱۹۳۸ء اور ۱۹۵۸ء میں

چھپے۔  
۵۔ جاقس رنگین (۱۹۲۹ء) سعادت یار خان رنگین کی قابل قدر کتاب مقدمے اور اشعار کے ساتھ۔

۶۔ فیض میر (۱۹۲۹ء) میر نے یہ کتاب فارسی میں لکھی تھی۔ رضوی صاحب نے فارسی متن پر فیض اُردو ترجمہ اور حواشی و فرنگ کا اضافہ کیا۔ یہ دوسری مرتبہ ۱۹۶۴ء میں چھپی۔

۷۔ نظام اللہ (۱۹۳۱ء) آرزو گھنوی کی کتاب جس میں تفسیق کلمات اور رسوائی کے اصول وغیرہ سے بحث ہے۔ مسعود صاحب نے اس پر مفصل نثری حواشی کا

اضافہ کیا ہے۔

۸۔ درجہ انیس (۱۹۴۱ء) اس میں انیس کے سات مرثیوں کا انتخاب، کچھ سلام اور رباعیاں، (زنگ اور حواشی کے ساتھ شامل ہے۔ یہ کتاب مزید چار مرتبہ (۱۹۵۵ء، ۱۹۶۴ء، ۱۹۶۸ء، ۱۹۷۷ء) میں شائع ہوئی۔

۹۔ جو اہرسلن (۲) (۱۹۵۳) ہندستانی اکادمی، الہ آباد نے اردو شاعری کا انتخاب چار جلدوں میں شائع کیا تھا؛ اس کی دوسری جلد محمد حسین حر یا کوڑی نے مرتب کی تھی؛ مسعود صاحب نے اس کی تصحیح کی تھی۔ یہ جلد محمد میر کے شعرا کے انتخاب پر مشتمل ہے۔ شروع میں ہر ایک شاعر کے مختصر حالات بھی دیے گئے ہیں، جس سے اس کی شگاہِ تذکرے کی ہو گئی ہے۔

۱۰۔ شام کا برائیں (۴) میں انیس کا مشہور مرثیہ "بہ قطع کی مسافت شبِ نازین" صحت من اور فرنگی کے ساتھ چھاپا گیا ہے۔ اس کی کتابت لکھنؤ کے مشہور خطاط مرزا جو آدم جوم نے کی تھی اور اس کے ساتھ کچھ تصویریں بھی تھیں۔ یہ نظائی پرس لکھنؤ سے پوری آب و تاب کے ساتھ چھاپا تھا۔ اس کی قیمت ۷ روپائی تھی۔ مذہبی حلقوں نے ان تصویروں کی غنت مخالفت کی تھی جس پر بعد کو انھیں کال دینا پڑا۔

۱۱۔ فائز دہلوی اور دیوانہ فائز (۱۹۴۶ء) اس کی اشاعت کے بعد جلد ہی ملک تقیم ہو گیا اور اسی کے ساتھ تمام کے ہنرمند بھی ضائع ہو گئے، اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا۔ مسعود جوم نے جس محنت سے متن کی تصحیح کی ہے اور فائز کے حالات جمع کیے ہیں، اس کی تمام دیدہ و نظر نقادوں نے داد دی ہے۔

۱۲۔ متفرقات غالب (۱۹۴۷ء) مسعود صاحب کے پاس ایک بیاض تھی جس میں غالب کے ۳۹ غازی خطوط اور کچھ متفرق اردو غازی منظوم کلام شامل تھا۔ اس کو انھوں نے ایک مسودہ (۱) اور غازی حواشی کے ساتھ شائع کیا تھا۔ اس کا دسرا ایڈیشن غالب صد سالہ برسی کے موقع پر ۱۹۶۹ء میں چھپا۔

۱۳۔ اردو زبان اور اس کا رسم خط (۱۹۶۲ء) یہ بھی دوسری مرتبہ ۱۹۶۱ء میں چھپی۔

۱۴۔ آب حیات کا تحقیقی مطالعہ (۱۹۵۴ء) مرحوم کا مولانا محمد حسین آزاد کی انشاء اور تحقیق، دونوں پر ایمان تھا۔ اس مختصر کتاب میں انھوں نے ان اعتراضوں کا جواب دینے کی کوشش کی ہے، جو آب حیات پر کیے گئے ہیں۔ حذافہ اضافہ کے بعد یہ کتاب دوسری مرتبہ ۱۹۶۲ء میں چھپی تھی۔

۱۵۔ فلسفۂ انیس (۱۹۵۷ء) انیس کے متعدد مشنوں کا انتخاب ایک لڑائی میں پروکسر مسلمانانہ انصاف کو بلا قربت کی ہے۔ کہیں کہیں ربط قائم کرنے کی خاطر اپنی طرف سے کوئی شریعتاً مصرع بھی اضافہ کیا ہے جس کا اعتراف دیا جائے گا کہ یہ میں موجود ہے، لیکن انیس کے مشن کتاب میں کسی جگہ حاشیے میں نشانہ نہیں ملتا کہ یہ اضافہ کہاں ہے، تاکہ قاری کو التباس نہ ہو تاکہ کوئی کلام انیس کا ہے اور کونسا مرتب کی طرف سے اضافہ۔ اس کتاب پر پراثر پرنٹس حکومت نے ایک ہزار کا انعام عطا کیا تھا۔

۱۶۔ تذکرہ نادر (۱۹۵۷ء) از مرزا اکبر حسین نادر اس میں ۵۲۵ شعرا کے حالات ہیں۔

۱۷۔ فناءِ عبرت (۱۹۵۷ء) مرزا عجب کے مصنف جب علی بیگ سرور کی یہ نسبتاً کم مشہور کتاب ہے، اکی کو کتب معمول عہدگی سے مرتب کر کے شائع کیا تھا۔

۱۸۔ مکھنڈ کا شاہی ایجنٹ (۱۹۵۷ء) اس کتاب پر یو پی حکومت کی طرف سے ایک ہزار روپیہ کا انعام ملا تھا۔

۱۹۔ مکھنڈ کا شاہی ایجنٹ (۱۹۵۸ء) اس پر بھی اتر پردیش حکومت نے ایک ہزار روپے عطا کیا تھا۔

۲۰۔ اردو ڈراما اور اسٹیج (۱۹۵۹ء) یہ دو جلد (۱۸) اور (۱۹) کا مجموعہ ہے اسی کی پہلی برمرحوم کو ۱۹۶۰ء میں سائنس اکادمی کا پانچ ہزار کا انعام ملا تھا۔ ان تینوں کتابوں میں انھوں نے خوب خوب داؤدِ حقیقی دی ہے۔ اس کی اندر کچھ کا صحیح متن پیش کیا ہے اور اس کی حیثیت متعین کی ہے۔ یہ تینوں کتابیں دوسری مرتبہ ۱۹۶۸ء میں

شائع ہوئی تھیں ۔

۲۱۔ آئینہ سخن فہمی (۱۹۵۹ء) تید محمد احمد بخود مولانی نے ادیب صاحب کی کتاب بادی شاعری پر اپنے دو سالوں جو ہر آئینہ اور منظر آئینہ میں عرض کیے تھے، یہاں انھیں کا رو کیا گیا ہے ۔

۲۲۔ گلشن سخن (۱۹۶۵ء) مواد علی خان قبلہ کا تذکرہ شعر سے آرد ۔

۲۳۔ ایرانیوں کا مقدس ڈراما (۱۹۶۶ء) ایران میں زمانہ محرم میں قعرِ چلبہ گردان کا اداں ہے۔ اس موقع پر جو رسوم ادا کی جاتی ہیں، ان کی شکل مذہبی ڈرامے کی سی ہے، یہاں انکی کابیان ہے ۔

۲۴۔ قواعد کلیتہً بھا کا (۱۹۶۸ء) کتاب تحفۃ الہند کا پہلا باب

۲۵۔ اندکبھا (۱۹۶۸ء) امانت کی مشہور نظم

۲۶۔ بانکت خبر سلطان (۱۹۶۸ء)

۲۷۔ شاعر اعظم افس : مختصر تعارف (۱۹۶۹ء) اس میں منتخب کلام بھی شامل ہے ۔

۲۸۔ گارشات ادیب (۱۹۶۹ء) مجموعہ مضامین

۲۹۔ اسلاف میرٹس (۱۹۷۵ء) میرٹس کے اجداد کے حالات اور کلام کا نو د ۔ اس پر

اتر پردیش اور داکا ڈیپٹی نے ۱۹۷۲ء میں دو ہزار روپے انعام دیا تھا ۔

۳۰۔ شرح جہانن اور تنقید کلام غالب

۳۱۔ رائی و نچیتہ (مقدمہ) (۱۹۷۱ء)

۳۲۔ انیسلیٹ ۱۹۷۷ء۔ ایران کی وفات کے بعد اتر پردیش اور داکا ڈیپٹی کے زیر

انتہام شائع ہوئی ۔ اس میں ان کے چھوٹے بچے ۱۱ مضامین شامل ہیں، جو اس

سے پہلے مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے تھے ۔

ان کے علاوہ یہ کتابیں ان کی زندگی میں طبع نہیں ہو سکی تھیں، اگرچہ ان کا مسودہ

کمل ہو گیا تھا ۔

۱۔ ۲۔ ۳۔ ۴۔ ۵۔ ۶۔ ۷۔ ۸۔ ۹۔ ۱۰۔ ۱۱۔ ۱۲۔ ۱۳۔ ۱۴۔ ۱۵۔ ۱۶۔ ۱۷۔ ۱۸۔ ۱۹۔ ۲۰۔ ۲۱۔ ۲۲۔ ۲۳۔ ۲۴۔ ۲۵۔ ۲۶۔ ۲۷۔ ۲۸۔ ۲۹۔ ۳۰۔ ۳۱۔ ۳۲۔ ۳۳۔ ۳۴۔ ۳۵۔ ۳۶۔ ۳۷۔ ۳۸۔ ۳۹۔ ۴۰۔ ۴۱۔ ۴۲۔ ۴۳۔ ۴۴۔ ۴۵۔ ۴۶۔ ۴۷۔ ۴۸۔ ۴۹۔ ۵۰۔ ۵۱۔ ۵۲۔ ۵۳۔ ۵۴۔ ۵۵۔ ۵۶۔ ۵۷۔ ۵۸۔ ۵۹۔ ۶۰۔ ۶۱۔ ۶۲۔ ۶۳۔ ۶۴۔ ۶۵۔ ۶۶۔ ۶۷۔ ۶۸۔ ۶۹۔ ۷۰۔ ۷۱۔ ۷۲۔ ۷۳۔ ۷۴۔ ۷۵۔ ۷۶۔ ۷۷۔ ۷۸۔ ۷۹۔ ۸۰۔ ۸۱۔ ۸۲۔ ۸۳۔ ۸۴۔ ۸۵۔ ۸۶۔ ۸۷۔ ۸۸۔ ۸۹۔ ۹۰۔ ۹۱۔ ۹۲۔ ۹۳۔ ۹۴۔ ۹۵۔ ۹۶۔ ۹۷۔ ۹۸۔ ۹۹۔ ۱۰۰۔ ۱۰۱۔ ۱۰۲۔ ۱۰۳۔ ۱۰۴۔ ۱۰۵۔ ۱۰۶۔ ۱۰۷۔ ۱۰۸۔ ۱۰۹۔ ۱۱۰۔ ۱۱۱۔ ۱۱۲۔ ۱۱۳۔ ۱۱۴۔ ۱۱۵۔ ۱۱۶۔ ۱۱۷۔ ۱۱۸۔ ۱۱۹۔ ۱۲۰۔ ۱۲۱۔ ۱۲۲۔ ۱۲۳۔ ۱۲۴۔ ۱۲۵۔ ۱۲۶۔ ۱۲۷۔ ۱۲۸۔ ۱۲۹۔ ۱۳۰۔ ۱۳۱۔ ۱۳۲۔ ۱۳۳۔ ۱۳۴۔ ۱۳۵۔ ۱۳۶۔ ۱۳۷۔ ۱۳۸۔ ۱۳۹۔ ۱۴۰۔ ۱۴۱۔ ۱۴۲۔ ۱۴۳۔ ۱۴۴۔ ۱۴۵۔ ۱۴۶۔ ۱۴۷۔ ۱۴۸۔ ۱۴۹۔ ۱۵۰۔ ۱۵۱۔ ۱۵۲۔ ۱۵۳۔ ۱۵۴۔ ۱۵۵۔ ۱۵۶۔ ۱۵۷۔ ۱۵۸۔ ۱۵۹۔ ۱۶۰۔ ۱۶۱۔ ۱۶۲۔ ۱۶۳۔ ۱۶۴۔ ۱۶۵۔ ۱۶۶۔ ۱۶۷۔ ۱۶۸۔ ۱۶۹۔ ۱۷۰۔ ۱۷۱۔ ۱۷۲۔ ۱۷۳۔ ۱۷۴۔ ۱۷۵۔ ۱۷۶۔ ۱۷۷۔ ۱۷۸۔ ۱۷۹۔ ۱۸۰۔ ۱۸۱۔ ۱۸۲۔ ۱۸۳۔ ۱۸۴۔ ۱۸۵۔ ۱۸۶۔ ۱۸۷۔ ۱۸۸۔ ۱۸۹۔ ۱۹۰۔ ۱۹۱۔ ۱۹۲۔ ۱۹۳۔ ۱۹۴۔ ۱۹۵۔ ۱۹۶۔ ۱۹۷۔ ۱۹۸۔ ۱۹۹۔ ۲۰۰۔ ۲۰۱۔ ۲۰۲۔ ۲۰۳۔ ۲۰۴۔ ۲۰۵۔ ۲۰۶۔ ۲۰۷۔ ۲۰۸۔ ۲۰۹۔ ۲۱۰۔ ۲۱۱۔ ۲۱۲۔ ۲۱۳۔ ۲۱۴۔ ۲۱۵۔ ۲۱۶۔ ۲۱۷۔ ۲۱۸۔ ۲۱۹۔ ۲۲۰۔ ۲۲۱۔ ۲۲۲۔ ۲۲۳۔ ۲۲۴۔ ۲۲۵۔ ۲۲۶۔ ۲۲۷۔ ۲۲۸۔ ۲۲۹۔ ۲۳۰۔ ۲۳۱۔ ۲۳۲۔ ۲۳۳۔ ۲۳۴۔ ۲۳۵۔ ۲۳۶۔ ۲۳۷۔ ۲۳۸۔ ۲۳۹۔ ۲۴۰۔ ۲۴۱۔ ۲۴۲۔ ۲۴۳۔ ۲۴۴۔ ۲۴۵۔ ۲۴۶۔ ۲۴۷۔ ۲۴۸۔ ۲۴۹۔ ۲۵۰۔ ۲۵۱۔ ۲۵۲۔ ۲۵۳۔ ۲۵۴۔ ۲۵۵۔ ۲۵۶۔ ۲۵۷۔ ۲۵۸۔ ۲۵۹۔ ۲۶۰۔ ۲۶۱۔ ۲۶۲۔ ۲۶۳۔ ۲۶۴۔ ۲۶۵۔ ۲۶۶۔ ۲۶۷۔ ۲۶۸۔ ۲۶۹۔ ۲۷۰۔ ۲۷۱۔ ۲۷۲۔ ۲۷۳۔ ۲۷۴۔ ۲۷۵۔ ۲۷۶۔ ۲۷۷۔ ۲۷۸۔ ۲۷۹۔ ۲۸۰۔ ۲۸۱۔ ۲۸۲۔ ۲۸۳۔ ۲۸۴۔ ۲۸۵۔ ۲۸۶۔ ۲۸۷۔ ۲۸۸۔ ۲۸۹۔ ۲۹۰۔ ۲۹۱۔ ۲۹۲۔ ۲۹۳۔ ۲۹۴۔ ۲۹۵۔ ۲۹۶۔ ۲۹۷۔ ۲۹۸۔ ۲۹۹۔ ۳۰۰۔ ۳۰۱۔ ۳۰۲۔ ۳۰۳۔ ۳۰۴۔ ۳۰۵۔ ۳۰۶۔ ۳۰۷۔ ۳۰۸۔ ۳۰۹۔ ۳۱۰۔ ۳۱۱۔ ۳۱۲۔ ۳۱۳۔ ۳۱۴۔ ۳۱۵۔ ۳۱۶۔ ۳۱۷۔ ۳۱۸۔ ۳۱۹۔ ۳۲۰۔ ۳۲۱۔ ۳۲۲۔ ۳۲۳۔ ۳۲۴۔ ۳۲۵۔ ۳۲۶۔ ۳۲۷۔ ۳۲۸۔ ۳۲۹۔ ۳۳۰۔ ۳۳۱۔ ۳۳۲۔ ۳۳۳۔ ۳۳۴۔ ۳۳۵۔ ۳۳۶۔ ۳۳۷۔ ۳۳۸۔ ۳۳۹۔ ۳۴۰۔ ۳۴۱۔ ۳۴۲۔ ۳۴۳۔ ۳۴۴۔ ۳۴۵۔ ۳۴۶۔ ۳۴۷۔ ۳۴۸۔ ۳۴۹۔ ۳۵۰۔ ۳۵۱۔ ۳۵۲۔ ۳۵۳۔ ۳۵۴۔ ۳۵۵۔ ۳۵۶۔ ۳۵۷۔ ۳۵۸۔ ۳۵۹۔ ۳۶۰۔ ۳۶۱۔ ۳۶۲۔ ۳۶۳۔ ۳۶۴۔ ۳۶۵۔ ۳۶۶۔ ۳۶۷۔ ۳۶۸۔ ۳۶۹۔ ۳۷۰۔ ۳۷۱۔ ۳۷۲۔ ۳۷۳۔ ۳۷۴۔ ۳۷۵۔ ۳۷۶۔ ۳۷۷۔ ۳۷۸۔ ۳۷۹۔ ۳۸۰۔ ۳۸۱۔ ۳۸۲۔ ۳۸۳۔ ۳۸۴۔ ۳۸۵۔ ۳۸۶۔ ۳۸۷۔ ۳۸۸۔ ۳۸۹۔ ۳۹۰۔ ۳۹۱۔ ۳۹۲۔ ۳۹۳۔ ۳۹۴۔ ۳۹۵۔ ۳۹۶۔ ۳۹۷۔ ۳۹۸۔ ۳۹۹۔ ۴۰۰۔ ۴۰۱۔ ۴۰۲۔ ۴۰۳۔ ۴۰۴۔ ۴۰۵۔ ۴۰۶۔ ۴۰۷۔ ۴۰۸۔ ۴۰۹۔ ۴۱۰۔ ۴۱۱۔ ۴۱۲۔ ۴۱۳۔ ۴۱۴۔ ۴۱۵۔ ۴۱۶۔ ۴۱۷۔ ۴۱۸۔ ۴۱۹۔ ۴۲۰۔ ۴۲۱۔ ۴۲۲۔ ۴۲۳۔ ۴۲۴۔ ۴۲۵۔ ۴۲۶۔ ۴۲۷۔ ۴۲۸۔ ۴۲۹۔ ۴۳۰۔ ۴۳۱۔ ۴۳۲۔ ۴۳۳۔ ۴۳۴۔ ۴۳۵۔ ۴۳۶۔ ۴۳۷۔ ۴۳۸۔ ۴۳۹۔ ۴۴۰۔ ۴۴۱۔ ۴۴۲۔ ۴۴۳۔ ۴۴۴۔ ۴۴۵۔ ۴۴۶۔ ۴۴۷۔ ۴۴۸۔ ۴۴۹۔ ۴۵۰۔ ۴۵۱۔ ۴۵۲۔ ۴۵۳۔ ۴۵۴۔ ۴۵۵۔ ۴۵۶۔ ۴۵۷۔ ۴۵۸۔ ۴۵۹۔ ۴۶۰۔ ۴۶۱۔ ۴۶۲۔ ۴۶۳۔ ۴۶۴۔ ۴۶۵۔ ۴۶۶۔ ۴۶۷۔ ۴۶۸۔ ۴۶۹۔ ۴۷۰۔ ۴۷۱۔ ۴۷۲۔ ۴۷۳۔ ۴۷۴۔ ۴۷۵۔ ۴۷۶۔ ۴۷۷۔ ۴۷۸۔ ۴۷۹۔ ۴۸۰۔ ۴۸۱۔ ۴۸۲۔ ۴۸۳۔ ۴۸۴۔ ۴۸۵۔ ۴۸۶۔ ۴۸۷۔ ۴۸۸۔ ۴۸۹۔ ۴۹۰۔ ۴۹۱۔ ۴۹۲۔ ۴۹۳۔ ۴۹۴۔ ۴۹۵۔ ۴۹۶۔ ۴۹۷۔ ۴۹۸۔ ۴۹۹۔ ۵۰۰۔ ۵۰۱۔ ۵۰۲۔ ۵۰۳۔ ۵۰۴۔ ۵۰۵۔ ۵۰۶۔ ۵۰۷۔ ۵۰۸۔ ۵۰۹۔ ۵۱۰۔ ۵۱۱۔ ۵۱۲۔ ۵۱۳۔ ۵۱۴۔ ۵۱۵۔ ۵۱۶۔ ۵۱۷۔ ۵۱۸۔ ۵۱۹۔ ۵۲۰۔ ۵۲۱۔ ۵۲۲۔ ۵۲۳۔ ۵۲۴۔ ۵۲۵۔ ۵۲۶۔ ۵۲۷۔ ۵۲۸۔ ۵۲۹۔ ۵۳۰۔ ۵۳۱۔ ۵۳۲۔ ۵۳۳۔ ۵۳۴۔ ۵۳۵۔ ۵۳۶۔ ۵۳۷۔ ۵۳۸۔ ۵۳۹۔ ۵۴۰۔ ۵۴۱۔ ۵۴۲۔ ۵۴۳۔ ۵۴۴۔ ۵۴۵۔ ۵۴۶۔ ۵۴۷۔ ۵۴۸۔ ۵۴۹۔ ۵۵۰۔ ۵۵۱۔ ۵۵۲۔ ۵۵۳۔ ۵۵۴۔ ۵۵۵۔ ۵۵۶۔ ۵۵۷۔ ۵۵۸۔ ۵۵۹۔ ۵۶۰۔ ۵۶۱۔ ۵۶۲۔ ۵۶۳۔ ۵۶۴۔ ۵۶۵۔ ۵۶۶۔ ۵۶۷۔ ۵۶۸۔ ۵۶۹۔ ۵۷۰۔ ۵۷۱۔ ۵۷۲۔ ۵۷۳۔ ۵۷۴۔ ۵۷۵۔ ۵۷۶۔ ۵۷۷۔ ۵۷۸۔ ۵۷۹۔ ۵۸۰۔ ۵۸۱۔ ۵۸۲۔ ۵۸۳۔ ۵۸۴۔ ۵۸۵۔ ۵۸۶۔ ۵۸۷۔ ۵۸۸۔ ۵۸۹۔ ۵۹۰۔ ۵۹۱۔ ۵۹۲۔ ۵۹۳۔ ۵۹۴۔ ۵۹۵۔ ۵۹۶۔ ۵۹۷۔ ۵۹۸۔ ۵۹۹۔ ۶۰۰۔ ۶۰۱۔ ۶۰۲۔ ۶۰۳۔ ۶۰۴۔ ۶۰۵۔ ۶۰۶۔ ۶۰۷۔ ۶۰۸۔ ۶۰۹۔ ۶۱۰۔ ۶۱۱۔ ۶۱۲۔ ۶۱۳۔ ۶۱۴۔ ۶۱۵۔ ۶۱۶۔ ۶۱۷۔ ۶۱۸۔ ۶۱۹۔ ۶۲۰۔ ۶۲۱۔ ۶۲۲۔ ۶۲۳۔ ۶۲۴۔ ۶۲۵۔ ۶۲۶۔ ۶۲۷۔ ۶۲۸۔ ۶۲۹۔ ۶۳۰۔ ۶۳۱۔ ۶۳۲۔ ۶۳۳۔ ۶۳۴۔ ۶۳۵۔ ۶۳۶۔ ۶۳۷۔ ۶۳۸۔ ۶۳۹۔ ۶۴۰۔ ۶۴۱۔ ۶۴۲۔ ۶۴۳۔ ۶۴۴۔ ۶۴۵۔ ۶۴۶۔ ۶۴۷۔ ۶۴۸۔ ۶۴۹۔ ۶۵۰۔ ۶۵۱۔ ۶۵۲۔ ۶۵۳۔ ۶۵۴۔ ۶۵۵۔ ۶۵۶۔ ۶۵۷۔ ۶۵۸۔ ۶۵۹۔ ۶۶۰۔ ۶۶۱۔ ۶۶۲۔ ۶۶۳۔ ۶۶۴۔ ۶۶۵۔ ۶۶۶۔ ۶۶۷۔ ۶۶۸۔ ۶۶۹۔ ۶۷۰۔ ۶۷۱۔ ۶۷۲۔ ۶۷۳۔ ۶۷۴۔ ۶۷۵۔ ۶۷۶۔ ۶۷۷۔ ۶۷۸۔ ۶۷۹۔ ۶۸۰۔ ۶۸۱۔ ۶۸۲۔ ۶۸۳۔ ۶۸۴۔ ۶۸۵۔ ۶۸۶۔ ۶۸۷۔ ۶۸۸۔ ۶۸۹۔ ۶۹۰۔ ۶۹۱۔ ۶۹۲۔ ۶۹۳۔ ۶۹۴۔ ۶۹۵۔ ۶۹۶۔ ۶۹۷۔ ۶۹۸۔ ۶۹۹۔ ۷۰۰۔ ۷۰۱۔ ۷۰۲۔ ۷۰۳۔ ۷۰۴۔ ۷۰۵۔ ۷۰۶۔ ۷۰۷۔ ۷۰۸۔ ۷۰۹۔ ۷۱۰۔ ۷۱۱۔ ۷۱۲۔ ۷۱۳۔ ۷۱۴۔ ۷۱۵۔ ۷۱۶۔ ۷۱۷۔ ۷۱۸۔ ۷۱۹۔ ۷۲۰۔ ۷۲۱۔ ۷۲۲۔ ۷۲۳۔ ۷۲۴۔ ۷۲۵۔ ۷۲۶۔ ۷۲۷۔ ۷۲۸۔ ۷۲۹۔ ۷۳۰۔ ۷۳۱۔ ۷۳۲۔ ۷۳۳۔ ۷۳۴۔ ۷۳۵۔ ۷۳۶۔ ۷۳۷۔ ۷۳۸۔ ۷۳۹۔ ۷۴۰۔ ۷۴۱۔ ۷۴۲۔ ۷۴۳۔ ۷۴۴۔ ۷۴۵۔ ۷۴۶۔ ۷۴۷۔ ۷۴۸۔ ۷۴۹۔ ۷۵۰۔ ۷۵۱۔ ۷۵۲۔ ۷۵۳۔ ۷۵۴۔ ۷۵۵۔ ۷۵۶۔ ۷۵۷۔ ۷۵۸۔ ۷۵۹۔ ۷۶۰۔ ۷۶۱۔ ۷۶۲۔ ۷۶۳۔ ۷۶۴۔ ۷۶۵۔ ۷۶۶۔ ۷۶۷۔ ۷۶۸۔ ۷۶۹۔ ۷۷۰۔ ۷۷۱۔ ۷۷۲۔ ۷۷۳۔ ۷۷۴۔ ۷۷۵۔ ۷۷۶۔ ۷۷۷۔ ۷۷۸۔ ۷۷۹۔ ۷۸۰۔ ۷۸۱۔ ۷۸۲۔ ۷۸۳۔ ۷۸۴۔ ۷۸۵۔ ۷۸۶۔ ۷۸۷۔ ۷۸۸۔ ۷۸۹۔ ۷۹۰۔ ۷۹۱۔ ۷۹۲۔ ۷۹۳۔ ۷۹۴۔ ۷۹۵۔ ۷۹۶۔ ۷۹۷۔ ۷۹۸۔ ۷۹۹۔ ۸۰۰۔ ۸۰۱۔ ۸۰۲۔ ۸۰۳۔ ۸۰۴۔ ۸۰۵۔ ۸۰۶۔ ۸۰۷۔ ۸۰۸۔ ۸۰۹۔ ۸۱۰۔ ۸۱۱۔ ۸۱۲۔ ۸۱۳۔ ۸۱۴۔ ۸۱۵۔ ۸۱۶۔ ۸۱۷۔ ۸۱۸۔ ۸۱۹۔ ۸۲۰۔ ۸۲۱۔ ۸۲۲۔ ۸۲۳۔ ۸۲۴۔ ۸۲۵۔ ۸۲۶۔ ۸۲۷۔ ۸۲۸۔ ۸۲۹۔ ۸۳۰۔ ۸۳۱۔ ۸۳۲۔ ۸۳۳۔ ۸۳۴۔ ۸۳۵۔ ۸۳۶۔ ۸۳۷۔ ۸۳۸۔ ۸۳۹۔ ۸۴۰۔ ۸۴۱۔ ۸۴۲۔ ۸۴۳۔ ۸۴۴۔ ۸۴۵۔ ۸۴۶۔ ۸۴۷۔ ۸۴۸۔ ۸۴۹۔ ۸۵۰۔ ۸۵۱۔ ۸۵۲۔ ۸۵۳۔ ۸۵۴۔ ۸۵۵۔ ۸۵۶۔ ۸۵۷۔ ۸۵۸۔ ۸۵۹۔ ۸۶۰۔ ۸۶۱۔ ۸۶۲۔ ۸۶۳۔ ۸۶۴۔ ۸۶۵۔ ۸۶۶۔ ۸۶۷۔ ۸۶۸۔ ۸۶۹۔ ۸۷۰۔ ۸۷۱۔ ۸۷۲۔ ۸۷۳۔ ۸۷۴۔ ۸۷۵۔ ۸۷۶۔ ۸۷۷۔ ۸۷۸۔ ۸۷۹۔ ۸۸۰۔ ۸۸۱۔ ۸۸۲۔ ۸۸۳۔ ۸۸۴۔ ۸۸۵۔ ۸۸۶۔ ۸۸۷۔ ۸۸۸۔ ۸۸۹۔ ۸۹۰۔ ۸۹۱۔ ۸۹۲۔ ۸۹۳۔ ۸۹۴۔ ۸۹۵۔ ۸۹۶۔ ۸۹۷۔ ۸۹۸۔ ۸۹۹۔ ۹۰۰۔ ۹۰۱۔ ۹۰۲۔ ۹۰۳۔ ۹۰۴۔ ۹۰۵۔ ۹۰۶۔ ۹۰۷۔ ۹۰۸۔ ۹۰۹۔ ۹۱۰۔ ۹۱۱۔ ۹۱۲۔ ۹۱۳۔ ۹۱۴۔ ۹۱۵۔ ۹۱۶۔ ۹۱۷۔ ۹۱۸۔ ۹۱۹۔ ۹۲۰۔ ۹۲۱۔ ۹۲۲۔ ۹۲۳۔ ۹۲۴۔ ۹۲۵۔ ۹۲۶۔ ۹۲۷۔ ۹۲۸۔ ۹۲۹۔ ۹۳۰۔ ۹۳۱۔ ۹۳۲۔ ۹۳۳۔ ۹۳۴۔ ۹۳۵۔ ۹۳۶۔ ۹۳۷۔ ۹۳۸۔ ۹۳۹۔ ۹۴۰۔ ۹۴۱۔ ۹۴۲۔ ۹۴۳۔ ۹۴۴۔ ۹۴۵۔ ۹۴۶۔ ۹۴۷۔ ۹۴۸۔ ۹۴۹۔ ۹۵۰۔ ۹۵۱۔ ۹۵۲۔ ۹۵۳۔ ۹۵۴۔ ۹۵۵۔ ۹۵۶۔ ۹۵۷۔ ۹۵۸۔ ۹۵۹۔ ۹۶۰۔ ۹۶۱۔ ۹۶۲۔ ۹۶۳۔ ۹۶۴۔ ۹۶۵۔ ۹۶۶۔ ۹۶۷۔ ۹۶۸۔ ۹۶۹۔ ۹۷۰۔ ۹۷۱۔ ۹۷۲۔ ۹۷۳۔ ۹۷۴۔ ۹۷۵۔ ۹۷۶۔ ۹۷۷۔ ۹۷۸۔ ۹۷۹۔ ۹۸۰۔ ۹۸۱۔ ۹۸۲۔ ۹۸۳۔ ۹۸۴۔ ۹۸۵۔ ۹۸۶۔ ۹۸۷۔ ۹۸۸۔ ۹۸۹۔ ۹۹۰۔ ۹۹۱۔ ۹۹۲۔ ۹۹۳۔ ۹۹۴۔ ۹۹۵۔ ۹۹۶۔ ۹۹۷۔ ۹۹۸۔ ۹۹۹۔ ۱۰۰۰۔ ۱۰۰۱۔ ۱۰۰۲۔ ۱۰۰۳۔ ۱۰۰۴۔ ۱۰۰۵۔ ۱۰۰۶۔ ۱۰۰۷۔ ۱۰۰۸۔ ۱۰۰۹۔ ۱۰۱۰۔ ۱۰۱۱۔ ۱۰۱۲۔ ۱۰۱۳۔ ۱۰۱۴۔ ۱۰۱۵۔ ۱۰۱۶۔ ۱۰۱۷۔ ۱۰۱۸۔ ۱۰۱۹۔ ۱۰۲۰۔ ۱۰۲۱۔ ۱۰۲۲۔ ۱۰۲۳۔ ۱۰۲۴۔ ۱۰۲۵۔ ۱۰۲۶۔ ۱۰۲۷۔ ۱۰۲۸۔ ۱۰۲۹۔ ۱۰۳۰۔ ۱۰۳۱۔ ۱۰۳۲۔ ۱۰۳۳۔ ۱۰۳۴۔ ۱۰۳۵۔ ۱۰۳۶۔ ۱۰۳۷۔ ۱۰۳۸۔ ۱۰۳۹۔ ۱۰۴۰۔ ۱۰۴۱۔ ۱۰۴۲۔ ۱۰۴۳۔ ۱۰۴۴۔ ۱۰۴۵۔ ۱۰۴۶۔ ۱۰۴۷۔ ۱۰۴۸۔ ۱۰۴۹۔ ۱۰۵۰۔ ۱۰۵۱۔ ۱۰۵۲۔ ۱۰۵۳۔ ۱۰۵۴۔ ۱۰۵۵۔ ۱۰۵۶۔ ۱۰۵۷۔ ۱۰۵۸۔ ۱۰۵۹۔ ۱۰۶۰۔ ۱۰۶۱۔ ۱۰۶۲۔ ۱۰۶۳۔ ۱۰۶۴۔ ۱۰۶۵۔ ۱۰۶۶۔ ۱۰۶۷۔ ۱۰۶۸۔ ۱۰۶۹۔ ۱۰۷۰۔ ۱۰۷۱۔ ۱۰۷۲۔ ۱۰۷۳۔ ۱۰۷۴۔ ۱۰۷۵۔ ۱۰۷۶۔ ۱۰۷۷۔ ۱۰۷۸۔ ۱۰۷۹۔ ۱۰۸۰۔ ۱۰۸۱۔ ۱۰۸۲۔ ۱۰۸۳۔ ۱۰۸۴۔ ۱۰۸۵۔ ۱۰۸۶۔ ۱۰۸۷۔ ۱۰۸۸۔ ۱۰۸۹۔ ۱۰۹۰۔ ۱۰۹۱۔ ۱۰۹۲۔ ۱۰۹۳۔ ۱۰۹۴۔ ۱۰۹۵۔ ۱۰۹۶۔ ۱۰۹۷۔ ۱۰۹۸۔ ۱۰۹۹۔ ۱۱۰۰۔ ۱۱۰۱۔ ۱۱۰۲۔ ۱۱۰۳۔ ۱۱۰۴۔ ۱۱۰۵۔ ۱۱۰۶۔ ۱۱۰۷۔ ۱۱۰۸۔ ۱۱۰۹۔ ۱۱۱۰۔ ۱۱۱۱۔ ۱۱۱۲۔ ۱۱۱۳۔ ۱۱۱۴۔ ۱۱۱۵۔ ۱۱۱۶۔ ۱۱۱۷۔ ۱۱۱۸۔ ۱۱۱۹۔ ۱۱۲۰۔ ۱۱۲۱۔ ۱۱۲۲۔ ۱۱۲۳۔ ۱۱۲۴۔ ۱۱۲۵۔ ۱۱۲۶۔ ۱۱۲۷۔ ۱۱۲۸۔ ۱۱۲۹۔ ۱۱۳۰۔ ۱۱۳۱۔ ۱۱۳۲۔ ۱۱۳۳۔ ۱۱۳۴۔ ۱۱۳۵۔ ۱۱۳۶۔ ۱۱۳۷۔ ۱۱۳۸۔ ۱۱۳۹۔ ۱۱۴۰۔ ۱۱۴۱۔ ۱۱۴۲۔ ۱۱۴۳۔ ۱۱۴۴۔ ۱۱۴۵۔ ۱۱۴۶۔ ۱۱۴۷۔ ۱۱۴۸۔ ۱۱۴۹۔ ۱۱۵۰۔ ۱۱۵۱۔ ۱۱۵۲۔ ۱۱۵۳۔ ۱۱۵۴۔ ۱۱۵۵۔ ۱۱۵۶۔ ۱۱۵۷۔ ۱۱۵۸۔ ۱۱۵۹۔ ۱۱۶۰۔ ۱۱۶۱۔ ۱۱۶۲۔ ۱۱۶۳۔ ۱۱۶۴۔ ۱۱۶۵۔ ۱۱۶۶۔ ۱۱۶۷۔ ۱۱۶۸۔ ۱۱۶۹۔ ۱۱۷۰۔ ۱۱۷۱۔ ۱۱۷۲۔ ۱۱۷۳۔ ۱۱۷۴۔ ۱۱۷۵۔ ۱۱۷۶۔ ۱۱۷۷۔ ۱۱۷۸۔ ۱۱۷۹۔ ۱۱۸۰۔ ۱۱۸۱۔ ۱۱۸۲۔ ۱۱۸۳۔ ۱۱۸۴۔ ۱۱۸۵۔ ۱۱۸۶۔ ۱۱۸۷۔ ۱۱۸۸۔ ۱۱۸۹۔ ۱۱۹۰۔ ۱۱۹۱۔ ۱۱۹۲۔ ۱۱۹۳۔ ۱۱۹۴۔ ۱۱۹۵۔ ۱۱۹۶۔ ۱۱۹۷۔ ۱۱۹۸۔ ۱۱۹۹۔ ۱۲۰۰۔ ۱۲۰۱۔ ۱۲۰۲۔ ۱۲۰۳۔ ۱۲۰۴۔ ۱۲۰۵۔ ۱۲۰۶۔ ۱۲۰۷۔ ۱۲۰۸۔ ۱۲۰۹۔ ۱۲۱۰۔ ۱۲۱۱۔ ۱۲۱۲۔ ۱۲۱۳۔ ۱۲۱۴۔ ۱۲۱۵۔ ۱۲۱۶۔ ۱۲۱۷۔ ۱۲۱۸۔ ۱۲۱۹۔ ۱۲۲۰۔ ۱۲۲۱۔ ۱۲۲۲۔ ۱۲۲۳۔ ۱۲۲۴۔ ۱۲۲۵۔ ۱۲۲۶۔ ۱۲۲۷۔ ۱۲۲۸۔ ۱۲۲۹۔ ۱۲۳۰۔ ۱۲۳۱۔ ۱۲۳۲۔ ۱۲۳۳۔ ۱۲۳۴۔ ۱۲۳۵۔ ۱۲۳۶۔ ۱۲۳۷۔ ۱۲۳۸۔ ۱۲۳۹۔ ۱۲۴۰۔ ۱۲۴۱۔ ۱۲۴۲۔ ۱۲۴۳۔ ۱۲۴۴۔ ۱۲۴۵۔ ۱۲۴۶۔ ۱۲۴۷۔ ۱۲۴۸۔ ۱۲۴۹۔ ۱۲۵۰۔ ۱۲۵۱۔ ۱۲۵۲۔ ۱۲۵۳۔ ۱۲۵۴۔ ۱۲۵۵۔ ۱۲۵۶۔ ۱۲۵۷۔ ۱۲۵۸۔ ۱۲۵۹۔ ۱۲۶۰۔ ۱۲۶۱۔ ۱۲۶۲۔ ۱۲۶۳۔ ۱۲۶۴۔ ۱۲۶۵۔ ۱۲۶۶۔ ۱۲۶۷۔ ۱۲۶۸۔ ۱۲۶۹۔ ۱۲۷۰۔ ۱۲۷۱۔ ۱۲۷۲۔ ۱۲۷۳۔ ۱۲۷۴۔ ۱۲۷۵۔ ۱۲۷۶۔ ۱۲۷۷۔ ۱۲۷۸۔ ۱۲۷۹۔ ۱۲۸۰۔ ۱۲۸۱۔ ۱۲۸۲۔ ۱۲۸۳۔ ۱۲۸۴۔ ۱۲۸۵۔ ۱۲۸۶۔ ۱۲۸۷۔ ۱۲۸۸۔ ۱۲۸۹۔ ۱۲۹۰۔ ۱۲۹۱۔ ۱۲۹۲۔ ۱۲۹۳۔ ۱۲۹۴۔ ۱۲۹۵۔ ۱۲۹۶۔ ۱۲۹۷۔ ۱۲۹۸۔ ۱۲۹۹۔ ۱۳۰۰۔ ۱۳۰۱۔ ۱۳۰۲۔ ۱۳۰۳۔ ۱۳۰۴۔ ۱۳۰۵۔ ۱۳۰۶۔ ۱۳۰۷۔ ۱۳۰۸۔ ۱۳۰۹۔ ۱۳۱۰۔ ۱۳۱۱۔ ۱۳۱۲۔ ۱۳۱۳۔ ۱۳۱۴۔ ۱۳۱۵۔ ۱۳۱۶۔ ۱۳۱۷۔ ۱۳۱۸۔ ۱۳۱۹۔ ۱۳۲۰۔ ۱۳۲۱۔ ۱۳۲۲۔ ۱۳۲

۳۔ ایران میں مرثیہ گوئی، ایک تاریخی جائزہ سلطان عالم دابد علی شاہ کوہا کی وفات کے بعد ۱۹۰۷ء میں شائع ہوئی اس سے معلوم ہوگا کہ اگرچہ وہ کہیں نہ کہیں میں بھی بند نہیں تھے، لیکن ان کے خاص موضوع یہ ہیں:

- ۱۔ رشید: ۲۔ انیس: ۳۔ اودھ کی شاہی زلمے کی تاریخ، بالخصوص عید و میلاد شاہ۔ انھوں نے ان موضوعات پر گرانقدر اور پیشروانہ کتابیں تصنیف کیں۔
- ۲۔ انھوں نے آخری آیام میں انگ کو دیا تھا، اس کا کچھ حصہ مختلف یونیورسٹیوں میں بیچ گیا ہے۔

لکھنے کے معاملے میں وہ سست نہ تھے۔ بات دراصل یہ ہے کہ وہ عید و میلاد تھے، جب تک موضوع کے ایک ایک جزو تک کے بارے میں انھیں اطمینان نہ ہو جاتا، وہ نہ تو اپنے نتائج فکر کو آخری شکل دیتے، نہ اس کا کوئی حصہ شائع کرتے۔ یہی باعث ہے کہ ان کی تصنیفات کی تعداد زیادہ نہیں۔ اسناد سے وہ بڑی کامیاب رہتا، اور محض سستی شہرت حاصل کرتا، یہی ان کا طبع نظر ہوتا، تو یہ فہرست بہت طویل ہو سکتی تھی۔ لیکن بہالت موجودہ یہ اتنی مختصر بھی نہیں کہ کوئی سنجیدہ مورخ ادب اس سے مرہن نظر کر سکے۔ اپنے تنوع اور معیار کے لحاظ سے یہ عید قابل قدر اور مستند حلیہ و خیرہ ہے اور یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ مدتوں اس پر آسانی سے اضافہ نہیں ہو سکیگا۔

ان مستقل کتابوں کے علاوہ ان کے مضامین اور شذرات کی بھی خاصی بڑی تعداد مختلف رسائل و جرائد میں منظر ثری ہے۔ اگر انھیں جمع کیا جائے، تو ان سے کئی مجلد تیار ہو سکتے

ہیں۔ ان کی مسلسل علمی اور ادبی خدمات کا اعتراف حکومت نے بھی کیا، اور اردو زبان حلقے نے گیارہ شہید کتابوں پر انعام ملے جن کا اوپر ذکر ہوا۔ اپریل ۱۹۷۰ء میں صدر جمہوریہ سندھ نے انھیں نادر کی کاغذ کی حیثیت سے اپنا خاص اعزاز عطا کیا، جو ایک سند اشال اور معنی حیات تین ہزار روپیہ سالانہ وظیفے پر مشتمل ہے۔ اپریل ۱۹۷۰ء میں حکومت نے پدم شری کا خطاب بھی دیا۔ پھر ۱۹۷۲ء میں حکومت اتر پردیش نے ان کی تصنیفی

کادشوں کے لیے انھیں پانچ ہزار کا خاص انعام۔ ایک مفت دیالو ایک شدھی عطا کی۔

۱۹۲۶ء میں ان کی شادی ٹیکا پور کا پنورم کے مشہور طبیب حکیم شید محمد اصغر حفیضی نعتیہ عرف ہمارے صاحب کی صاحبزادی حسن جہاں بیگم سے ہوئی۔ شید محمد اصغر حفیضی کا سلسلہ حضرت شاہ نعمت اللہ دہلوی کرانی سے ملتا تھا، جن کا آئندہ کی پیشگوئیوں پر ختم فیصدہ شہرہ آفاق ہے؛ اسی لیے انھوں نے اپنے نام کے ساتھ "نعت اہلی" کا اضافہ کر لیا تھا۔

بیگم مسعود مرحوم کو علم سے شغف اپنے والد سے ملا تھا۔ وہ انگریزی بھی جانتی تھیں؛ اردو میں شعر بھی کہتی تھیں؛ حوزہ میں تخلص تھا۔ انیس کی عاشق تھیں، بلکہ حافظ بھی۔ ان کا انیس کا مطالعہ بھی درجے کا تھا، اس کا کچھ اندازہ اس سے لگائیے، اگر جب بھی مسعود صاحب کو انیس کے کسی بندے کے بارے میں معلوم کرنا ہوتا کہ وہ کس مرثیے میں ہے، تو وہ ان سے دریافت کرتے۔ مرحوم در وصف شاعری کرتے، بلکہ متعلقہ جلد لاکر پیش کر دیتے۔ موت سے کچھ پہلے وہ اردو ضرب الامثال جمع کر رہی تھیں، لیکن یہ کام ناکمل رہ گیا۔ ان کا ۲۳ اکتوبر ۱۱۱۱ھ بمطابق ۱۹۹۸ء کو انتقال ہوا۔

ان بیگم سے مسعود صاحب کی سات اولادیں ہوئیں؛ (۱) سب سے بڑی صاحبزادی ارجمند خانم، ڈاکٹر بیج الزماں دارالبادیونیہ شریف، فروری ۱۹۷۷ء کے عقد نکاح میں آئیں۔ (۲) مسعود صاحب کے سب سے بڑے بیٹے ڈاکٹر شید اختر مسعود؛ پشاور دیونیہ (پاکستان) میں خانا کے استاد ہیں۔ (۳) ان سے چھوٹی صاحبزادی برہیس بالو ایم اے (اردو) کراچی کے ایک تعلیمی ادارے سے وابستہ ہیں۔ (۴) امیری بیٹی انیس باؤ اپنے شوہر کے ساتھ امریکا کے شریکلی فورڈ (لاس انجلس) میں مقیم ہیں۔ (۵) ڈاکٹر نیر مسعود دیگر بیٹے کنستو دیونیہ کے شہر خانا میں قریب ہیں (۶) ان سے چھوٹے بیٹے شید انور مسعود، صوفی تیشہ مویو پیچاک کالج، کنستو میں پڑھاتے ہیں۔ (۷) سب سے چھوٹے صاحبزادہ اظہر مسعود صوفی، یو پی اردو کالٹی، کنستو میں ہتہم نشر و اشاعت ہیں۔

ادیب مرحوم کے کام کردہ اشاعتی ادارے۔ کتابانگہ کی نگرانی بھی انہیں کے ذمے ہے۔

بہسنی کے ساتھ شدتِ جواب دینے لگی تھی۔ اکتوبر ۱۹۶۶ء میں بلکے انتقال کا انہیں قدر بہت صدمہ ہوا، اور اس کے بعد بہت السردہ رہنے لگے تھے۔ خاکِ کفر بھی بہت کمزور ہو گیا تھا؛ بات جلدی بھول جاتے تھے۔ اس کے باوجود تقویرا بہت کھنے کا شغل جاری رہا۔ لیکن جولائی ۱۹۷۷ء میں طبیعت زیادہ خراب ہو گئی اور بیشتر وقت خود فرسنگ سی طاری رہنے لگی تھی۔ ۲۹ جولائی کو خاموشی اور خدِ بدافسردگی کا دورہ پڑا؛ اور کھانا پینا بالکل چھوٹ گیا۔ اس کے بعد وہ اردشس سے کچھ افاذہ ضرور ہوا، لیکن بستر سے اٹھنے کی سکھت سلب ہو گئی۔ پورے چار ماہ اسی حالت میں گزرے۔ ۲۹ نومبر ۱۹۷۷ء (مذہب ۱۵ ذیقعدہ ۱۳۹۵ھ) رات کے پنے نو بجے خالقِ حقیقی کے بلا لب پر لبیک کہی۔ انا فیکر انا اکرینہ راجعون۔

خادمہ اگلے دن (۳۰ نومبر) تھا۔ اہل سنت اور اہل تشیع نے اگلے ملکِ نادِ جلالِ پر بھی جماعت کی امامت تیار کیا، مولانا تہجد علی نقی صاحب مجتہدِ عرفِ نقی صاحب نے اور اہل سنت کی مولانا محمد ہاشم انصاری فرنگی مہلی (اب مولانا صبیح اللہ شہید انصاری) نے کی۔ بعض اصحاب نے دونوں نازوں میں شرکت کی۔ انہیں کر لے نشی فضل حسین میں اپنی مرحومہ بلکے کے پہلو میں سپردِ خاک کیا گیا۔ یرحمہا اللہ تعالیٰ  
کئی اصحاب نے تادیخِ وفات کہی۔ ڈاکٹر رفیق حسین رفیق سکھوی کی عیسوی میں ہے، شیدائے انیس، افسوس اب ہم سے خودِ حضرت یہاں ہونے جنت کے مسعود حسن رضوی بیاختہ نکلا ہے منہ سے یہ رفیق اپنے ”اگلا و حقائق تھے مسعود حسن رضوی“  
(۱۹۷۷ء)

بحری مصرعہ حکیم عربیہ قدوسی کا مثنوی کہ ہے :

آہ، صدحیف مسعود حسن رضوی (۱۳۹۵)

پروفیسر مسعود حسن رضوی مرحوم نے کسی لڑنے میں شاعری بھی کی تھی؛ ادیبِ تخلص کیا ابجد کو

جب شوقا دی سے مزاحمت برحق ہو تو یہ شغف ترک ہو گیا۔ لیکن اس زمانے کا جو کلام تھا، اس کا ایک مختصر انتخاب انہوں نے 'ہادی شاعری' کے دیباچے میں درج کر دیا تھا۔ میں نے جب ایک مرتبہ ان سے دریافت کیا کہ کچھ اور کلام بھی عنایت فرمائیں، تو کہا کہ بس، اب اسی کلام کا مجھے! پھر میں وہی اشعار یہاں درج کر رہا ہوں۔ کلام کے تینوں جلد ہیں کہ اگرچہ یہ شوق جاہل دیکھتے، تو آج ان کا مشاعرہ شعرا میں شاد ہوتا۔

جذبہ کا بے نیاز ی سے اثر بڑھتا گیا میں تب جس جس طرف عالم ادھر بڑھتا گیا  
کچھ عجب حال ہے، راہِ شرل مقصود کی جتنا جتنا میں بڑھا، میرا سفر بڑھتا گیا  
فرطِ غمی سے دنیا بن گئی آمینہ دار ایک ہی صورت نظر آتی ہے ہر تصویر میں  
کیا کہی، دیوانگی عشق کی رسوائیاں لاف کے پابند بھی باندھے گئے ذخیر میں  
اک نہ دیتا، اک بہارستانِ شوق کیا بتائیں، ہم نے کیا دیکھا، تری تصویر میں  
ہے ایک نقشہ دلِ مجبور کی آشتی انگوں کا لبِ ساحلِ جاہلوں کا ابھرنے اور مٹ جانا  
دوبل نہیں ہنس کے کہنے دے ندا اسے شوق ضبط!

اک دل بنا آشنا کا امتحاں ینا ہے آج  
آج کل چشمِ کرم نا دیمسائی ہے ابھی کچھ مردہ تماؤں میں جان آئی ہے  
پاؤں میں ہوتی ہے بڑی کِ گرائی محسوس دجیاں جب یہ نہیں رہتا کہ اب آؤ آدموں میں  
طاہر بن گئے شمس، جب وہ شعلے دل سے اٹھتے ہیں

آؤ چار آؤ ہو جا آؤ ہوں میں خاکِ نشین پر  
یہ سستی بردہ داری ہو، اور دماغِ بچہ وہ حالِ دل جو دھچپیں ہر سو سے تنہا ہو  
مجھے تھے طوفانِ بہتی میں سے جانے پناہ ایک موج کوہِ پیکر، وہ بھی کئی ساحل تھا  
اب خبر دیکھیے، پیاد کی کیا آتی ہے ہر طرف سے مجھے رونے کی صدا آتی ہے  
اس کی چشمِ مستِ بشاریوں کے ڈر کھلے دل کی دنیا کے بہتے باداب ہم پر گھلے  
ایں دلوں کیوں ہی نہیں گلے گلے کش میں کہیں برآؤ کو شاید ہے پھر میرے نشین کی تلاش  
خوفِ رسوائی نہیں تو ضبطِ غم سے کام کیا پختہ کا دایہ جنوں کو ہوشِ جنگ نام کیا



خط سے کیا مطلب ہے، قاصد سے مجھ کو کام کیا

دل میں جو رہتا ہے، اس کو نام و پیغام کیا  
مجھے قاسمِ ادل سے کبھی کچھ بگلا نہ ہوتا جو یہ تم نے تھے مجھ کو، تو یہ دلِ طائرِ قبا  
وہ سیرِ وحشت و حشت، اور وہ میرے دل کی دیوانہ

اُدھر تھا میں، بیا باں میں، ادھر مجھ میں بیاں تھا  
میں نے غم پہ بھی آگے سے آئی تھی ہنسی وہی دلِ خندہ شادی سے بھی دیکھ رہے اب  
تھے ہم آواز، جب اکاوتی دنیا نے خیال حلقہ حلقہ، دُغیر ہے اب  
صفوِ دل کے سوا، جو کہیں دنیا میں تھی رزے و دے میں جاں کے وہی تصویرِ آبا  
اب کہاں میں وہ کہ جس کے بس کا ہوا خطا سے

دل میں طاق چاہیے، ضبط و فغاں کے واسطے  
بس اک یہ حسرت ہے اب، اسے طولِ حبسِ قبا!  
نغمہ سے جو یس وہ، تو میں ہی کھول کے رولوں  
ہم سخن لاکھوں ہیں، لیکن جہزِ باں کوئی نہیں

مجھ کو دنیا کی بھری محفل بھی خلوتِ خانہ ہے  
خوشی میں رنج! کہیں کیا کمال کے علم کو خزاں کا خوف ہے جوشِ بہار میں ہم کو  
اپنی تدبیروں پہ، اسے غافل! نظر تو نے نہ کی

ورنہ تیرھ لینا خطِ تقدیر کچھ مشکل نہ تھا  
غمِ شکستِ جہدِ ضبط و صبر کا سنا پڑا اپنے مہمِ بدوں سے آخرِ دردِ دل کہنا پڑا  
ہر بستم میں دہاں پہناں تھی برقی عقلِ سوز میں سمیتا تھا کہ اندازِ جفا کچھ اور ہے  
ہم خاک کو سمجھا کیے اکیر ابھی تک تدبیرِ رہی تا بلخِ تقدیر ابھی تک  
سیرِ غلہ، نالِ میرا تو اتنا بھی سمجھ لیں باقی ہے مری آہ میں تا ثیر ابھی تک  
شکوہ کیا، مجھ کو جو بزمِ ناز سے اٹھوائے ہے

حال کس سہل کا اُس نازک سے دیکھا جائے ہے!

دیکھیں نگاہِ شوق کی گستاخیاں ادیبانِ یتیم جہل گئے 'مرے' نازک مزاج کے  
وہی آئینے سے خود میں کو یہ دیتی ہے صد

اب میرا جازن کہ ترے ناز اٹھائے کوئی  
دنیا کو کیا خبر مرے حالِ سیاہ کی حسرت کہاں جو ہم مصائب کی  
دیکھی قسمت کی عروسی کہ مثلِ ننگ ہے آہ حسرت کے اندر سے نکلیں اہلِ شکر  
طاقتِ پردہ از بھی ہے، بہت پردہ الہی حسرت پر ہوتے، نکلتی حسرتِ پردہ از بھی  
دیا یہ شوقِ پردہ از اکِ قفس کے رہنے والے کو

مجھے تجھ سے بس اتنا، میرے فطرتِ پاک ہے

## تمکین ہر مست، سید محمد قادر الدین خان 337

جید آباد کن کے ایک معزز اور صاحبِ علم گھرانے میں ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد قاضی سید مسیح الدین خان ریاست نظام کے منصبدار تھے۔ وہ عوام میں بڑے عجبیہ کے عرف سے مشہور تھے۔ جید آباد کے محلہ منگلپورہ میں مسیح الدین خان کی ڈیوٹی دینی تھیں سے منسوب ہے۔ نواب معین الدولہ ان کے حقیقی بھائی تھے۔ جب معین الدولہ کی کم عمری میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا تو جاگیر گورنمنٹ آف وائڈ کی تمویں میں چلی گئی۔ اور حضور نظام نے نواب مسیح الدین خان کو معین الدولہ کا ولی اور نگران مقرر کر دیا۔ انھیں ان کا خان کا ۱۹۱۱ء میں انتقال ہوا۔ اس وقت ۵۵ سال کی عمر تھی۔

نواب مسیح الدین خان کے پانچ بیٹے ہوئے ہیں، مزین علی الدین؛ (۲) عبدالقادر؛ (۳) دیگر الدین خان؛ (۴) قادر الدین؛ (۵) سلطان علی الدین؛ اور تین بیٹیاں؛  
 ماڈلی بیگم، قادری بیگم اور جیلانی بیگم۔

سید قادر الدین خان کو بچپن سے ادبی ماحول ملا۔ والد اگرچہ شعر نہیں کہتے تھے، لیکن ان کا ادبی ذوق بہت بلند تھا، جیسا کہ بعد کے اکثر دُعا کے یہاں ملے۔ قادر الدین کے تین بھائی شعر کہتے تھے۔ سید عبدالقادر کا تخلص ناصر تھا۔ ان سے چھوٹے سید دیگر الدین ناو تخلص کہتے تھے، ڈراما نویس سے بھی ایسی تھی سان کے بعض غیر مطبوعہ ڈرامے ان کے خاندان میں معروف ہیں۔ سید قادر الدین سے چھوٹے بھائی سلطان

عنی الدی بھی شر کہتے تھے اور تاقی مخلص کرتے تھے۔

شید قادر الدین کی پوری تعلیم گھر پر چونی؛ کسی مدرسے نہیں گئے۔ فارسی میں پوری دستگاہ  
تھی؛ انگریزی بھی بقدر ضرورت حاصل کر لی تھی۔ مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ان کے والد  
کا خاصا بڑا کتابخانہ تھا۔ انھوں نے اس سے بڑا استفادہ کیا۔ خود بھی کتابوں کا ذخیرہ  
جمع کر لیا تھا۔ اپنے ماحول کے ذریعہ جلد ہی شعر کہنے لگے۔ نکلیں تخلص تھا۔ مرست  
کا اضافہ اپنے کسی صوفی بزرگ کے نقب سے کر لیا تھا۔ آغا ذیشان گوئی میں کچھ دن غلام  
محمد رفیع ترک علی شاہ ترکی (ف: ۱۸۹۹ء) سے اصلاح لی۔ بعد کو تینوں نظم  
طباطبائی (ف: ۱۹۳۳ء) سے مشورہ کرتے رہے۔ وہ نظم طباطبائی کی فنی اور علمی  
قابلیت اور عبادت کے بہت قائل اور ثنا خوان تھے؛ ادہ کہا کرتے تھے کہ مجھے ان سے  
بہت فیض حاصل ہوا۔

ان کا کلام اپنے عہد کے مؤثر چراغ میں شائع ہوتا رہا۔ لیکن داد مستر مزاجی کا یہ عالم تھا  
کہ کسی اسے مرثیہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ لہذا آج تک ان کا کوئی مجموعہ شائع نہیں  
ہو سکا۔ اندیشہ ہے کہ اگر نوری فوجہ نہ کی گئی، تو اس باکمال شاعر کی کوئی یادگار نہیں  
رہتی۔ اگرچہ بنیادی طور پر غزل سے مزادست تھی؛ لیکن انھوں نے بعض سحر کے کی  
قنایں بھی بھی ہیں۔

سادہ عمر کیس جرم کر کام نہیں کیا۔ بعض اعتراضات کا جواب سبیل پیدا کی بھی؛ لیکن ان کا  
لاابالی پن نے یہ یقین زیادہ دن تک قائم نہ کیا۔ نواب معین الددولہ ان کے پیچھے بے محال  
تھے جب وہ دارالہمام مقرر ہوئے، تو انھوں نے بلدے میں ان کا بحیثیت مددگار  
پولیس تقرر کر دیا لیکن یہ ٹریننگ کے دوران ہی میں متعفی ہو کر گھر چلے آئے۔ اسی طرح  
تعلقہ دار درجہ اولیٰ نواب کاظم جنگ نے جو شعر کہتے اور کہی بھی ان سے مشورہ بھی کر لیتے  
تھے (ان کے لیے نوڈ آفیسر کے عہدے کا انتظام کر دیا۔ شاہرہ مقول تھا، اور اس پر کام  
اور تہہ وادی برائے نام۔ لیکن یہ شاید ایک سال سے زیادہ نباہ نہ کر سکے۔ غرض تھوڑا بہت  
جو کچھ اپنی خانوادگی جاگیر اور منصب کی جانتا، ہر لمحے اسی پر قائم رہے۔ لیکن پوسٹل سٹیشن

اور اس کے بعد انضمام ریاست پر یہ آمدنی بھی ختم ہو گئی۔ لطف یہ کہ اس پر بھی ان کی پیشانی پر نہیں آیا۔ وہی ہندواری اور آن بان اور ٹھاٹ، جو ماری عمران کا شعار رہا تھا، اس کے بعد بھی قائم رہا۔

آخر کار زمانے میں اکثر بیمار رہنے لگے تھے۔ غذا بالکل حرکت ہو گئی تھی۔ بہت مجبور کرنے پر دو چادر تھپے کھا لیتے یا دودھ پی لیتے۔ کمزوری ہونا ہی چاہیے تھا۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۷۵ء کو فجر کے وقت آنکھ کھلی، تو طبیعت کی خرابی کی شکایت کی۔ بیگم نے خیال کیا کہ کمزوری کے باعث یہ تکلیف ہے۔ دو ٹھیکش کر گرم دودھ لاکے انھیں پلائیں۔ (واپس آئیں) تو جرح قبض عسری سے پرہیز کر چکی تھی۔ اتنا بشدہ آتا امید رکھتے تھے۔ اسی دن بعد نماز عصر تھیرہ بچکین حمل میں آئی، اور درگاہ شاہ خاؤش کے احاطے میں پر دو خاک ہوئے۔ ان کی شادی صدیق علی شاہ (سابق تحصیلدار سہارنپور) کی صاحبزادی بدلتنا بیگم سے ہوئی۔ وہ امدنارسی بہت اچھی جانتی ہیں۔ شو بھی کہتی ہیں، بہنیں تخلص ہے۔ مرحوم سے دو بیٹے (مید یوسف شرف الدین (عرف یوسف سرست) اور سید قیصر صلاح الدین (عرف قیصر سرست) اور ایک بیٹی جمیلہ حامدۃ النساء بیگم یادگار ہیں۔ — یوسف سرست عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ آرٹس میں لیکچرر ہیں۔ ان کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ بیسویں صدی میں اردو ناول؟ شائع ہو چکا ہے۔ چھوٹے بیٹے قیصر سرست معروف آؤٹسٹ ہیں، سرورق کا ڈیزائن بنانے میں ان کی خاصی شہرت ہے۔ تینوں شادی شدہ اور صاحب اولاد ہیں۔

کلام بہت پختہ اور جاندار ہے۔ انھوں نے مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا۔ ذیل میں غزلیات مختصر انتخاب اور ان کی ایک نظم بطور نمونہ دے رہا ہوں جو ان کی بیگم اور صاحبزادے قیصر سرست کی بہرانی سے تیار ہوئی ہیں ان کے حالات بھی انھیں سنائے ہیں:

ہم یاد کر رہے ہیں انھیں کس امید پر اب تو غم فراق کا بھی آسرا نہیں  
حال آں کہ تم نے کب کا صلا بھی دیا، مگر تم مجھ کو بھول جاؤ گے، دل انا نہیں  
کہنے کو اب بھی زندہ ہوں، لیکن تو نے بغیر کب زندگی پر موت کا دھوکا ہوا نہیں

وصل و فراق کیل ہیں نیرنگِ بشوق کے      دردِ جنوںِ عشق کا کچھ مدعا نہیں  
 نکلیں! جملے یاد کو مٹا دے تو ہو      اپنی دغا کا مجھ پہ تو عقدہ کھلا نہیں  
 اک لمحہ فریبِ اجل کے سوا مجھے      کس وقت انتظار تھا دارِ اہم نہیں  
 دنیا و دیں لٹا کے اسے دیکھ تو نیا      یہ اور بات ہے کہ کہیں کا اہم نہیں  
 مقامِ خوشی میں پوچھو کہ دیوانوں پہ کیا گزری

جب آئی شمعِ محفل میں، تو پروانوں پہ کیا گزری  
 خزاں میں جو گلستاؤں پہ گزری سب پہ ظاہر ہے  
 محسوس کو کیا خیر لیکن، بیا بانوں پہ کیا گزری  
 زما جوشِ جنوں، دردِ محبت، اور ریشہ خنہ دو

ہواں خود بتا دینگے، گریبانوں پہ کیا گزری  
 جو کچھ بیٹی، سوہتی مجھ پہ لیکن کیا کہوں لیکن  
 مرے ضبطِ مسلسل سے تیراؤں پہ کیا گزری  
 کہاں کی روشنی، ہم لطفِ تار کی بھی کھو نہ گئے

شبِ ہم اپنی آنکھوں پر بھر دسا کر کے بھٹکے  
 مژدہ ایدوں کا طوفان ہے، مژدہ اب طغیانِ نوید کا  
 کچھ ایسا درد ہے دل میں کہ جس سے جی نہ گھبرائے  
 حقیقت میں وہی دردِ احسن و مشفق ہے، نکلیں!

کہ لب تک بھی نہ آنے پائے، اور دل میں تر جاے  
 اسی کو یاد کہتے ہیں، یہی تریا د آنا ہے  
 اب اس میں کیا کسی کو، میں ہوں کنگِ کشمیر  
 وہ اپنے زعم میں جس کو بھلا دیتا سمجھتے ہیں  
 بظاہر میں ہوں ان کا جو مجھے اپنا سمجھتے ہیں  
 غم، چیمستان ہے یہ کیفیتِ دل  
 نہ دے نہ میں داخل، نہ خفیہ میں دخل  
 کئی کیا ہے منزل کی راہِ طلب میں  
 کو راہِ طلب میں نہیں کوئی منزل  
 محنت میں مشکل سے مشکل بھی آساں  
 محبت میں آساں سے آساں بھی مشکل

گو تم بھی پاس ہو، اور حاصل ہے ہر خوشی بھی

پھر بھی میں کچھ کہی سکتی ہر شے میں پار ہوں  
میر ذوق کا نجات کا اک آفتاب تھا وہ بھی تھی، اور یہ بھی شب یا آفتاب ہے  
جو کچھ کو چاہتے ہیں، تجھے چاہتے رہے یہ مان کر بھی اس کا نتیجہ خراب ہے

مست ہو چھ، وہ تیری نیت میں کس دل سے گزارا کرتے ہیں  
جو تیری تمنا میں، تیری دوری بھی گراؤ گئے ہیں  
ہے فتح و شکست اہل وفاد اہل حقا میں فرق بھی  
یہ ہلاکے جیتا کرتے ہیں، وہ جیت کے بارا کرتے ہیں  
وہ توں کو ہنسنا تو سیکھو، تم دل کا لجاؤ تو سیکھو  
لے دو مست! ڈبو سکتے ہیں دی، جو پار اٹا مارا کرتے ہیں  
کیا بات ہے، کیوں ہر بھر کے ترا ہی نام زباں پر آتا ہے  
ہم نے تو صاف بھلائی شکل میں انہوں کو پکا مارا کرتے ہیں  
دور کے بھی اہل دانش پس سے دم بھر گزارا کرتے ہیں  
جو زندگی تیرے دیوانے بنیں نہیں کے گزارا کرتے ہیں

جان کس کو نہیں جو، نگر، پھر بھی ترک وفا کریں کیونکہ  
ہر قوت دل کو آزمائے دیکھا اک اک بت کو خدا بنا کر دیکھا  
تکلیف اسکو بھولنے والا میرا بھٹو لانا گیل لاکھ بھٹلا کر دیکھا  
جو لا سوا راستہ دکھایا مجھ کو میرا اپنا چتا بتایا مجھ کو  
دشمن کو میں کیونش دہشت رکھوں لیکن دشمن نے تو آدھی بنایا مجھ کو

یارس نہ ہو، دوری منزل پہ نہ ہو  
دہر کا کوئی غم نہ کر، ادا سان نہ کھو  
بھٹکے ہوؤں کا بھی اک ویلہ ہے یہاں  
خود راستہ نہ دیکھا، مگر راہ تو ہو

## مخلص کی دنیا

کو جس کی یاد میں مجروح ابتک ہے جگر میل  
جہاں کے عادی و کسب و اخلاص میں دستی  
جہاں ہر صورت امید تو میدی کی آئی ہے  
جہاں کے طائلوں کی بولیاں بس آہ و شیون ہے  
جہاں کا چہ چہ درد و خون کا کام دیتا ہے  
جہاں کی شام بیکھر دشمن امید ہوتی ہے  
جہاں کی دھوپ شمع سو قناد و سموم ہوتی ہے  
جہاں دن و دیر ہر محل جاتا ہے سوئے و ننگ  
جہاں آنکھوں پہ آرام سے نقد مر سوتی ہے  
جہاں ہر دلوں کو جاتا ہے رہن ہستی دستی  
جہاں حس خود داری کی بھینچ چھوٹ جاتی ہے  
جہاں صبر و رضا ہو جاتے ہیں مجبور و غدا  
جہاں آؤا دیاں بھی قید کے سانچے میں ڈھلتی ہے  
جہاں ہر اہل چڑھتے ہیں خیاں محرم و مکاری  
جہاں کے خوف سے نبیوں کے دل بھی تھک جاتے  
نبیوں ہر وقت دن کی بھی دکھائی دیتے ہیں  
ذیل خواہ اپنی سستیوں سے آپ شرائے  
فلک کی آنکھ کے ناسود و قلب ہر کے چھالے  
خاسے عزم و مرگ از تھاکی زندہ قصور  
میروں کے رنگ ایوان اگر اذقم انسانی  
مردن جن کو اک انسان نہا جیواں کی جھٹکا ہے

قضا اسی دنیا میں ہوا اک ن گز رہی را  
جہاں کی سرزمین آگست جہاں کا آسمان پتی  
جہاں چاروں طرف مایوسیوں کی حکمرانی ہے  
جہاں حد نظر تک رخ و غم کے پر خطر ہیں  
جہاں کا نور تہ درہ دموی آلام دیتا ہے  
جہاں کی صبح حزن و دیاں کی تہید ہوتی ہے  
جہاں کی چاندنی تاویک اور مغوم ہوتی ہے  
جہاں ہے ایک ہی مفہوم مرگ زندگی کا  
جہاں دن رات سر ہکڑے ہوئے نقد ہوتی ہے  
جہاں ہر شوق ہو جاتا ہے صرف فاقہ ہستی  
جہاں جوش او لوہا عمر کی سانیل نہالتی ہے  
جہاں مدق و صفا کا خون لی لیتی ہے مارا  
جہاں بے خبریاں بھی جرم کا تاب بدلتی ہیں  
جہاں نشو و پاستے ہیں چور و بھوشا قیادی  
جہاں ہر مردم پہ پائے ایمان ڈنگتے ہیں  
نبیوں بے ہیں شکر زندگی وہ ہیش کے آس  
زلے بھر کے دھکائے خدا کی بھر کے ٹھکرا  
عجم آہ سر تا پا زبان حال کے نالے  
غلامی کی چات تیرہ کی بندہ تصویر  
قیل جلی و پستی گشتہ او لم دادان  
تموں جن کو کیسے چکر جہاں سمجھتا ہے



فقط ایک خشک دہائی جن کے جسم جاں کی قیمت ہے  
 حیثیت کھیلتی ہے مدت ان جذبات کے جن کے  
 ہوا کرتے ہیں سا ان تفریح مصیبتیں جن کی  
 ارادوں پر بھی غالب جن کے غیروں کا ارادہ  
 وہ ہیں جن کے جوہر اس قدر رنگت ہے  
 ہے بس سادگی جن کی کائنات زندگی ساری  
 جنہیں انسان کہتے آدمیت پہنچاتی ہے  
 فضاے بھر و بر، کون و مکان کو ماس ہے جن  
 فقط ایک حکم جن کے مذہب پایاں کی قیمت ہے  
 مستغرق کرتے ہے تقدیر احساسات کے جن کے  
 رہا کرتے ہیں برگشتہ ہمیشہ قیمتیں جن کی  
 مذہب کی اپنی مرضی ہے، مذہب کا اسنا خفا  
 کہ خشک مومے لگے خود انہیں بن کر فضا  
 ملائی، مفلسی، ناتوا، معیبت، بھیگ، بجا  
 جنہیں زندہ سمجھتے، زندگی کو شرم آتی ہے  
 اجل کو جن سے نفرت، زندگی بیزار ہے جن

کوئی غمخوار ہے جن کا، مذہب کوئی پوچھنے والا  
 خداوند! الہا! داد! اے داد! مولانا

## محمود بیگ، میرزا

مغلوں کے ایک معزز اور پرانے خاندان کے نام لیا جاتے۔ ان کے موروثی اہلی دادا اب بیگ  
جید علی گری میں وسط ایشیا کے شہر فرغانہ (حال تاجکستان) سے جلدستان آئے اور دہلی  
میں بس گئے۔ یہاں انھوں نے اور ان کی اولاد نے سہولیات کے لیے مختلف پیشے اختیار کیے۔  
پہلے کے حالات کو یقین سے نہیں کہے جاسکتے، لیکن جب ۱۸۵۷ء کا جنگا رہوا ہے، تو ان  
کے دادا میرزا افضل بیگ کا شہر کے متوسط لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ کئی دوسرے گھرانوں کی  
طرح یہ لوگ بھی اُس کے اُس شہر سے نکل گئے۔ یہی خیال تھا کہ جب امن قائم ہو گیا، واپس  
آجائیں گے۔ لیکن ستمبر ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کا دہلی پر دوبارہ قبضہ ہو گیا، تو دادا و دیگر کا وہ اپنا  
گرم ہوا، اور سر پر آدھہ مسلمانوں کی جاواد پڑا۔ اس طرح سہار کی گئی یا نظام ہو گئی، مگر  
ان عزیزوں کو جبری شکل سے محلہ مدو گرواں (فرخشاہ) دہلی میں سر چھپانے کو حکم ملی  
اس کے بعد خاندان کی مال حالت بھی بہت کمزور ہو گئی، اور مشکل سے گزارہ بسر ہو س  
گئی۔

میرزا افضل بیگ کے پانچ بیٹے تھے: میرزا محمود بیگ، میرزا ابجد بیگ، میرزا اسحاق بیگ،  
میرزا یعقوب بیگ، میرزا شہناز بیگ، تبدیل شدہ حالات کے باعث سب کی مناسب  
تعلیم و تربیت کا انتظام بہت مشکل تھا۔ اس لیے والدین نے بڑے تیئوں بیٹوں کو پیش  
منہ لائے پروردہ کی کمانے کو چھوٹے موٹے کام پر لگا دیا؛ صرف چھوٹے دادا کے تعلیم

حاصل کر سکے۔ اس طرح میرزا یعقوب بیگ، کسی نہ کسی طرح، انٹھویں درجے تک پڑھے، اور اس کے بعد میچنل کمیٹی میں ملازم ہو گئے۔ سب سے پہلے میرزا شہباز بیگ سب سے زیادہ خوش قسمت رہے۔ ٹیٹا تک وہ سرکاری اہلکار کے عہدے تک پہنچ گئے۔ دیکھا انھوں نے مولانا حالی سے پڑھا تھا؛ اور اس کے بعد جون ۱۸۹۴ء میں دوسری درجے کی سند پنجاب یونیورسٹی سے حاصل کی۔ ان کا ۲ جنوری ۱۹۰۸ء (۱۰ رجب ۱۳۲۷) انتقال ہوا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

یہی میرزا شہباز بیگ ہمارے میرزا محمود بیگ کے والد بزرگوار تھے۔

میرزا شہباز بیگ دوسری درجے کا امتحان پاس کرنے کے بعد ہی (۱۸۹۴ء میں) سرزمینِ (عربی) کے دفتر میں بطور محرک بھرتی ہو گئے تھے۔ لیکن وہ اس پر مطمئن ہو کر بیٹھ گئے، نہ مستقبل سے متعلق غافل رہے۔ ملازمت کے دوران میں بھی وہ مختلف امتحانوں میں بیٹھے اور کامیاب ہوئے لیکن اس سے بتدریج عہدے میں بھی ترقی ہوئی، اور تنخواہ میں بھی۔ ۱۹۲۲ء میں جب وہ ملازمت سے سبکدوش ہوئے ہیں، تو سنٹرل پی، ڈبلیو، ٹی کے دفتر میں اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ افسر تھے۔

پہلی بیوی کی وفات کے بعد... ۱۹۰۰ء میں شہباز بیگ کی دوسری شادی میرزا محمود حسین بیگ، مکمل ریاست جاوہر کی صاحبزادی تدریس بیگ سے ہوئی۔ میرزا محمود حسین بیگ بھی ان کے ایک بھائی اور میرزا ادیب بیگ ہی کی ایک دوسری شاخ کے چشم و چراغ تھے۔ اس بیگم سے میرزا شہباز بیگ کے ماشاء اللہ دس لڑکے اور چار لڑکیاں ہوئیں ان میں سے دو لڑکے حضرت میں اللہ کو یاد رہ گئے۔ چونکہ انھوں نے تعلیم کے فوائد کا اپنی زندگی میں تجربہ کیا تھا اور یہ انھوں نے خود اپنے زور و بازو سے حاصل کی تھی، اس لیے میرزا شہباز بیگ نے اپنے سب بچوں کی تعلیم پر خاص توجہ کی

میرزا محمود بیگ بیٹوں میں تیسرے تھے، ان سے دو بڑے بھائی میرزا داؤد بیگ اور میرزا مسعود بیگ تھے۔ میرزا محمود بیگ ۲۰ اگست ۱۹۰۸ء کو دہلی میں پیدا ہوئے چونکہ وہ اپنے والد کے ساتھ رہے، اس لیے ان کی تعلیم انھیں شہر میں ہوئی،

جہاں وہ مختلف اوقات میں تعینات رہے۔ چنانچہ انھوں نے دسویں درجے کا امتحان ۱۹۲۳ء میں مزنگ ہائی اسکول، لاہور سے پاس کیا، جہاں اس زمانے میں ان کے والد کا ڈسٹنٹ جنرل کے دفتر میں ملازم تھے۔ اس امتحان میں وہ پہلے درجے میں پاس ہوئے اور اپنے اکوڑ میں قبول آئے۔ اس کے بعد اگرچہ انھوں نے لاہور کے فور میں سرکس میں کانگ میں داخلے کیا تھا، لیکن سال بھر بعد والد کا تبادلہ دلی ہو گیا، ہندیاں اگر وہ اینگلو مرکب کانگ کے انٹر (سال دوم) میں داخل ہو گئے۔ لیکن اس آؤٹ لڈل اور یہاں سائنس کے مضامین کی پڑھائی کا انتظام نہ ہونے کے باعث فیل ہو گئے۔ یہ ناکامی تا زیادہ ثابت ہوئی، اس کے بعد انھوں نے خوب محنت کی اور ۱۹۲۷ء میں انٹر کا امتحان میں امتیاز سے پاس کیا کہ پوری یونیورسٹی میں اول آئے۔ اب انھوں نے دلی کے پرانے کانگ سائنس ٹینس میں داخلہ لے لیا اور یہاں سے ۱۹۲۹ء (دسویں) اسے اور ۱۹۳۱ء میں ایم (فلاسفی) کی اسناد حاصل کی، ان دونوں میں بھی پہلا درجہ حاصل کیا، اور یونیورسٹی بھرس کا ایاب طلبہ میں اول آئے۔

تیسری دلیکا دڑا تنا اچھا رہنے کے بعد ملازمت ملے ہیں کیا مشکل ہو سکتی تھی یا کوئی سال سو سال حکومت ہند کے محکمہ تعلیم میں ملازمت کرنے کے بعد اکتوبر ۱۹۳۲ء میں جگہ نکلنے پر اپنے (اینگلو مرکب) کانگ ہی میں فلاسفی کے ماسٹر مقرر ہو گئے اور پندرہ برس یعنی ستمبر ۱۹۴۷ء تک اس عہدے پر تنگ رہے۔

تقسیم ملک کے بعد کانگ کا نام بدل کر "دلی کانگ" رکھ دیا گیا۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۴۷ء میں بیگ صاحب اس کے نئے چنیل مقرر ہوئے اور یوں سترہ برس یعنی ستمبر ۱۹۶۴ء تک کانگ کی باگ ڈور مان کے ہاتھ میں رہی۔

دلی کانگ کو ان کے زمانے میں بہت ترقی ہوئی، کیا بلحاظ نظم و نسق کے، اور کیا بلحاظ تعداد طلبہ اور تائن کے، یہ دلی یونیورسٹی کے متاذ کالجوں میں شمار ہونے لگا۔ اس کامیابی کا سہرا بطور بیگ صاحب کے سر تھا۔ وہ خود بھی اب ہر جگہ تعلیمی اہل میں مجتہد اور مقرر خیال کیے جانے لگے۔ چنانچہ تینوں دلی یونیورسٹی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ

کے انتظامی اداروں کے رکھ رکھاؤ ہے۔ دلی کے باہر اجیر، بھو پال اور بھونیشور کے تعلیمی اداروں کی انتظامیہ کے بھی رکن تھے۔

اکتوبر ۱۹۶۲ء میں حکومت نے ایک تعلیمی وفد مصر بھیجا تھا۔ میرزا محمود بیگ اس وفد کے سربراہ تھے۔ مصر کے بعد یہ وفد مشرق وسطیٰ کے دوسرے ممالک، سوڈان، عربیہ سعودیہ، اردن، لبنان، شام، عراق، ایران بھی گیا تھا۔

۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۶ء تک وہ ریاست جنوں و کشمیر کے تعلیمی میسر ہے؛ اور پھر جنوں کشمیر یونیورسٹی کے ہیڈ کوارٹر کے سروراش چائلز کے عہدے پر بھی فائز رہے (۱۹۶۷ء تا ۱۹۷۰ء)۔ سب سے آخر میں وہ دلی یونیورسٹی کے مراسلاتی نصاب اسٹوڈنٹ کے رینسٹل مشورہ ہو گئے تھے۔

دلی کا پہلا دورہ ۱۹۷۲ء میں پڑا۔ بہت دیر علاج رہے اور بفضلہ نبی نکلے۔ اس کے بعد کچھ احتیاط تو کرتے رہے، لیکن ان کی زندگی کے معمولات میں بہت کم فرق آیا۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۷۷ء کو عید الاضحیٰ تھی۔ اس دن صبح سے شام تک عید منانے والوں کا ہجوم رہا۔ صبح بھولی دوستوں کی آؤ بھگت اور خاطر مدارات میں مشغول رہے۔ یوں تمام دن آرام کا ایک لمحہ نہ نصیب ہوا۔ رات گئے جب بستر پر لیٹے ہیں، تو مکان کے اسے اگلے ٹھکانے پر چکے تھے۔ اگلے صبح ۱۵ دسمبر ۱۹۷۷ء کو ساڑھے سات بجے صبح کے قریب دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ روح سوتے میں قفسِ عمری سے پرواز کر گئی ہے۔ اتنا شبہ، اتنا اہم راجہ جازہ اگلے دن ۱۶ دسمبر کو اٹھا اور انھیں جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر کے قبرستان میں اپنے والد کے پہلو میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ ساری عمر شادی نہیں کی، ملاذِ لذت چھوڑ دی تھے۔

ان کے دوست غلام احمد علی نے قطعہ تاریخِ وفات کہا:-

پہلو دلی پر دلا ز کردار چمن	ہمو بس محل د یاسمین و سمن
کشت با در اجل شمع علم و ادب	کر دے نور ہر محفل و انجمن
رفت یوسف ز کھنایں بیابان	گشتند آں بھوشن چو بیت الحزن

زیست محمود، محمود زنت اذہجان      برآمد انشور بود رحمت ذوالرش  
 مال و تو تش بگفت ملی نکتہ سخن  
 اہل پیش ، نیکو کار ، غیر سخن

(۱۷۵)

شرابِ دل کی کوثر تہنیم میں دھلی ہوئی زبان اور لبِ دل ایسے پر جیسی تہذیب نہیں حاصل  
 تھی، اور یہ تکلفِ احباب کی مجلس میں جس طرح وہ چمکتے تھے، وہ بیان کرنے کی نہیں  
 دیکھتے اور سننے کی چیز تھی۔ سچ پچ وہ کہیں اور بنا کرتے کوئی، کا ساں سندھ جاتا تھا۔  
 انھوں نے تصنیف و تالیف کو اپنا پیشہ نہیں بنایا۔ اور اس سے ادب اور تادیب و توبہ  
 کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ دل کی پرانی تہذیب، میاں کے رسم و رواج، اس میں  
 بہتجا علم انھیں تھا، کاشکے وہ اسے محفوظ کر جاتے۔ وہ ہر کون ان موضوعات پر  
 آل انڈیا ریڈیو سے چھوٹی چھوٹی تقریریں نشر کرتے رہے۔ جن لوگوں نے یہ تقریریں  
 سنی ہیں، وہی کہہ ان کا لطف جانتے ہیں۔ ان کی زبان کا لوہا اور اُستاد چرٹھاؤ،  
 روزمرہ کی چاشنی، گھرلو اندازِ بیان، لہکا سا مزاج کا رنگ۔ بھولنے کی چیز نہیں  
 ان کی ۱۳ تقریروں کا ایک جہت ہی مختصر مجموعہ "نئی حویلی" کے عنوان سے چھپا  
 تھا (دئی ۱۹۶۶ء) جو صحیح معنوں میں بقامت، کھتر و بقیمت بہتر کا مصداق ہے۔  
 وفات کے بعد ۵۵ء کے ہنگامے کے اردے میں ۱۳ اربڈیائی تقریروں کا مجموعہ دئی  
 دھارہ سومصداق کی "کے عنوان سے چھپا (دئی ۶، ۱۹۷۶ء)۔ یقیناً ابھی اور بہت سی  
 تقریریں ہونگی۔

## نجم آفندی امیرزا تاج محل حسین

مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ میرزا جعفر علی نصیح اپنے ہند کے چار نامی رشتہ گوشترا میں سے تھے۔ بقید میں تھے، خلیق اور ضمیر اور دلگیر۔

نصیح کے والد مرزا مادی علی فیض آباد کے محلہ مغلیہ پور میں رہتے تھے نصیح کے علاوہ ان کے دو داد بیٹے تھے، بلخ اور صلیح نصیح ۱۸۷۷ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے آخر عمر میں ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے تھے، وہیں وفات پائی۔

انھیں نصیح کے برادر خود میرزا نجف علی بلخ اور بلخ کے بیٹے میرزا بلخ بھی شاعر اور مرثیہ گو تھے۔ میرزا بلخ کے بڑے بیٹے میرزا عاشق حسین مرحوم نیرم آفندی ہوئے، جو اس سلسلہ الذہب کے لیے بھی باعث فخر تھے۔

نیرم ۱۸۶۰ء میں کزنہ حاجی حسن آگے میں پیدا ہوئے۔ شاعری گویا ان کی گھنٹی میں بڑی تھی، بہت کم عمری میں شعر کہنے لگے، جب نیک و بد کی تیز ہوئی، تو اپنے حقیقی اموں میر اسماعیل حسین میر شکوہ آبادی لڑتے، اگست ۱۸۸۰ء میں مشورہ کرنے لگے۔ میر خود فنِ مرثیہ میں دبیر کے شاگرد تھے، اور غزل میں ناسخ کے۔

نیرم نے اپنی زندگی میں بہت کچھ کہا، لیکن اس میں سے بہت کم شائع ہوا، کہا جاتا ہے کہ غزلیات کے کثات دیوان تھے، لیکن ان میں سے صرف دو چھاپے، نیرم اور کیاغ، نیرم، منصف شہود پر آئے، پھر کڑوں مرتبے کچھ تھے، سلام قصائد و باغیات ان کے

علامہ رباعیات کا ایک مختصر انتخاب کسی نے ملنے میں دلی سے شائع ہوا تھا۔ بزم غنائک  
 "مولود معراج" خواجہ حسن نظامی (ف: جولائی ۱۹۵۵ء) کی فرائش پر کہا اور ایک  
 مختصر اجتماع میں دو گاہ حضرت نظام الدین اولیا میں سنایا۔ خواجہ صاحب مرحوم نے  
 اسی مجلس میں بزم کو "معراج اشتر" کا خطاب عطا کر دیا۔ بزم کا ۲۳ مارچ ۱۹۵۲ء کو  
 ۹۳ برس کی عمر میں آگرے میں انتقال ہوا۔

میرزا تقی حسین نجم آفندی انھیں بزم آفندی کے بیٹے تھے۔ رمضان ۱۳۱۰ھ (مارچ /  
 اپریل ۱۸۹۳ء) میں آگرے میں پیدا ہوئے۔ ابتداً فارسی، عربی کی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اور  
 ان زبانوں میں اچھی استعداد پیدا کر لی۔ چندے مفید عام اسکول، آگرہ میں حاضری  
 دی اور یہاں سے نکل کر انھوں نے (کے سنہ) جس سے انگریزی میں بھی کچھ شہد ہو گئی  
 تھی۔

جس ماحول میں ان کی پرورش اور نشوونما ہوئی، اس میں شہر گوئی لایڈ تھی۔ چنانچہ  
 دس بارہ برس کے سن میں شہر کہنے لگے۔ مشورہ اپنے والد بزم آفندی سے، باپ اور والد کے  
 سوا کسی سے اصطلاح نہیں لی۔ روزگار کا مسئلہ پیش آیا، تو ریلوے کے ٹکٹے میں ملاز  
 م لگئی، اور ۱۹۱۲ء میں دلی میں تعینات ہو گئے۔ یہاں مسائل اور پیچیدہ امور بہت ماحر  
 کی صحبت میں آئی۔ تیوں اہل زبان اور صاحب علم و فن بزرگ تھے، نجم نے ان سے  
 بہت کچھ سیکھا اور خود استاد کا درجہ حاصل کر لیا۔ دلی کے چند سالہ قیام کے بعد ان کا  
 تبادلہ غازی پور ہو گیا۔ یہاں نجم نے ایک مجلس "انجمن شباب بنمن" کے نام سے قائم کی۔  
 اس انجمن نے ان اطراف میں آلودگی اچھی خدمت سرانجام دی، اس کے زیرِ اجتماع بہت  
 ہر چہینے مشاعرہ ہوتا رہا۔

آل انڈیا شیعہ کانفرنس ان دنوں عروج پر تھی۔ ہر سال اس کے سالانہ اجلاس ہوتے رہے  
 شہر دلی میں ہوتے اور صنفی بکھنوی مرحوم (ف: جون ۱۹۵۰ء) ان میں اپنی تاریخی نظمیں  
 پڑھا کرتے تھے۔ کانفرنس کا ۱۹۱۵ء کا اجلاس (۱۵-۱۶ اکتوبر) آباد میں ہوا تھا۔  
 اس اجلاس کی صداقت انریمل سید ابوجعفر (ماہانہ دلی) نے کی تھی۔ اس جلسے میں



نجم آفندی نے اپنی نظم "در یقیم" پڑھی۔ نظم بہت کامیاب رہی اور اس کے ایک ایک مصرع کو بار بار پڑھوایا گیا۔ نظم ختم ہونے پر کئی حضرات نے انہیں غزو میں اٹھالیا۔ حضرت عزیز نکھوی اور محسن نکھوی نے جو جلسے میں موجود تھے، انہیں ایک ایک طوائف تھامنے کا احاطہ کیا؛ ایک طالب علم سید صاحب حسین نے اپنی طرف سے نجم آفندی کو ایک گھڑی پیش کرنے کا وعدہ کیا۔ غرض بہت جوش و خروش تھا۔ فیصلہ ہوا کہ نظم نیلام کی جائے۔ مختلف اجاڑنے والی اور آخسری والی (۱۸۰۰ روپے) صاحب صدر راجا سید ابو جعفر بدختم ہوئی۔ بعد کو چونکہ یہ روپیہ داخل تعمیر خانہ کرنے کی رائے ہوئی لہذا حسب تجویز جناب صدر قراپا یا کہ ہر شخص جو بولی بولا ہے، وہ اپنا روپیہ ضرور داخل کرے۔ اس طرح سے اس نظم کی قیمت (۵۶۵۰ روپیہ وصول ہوئی)، جو یتیم خانہ (قائم شدہ ۱۹۱۳) کو دے دی گئی۔ (یہ نظم نجم آفندی کے پہلے نمونہ تھا۔ بچوں کا ہارہ میں شامل ہے)

یہ ملک میں سیاسی تحریک کے شباب کا زمانہ تھا۔ انگریزوں سے ترک موالات کا غلط بلند ہوا۔ نجم آفندی شروع سے انگریز دشمن اور وطن دوست رہے تھے۔ دفتر میں ان کا امن ایک انگریز دشمن تھا۔ ایک دن وہ ان کی کھدر پوشی پر معترض ہوا۔ نجم نے رد و جواب دیا، تو بطور ہنرا ان کا تبادلہ آسنول کر دیا گیا۔ اس زمانے کی ایک غزل کا مقطع ہے:

جینا ہے حصار بحر و شام میرا ہے نجم!

بٹکانے میں گھر ہو کہ دہ آئے میں میری

بعد کو جب سرکاری ملازمتوں کے ترک کرنے کا سوال اٹھا، تو انہوں نے بھی دلیوں کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اور دہلی چلے گئے۔ یہاں ان کا تین سال قیام رہا۔ شیخ جعفر مہدی کریم دہلوی، مشہور شاعر و مرثیہ گو، اسی زمانے میں ان کے شاگرد ہوئے تھے، اور دہلی سے وہ آگے آگئے، یہاں وقت بہت پریشانی میں گزر رہا کہ معاش کیے انہوں نے ہر طرح کے پاپڑیلے۔ ایک ماہنامہ مشورہ جاری کیا، تباہ شکنی

زراعت بھی کی۔ لیکن ہر جگہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ آخر تنگ آ کر انہوں نے  
دکن کی راہ لی، اور حیدر آباد میں وقت سفر کھول دیا۔ پارسی، انیسویا یاد تھا، نظام  
سالچیر عثمان علی خان مرحوم کے چھوٹے بیٹے شاہزادہ معظّم جاہ شجاع کے دربار سے  
والستہ ہو گئے، اور منجملہ اور اصحاب کے وہاں سے بھی مشورہ کرنے لگے۔ اس کے بعد  
برہمگودی ختم ہو گئی۔ حیدر آباد میں ۲۰ برس قیام ملا۔ ۱۹۷۱ء میں اپنے چھوٹے  
سہالی سیلوان میرزا، اکو کب آفندی سے ملنے کو اچھی چلے گئے۔ جب واپس کا سرم کیا  
تو عزیز باقا باب اور عقیدت مند اجابنے اصرار کیا کہ اب یہیں قیام کیجیے، حیدر آباد  
جا کے کیا کیجیے گا۔ دراصل وہاں کی مٹی نصیب میں بھی تھی۔ وہیں انوار ۲۲ دسمبر ۱۹۷۵ء  
کو (۱۵ ذی الحجہ ۱۴۰۵ھ) برقعہ سارے فوجی صبح انتقال ہوا۔ اسی دن قبرستان سخی حسن دربار  
(نار تھ ناظم آباد) میں دفن ہوئے۔

بخم آفندی نے بہت بڑا ذخیرہ اپنی یادگار چھوڑا ہے؛ ۲۵-۲۶ مطبوعہ کتابیں موجود  
ہیں، اور جو غیر مطبوعہ رہ گیا، وہ بھی کچھ کم نہیں ہو گا؛ انہیں میں غزلیات کا دیوان  
بھی ہے۔ ان کے دو مرثیے "سوانح فکر اور" پنج میں "بڑے مور کے" ہیں، ان میں  
انہوں نے بیک کے پہلو سے زیادہ فلسفہ و شہادت اور حضرت امام حسین اور ان کے رفقاء  
عالتقام کے کردار کی عظمت اور ان کے پیغام پر زور دیا ہے۔ ان کے سلام بھی بہت  
جلد پایہ ہیں۔ یہی حال دیباچات (تہذیب و سوانح) کا ہے، جن میں ان کے حکیمانہ اور  
منکرانہ اور فلسفیانہ انداز کا بہترین امتزاج ملتا ہے۔ ان میں چند شعرا کی غزلوں  
کے ملاحظہ ہوں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بخم کا اصل میدان مرثیہ، رباعی اور سلام ہے۔ انہوں  
نے ہندی میں بھی کہا ہے، غزل میں شاید انہیں مؤرخ ادب کوئی مقام نہ دے سکے۔

ہر اک زمان پر چرچاہے سرفروشوں کا	اجل کے سائبے میں کیا زندگی بکھر آئی
غلاب ہو شمع، راہ تو اب اسے تو رہا	ہزار بار طبیعت گنہگار پر آئی
کسے اب اعتبار گردشِ آیام آتا ہے	خدا سے بددیکھیں کس کے سبک جام سے
گزرتی ہے جیات، اک جادہ مرگِ مسلسل سے	بڑی شکل سے ادبِ دنیا میں نام آتا ہے

بدل دیتی ہے دنیا، مختلف مفہوم دیتی ہیں

جب آتا ہے اُدھ سے، ایک ہی پیغام آتا ہے  
یہ موت ہوگئی، اے دوست! زندگی نہ رہی

جو دل میں کوئی تپتا بری بھلی نہ رہی  
حقیقتوں کی کس دقت بھی کس نہ رہی  
نصویرِ منکر و نظر ہے، جو تشکل نہ رہی

پُر ادا ہے عداوت پہ عمرِ سبِ پردہ

مگر نگاہِ محبت کبھی چھپی نہ رہی  
دو کمر دی، عیشِ مصلا چھوڑ دی  
سنا کجا محراب و مہنر کی پناہ  
دستِ باطل، حق کا دامن چھوڑ دی  
یوں نہ جی، اُدنا شناسِ زندگی!  
گو دینِ انسانیت دم توڑ دے  
موت برجھتی ہے، تو بن جا حتی پرست  
موت سے پہلے ہی کیوں جی چھوڑ دی  
نہم! کچھ غفلتِ تکلف جا ہیے  
بات وہ کیا، جو کلیجا توڑ دے

بھری جبار تھی، چھوڑوں میں آشیانا تھا  
میں سوچتا ہوں، حقیقت تھی یا فضا تھا  
لال کس کو ہے، دشمن نہیں، وہ دوست بھی  
مجھے کسی نہ کسی ہے فریب کھانا تھا  
مادی دنیا اک فریبِ جلوہ جانا ہے  
یہ حم ہے دُور سے، نزدیک سے تنہا نہ ہے  
دقت کا میری طرچ، ان کو بھی شکوہ ہے، مگر  
برے شکوہ کا لڑا اندازِ جیبا کا نہ ہے  
پر سک احوال پر مجھ شکر کچھ کہتے نہیں  
بودیے پر بھی مزاجِ اہل دل شامل نہ ہے

کہو تو کچھ نہ قلب دوستاں کی یہ منزل ہے حساب دوستاں کی  
 چمن کی آبرو محفوظ رہتی نادی تے جو دوست آشیال کی  
 میکدے میں مرے ساتھی تھے، مجدد بھی تھے  
 جسے مسجد میں ٹھکانا ہے، اکیلا ہوں میں

---

ہر جا رہ و منزل میں ہے مجددے کی ادا اور  
 مجدد کی فضا اور ہے، نقل کی فضا اور  
 اشد گلا کر کے میں بچھتا یا ہوں کیا کیا  
 جب حتم ہوئی بات کہیں، اس نے کہا: اور

## طالب رزاقی، محمد قطب الدین حسن قادری

ان کا خاندان یوپی کے موم خیز مقام دریا باد (ضلع بارہ بنکی) کا رہنے والا تھا جہاں سے ان کے والد جناب الحاج محمد یوسف قادری ہجرت کر کے حیدر آباد (دکن) چلے گئے تھے۔ محمد یوسف قادری مرحوم، مولانا عبدالماجد دریا بادی (ف۔ جنوری ۱۹۰۷ء) کی سگی بھوی (بھوی) کے بیٹے تھے، ان کے والد کا نام فضل بہ تھا۔ اس طرح گویا رشتے میں طالب رزاقی مرحوم مولانا عبدالماجد دریا بادی کے بھتیجے تھے۔

الحاج محمد یوسف قادری صوفی نش بزرگ تھے۔ اردو فارسی کا اچھا ذوق تھا۔ حیدر آباد میں انھوں نے اولاً حکومت وقت کے محکمہ مالی میں ملازمت اختیار کی۔ بعد کے راجہ شیو راج بہادر کی جاگیر کے انتظامیہ میں اچھے خاصے ذمہ دار عہدے پر تقرر ہو گیا۔ ان کا اس عہدے کے پانچویں دہائی میں انتقال ہوا ہے۔ درگاہ حقیر شاہ خاموش (حیدر آباد) کے محققہ قبرستان میں دفن ہیں، خود بھی کچھ پیری مریدی کا سلسلہ قائم کر دیا تھا۔

طالب رزاقی یکم جولائی ۱۹۱۷ء کو حیدر آباد ہی میں پیدا ہوئے۔ انیسویں کریم کی تکمیل تک کے کچھ زبان اسکول کے درجوں میں تھے کہ خدا مظلوم کیوں وہاں سے بھاگ بکلیے۔ اس کے بعد جو کچھ بھی حاصل کیا، اپنے نجی مطالعے سے، اور یوں غامی استعداد بیا کر لی تھی۔

شاعری کا شوق اسکول کے زمانے ہی میں پیدا ہوا۔ ان کے بزرگوں میں حضرت شاہ عبدالرزاق ہوئے ہیں، جن کا مزار ابانہ شریف (ضلع بدہنگی) میں موجود ہے اسی سے اپنے نام کے ساتھ "ذاتی" لاحقہ کا اضافہ کیا۔ ابتدائیں فانی بدایونی (ف: اگست ۱۹۳۱ء) کی شاگردی اختیار کی۔ ان کے انتقال کے بعد پانچ برس تک حضرت حیرت بدایونی (ف: فروری ۱۹۷۷ء) سے کلام پر اصلاح لیتے رہے آخر میں استاد نے فارغ التحصیل قرار دے دیا، اس کے بعد خود ان کے طائفہ کا حلقہ خاص وسیع ہو گیا تھا۔ انوس، مکران کا مجروح کلام ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا۔

طالب کی پوری زندگی پریشانی حالی میں گزری۔ حیدر آباد ہی میں مختلف جگہ ملازمت کا دھول بنا، لیکن کہیں منتقل انتظام نہ ہو سکا۔ چندے عثمانیہ یونیورسٹی کے کتا بنجانے میں بھی ملازم رہے۔ طبیعت کے بہت حساس تھے اور حالات سے سمجھوتا کرنا گویا جانتے ہی نہیں تھے۔ دستہ داریاں بھی بہت تھیں۔ ان کی شادی حیدر آباد کے ایک خاندان، شاخ میں جناب سید مومن علی کی صاحبزادی (افضل بیگم) سے ہوئی تھی۔ ان کے بطن سے ماشاء اللہ سات بچے ہوئے، چار لڑکے اور تین لڑکیاں، انھیں پریشانیوں کے باعث کسی جگہ جمع کرکام نہ کر سکے۔ نجات تک کا تجربہ کیا، لیکن اس میں بھی ناکام رہے۔ ان کے کلام میں طزن اور سوز کا سرچشمہ بھی ان کی مادی بے اطمینان صورت حال میں دیکھا جاسکتا ہے۔

سوح موزی رض کینسر سے ہوئے۔ اس کی تشخیص اس وقت ہوئی، جب معاملہ ہمارے نکل چکا تھا۔ مقامی کینسر اسپتال میں زیر علاج رہے، لیکن مسودہ۔ ۱۳ دسمبر ۱۹۷۵ء کو دود پیر کے وقت اپنے مکان (دبیر پورہ) میں دائمی اجل کو منگ گئے۔ تدفین اگلے دن (۱۷ جنوری ۱۹۷۶ء) محل میں آئی اور انھیں بعد نماز عصر راقیہ شیخ فیض کی کان لیتھ کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ اِنَّا مَرْدٌ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔

کئی اصحاب نے تاریخ و ذات کہی۔ خود شید جنیدی کا قطع ہے :  
 ہے، کیا نہ گئی بہارِ غزل سب کی آنکھیں ہیں سو گوارِ غزل  
 لوگ منہ دیکھنے رہے، خود شید! جل با شاہِ رنگا بر غزل  
 (۱۹۷۵)

ایک قطع میں عیسیٰ اور پیری تاریخ جناب قادری ملتانی نے کہی۔ ہر ایک  
 مصرعے سے تاریخ برآمد ہوتی ہے :  
 اٹھ گئے دنیا سے طالب فکرِ دلِ نازک کام  
 (۱۹۷۵) اسے غالی ہو چکا، کیفیتِ حیرت کا جام  
 پاک، عالمِ قطبِ رذاتی کی ہے تاریخِ وصل  
 (۱۳۹۵) جنت الفردوسِ رحمان اب ہے طالبِ کائنات  
 (۱۹۷۵)

۱۳۹۵

ذیل میں کلام کا مختصر انتخاب بطور نمونہ دے رہا ہوں جو ان کی سلیقہ کی مرسلہ غزلوں  
 سے کیا گیا ہے :

عاشق ہے منزلِ شکر و شکایتِ بلند دوست کام آیا تو کیا، دشمنی کام آیا تو کیا  
 شہرِ اربا، تو فکرِ بوج و خمِ ری جب چل پڑا، تو راستہ مشکل نہیں !  
 یہ صبرِ چل، یہ تمہیں تاب و دلفِ بدوئی کبھی نہیں، کبھی حسنِ سحر کو دے رہی ہیں  
 بہارِ آئی ہے گلشن میں جبکہ اے طالب! کبھی نفس کو رکھیں ہل و پر کو دیکھتے ہیں  
 نشا جانگل دہیں خارِ عم اثر ہی ہیں چین میں کوئی تو اپنا مزاجِ اداں ہوتا  
 آبلِ گل تر سے واقف اگر ہو کل سے بہتم کیا جائے نا  
 نہیں عشقِ معصوم، ہلک کر بس کا ہارِ آدمی سے کیا جائے نا  
 یہ دل ہے، ہر اس کو دیا جائے نا جسے دے دیا، پھر یا جائے نا  
 بغیرِ اذنِ سانی، پیا جائے نا غمِ بیکلف کیا جائے نا  
 وہ میکش ہوں، نیتِ بہودِ بہود پالا پالا پیا جائے نا

کہتے ہیں ہے فرض مرمر کے جینا وہ مر جائے، جس سے جیا جائے،  
جو پونا ہے، وہ خود بخود ہو رہا ہے جیسے جا رہے ہیں، جیا جائے نا  
وہ اک نظر کے عوض دے دیا ہے جو دو جگ کے بدلے دیا جائے نا  
یہ کہتی ہے، طالب امرے دل کی خیر کن  
ترانام مجھ سے یا جائے نا

دل طالب غم ہو کہ نظر طالب جلوہ مفہوم طلب عشق میں دیو روزہ گری  
ناراض جہاں، بہت نفا، آپ بھی ناخوش سائنوں کا تسلسل، کوئی جینا تو نہیں ہے  
تراغم جان کے، ہر غم کو دیا دل کا ابو میں بہت ہوں، مجھے داد دفا دی جا  
پر چھو، جلوہ باطل میں ہے کتنی کشش، طالب حقیقت اتنی مبہم ہے کہ پہانی نہیں جاتی  
وہ ایک یاں کر جس سے ڈرا رہے ہو مجھے وہ ایک یاں بھی داس آگئی، تو کیا ہو گا!  
زہر درد غم سے ہم کب کے مر گئے ہونے وہ تو آبرو دکھ ل اقباب فرد نے  
یکدہ ہے یہ طالب اکھل کے گنگو کیسے اجنبی نہیں کوئی، سب ہیں جانے پہلنے  
کیسی بہار، کیسی خزاں، کیا غم و نشاط ان سے قریب، زندگی متعارف کا  
میں اختیار پاکے بھی، بے اختیار ہو کتنا حسین جبر ہے پر درد لگا رکھا  
تم بے نیاز درد ہو، دل آشنائے تم تم اختیار کے ہو، نہ دل اختیار کا  
جذبہ چارہ گری ہے، نہ روت و خلوص پرش حال دل زار سے ہوتا کیا ہے!

جو درد و فاسے ہادی ہو، احساس کی دولت جس میں ہو  
اس دل کو کہے کیا دل کوئی، وہ آدمی انسان کیا ہو گا!  
دل میں پیش، جگر میں خلش، آنکھ میں سرکھ یہ تھمتیں لی ہیں مجھے، زندگی کے ساتھ  
جب اس جہاں میں رخ و خوشی کو نہیں تمام یہ زندگی گزرا دے، (زندہ دل کتنا سنا)



# اشاریہ

## ۱۔ اشخاص

دکس ہند سے کچے خایہ ظاہر کرتا ہے کہ اس صفحے پر دہ نام ایک سے زیادہ مرتبہ آیا ہے

۱۲۹	: احمد شجاع (حکیم)	۲۰۹	: ابرہہ سلطان حسن
۷۴	: احمد قاس، خواجه	۶۹	: ابراہیم علی صدیقی
۲۲۰	: احمد علی (پروفیسر)	۲۵۰	: ابو جعفر، شید درما جاپنڈر اول
۶۵، ۶۴	: احمد علی شاہ عباسی	۳۵۱	
۲۷۰، ۲۶۹	: اختر حسین (حکیم)	۲	: ابوالکلام آزاد، دیکھے آزاد، مولانا
۲۷۷، ۹۹	: اختر شیرانی	۹۵۹۴	: اثر، صدیق احمد
۳۳۲	: اختر مسعود (ڈاکٹر)	۲۹۴	: اثر کھنوی، جعفر علی خاں
۳۳۲	: ارجمند بانو	۲۶۶	: اثر راہپوری جعفر علی خان (پرس)
۳۴۴	: اسحاق بیگ، میرزا	۲۰۹، ۲۰۷	: اثر، محمد حسن (قاضی)
۲۹۲	: اسرار البصری	۲۲۵، ۲۲	: احتشام حسین (پروفیسر)
۲۷۱	: اسلم (پیر حامد)	۲۹۲	: احسان دانش
۵۳، ۵۲	: اظہر، احمد الدین (اے، ڈی)	۱۷۶	: احمد راسا
۵۵، ۵۴		۷۴، ۷۳	: احمد (ڈیوڈیٹ)
۱۴۹	: اظہر علی	۲۳۶	: احمد، احمد علی
۳۳۲	: اظہر مسعود	۲۱۰	: احمد جلیس
۲۱۹، ۲۱۸	: امجد، حسین، شید		: احمد شاہ بخاری، دیکھے پیر، احمد شاہ

۲۰۹	احمد حسین فرخودی :	۲۰۹	احمد بیگ ، میرزا :
۲۷۱	اعظم (پیر جامد) :	۱۱۰ ، ۱۱۱ ، ۱۱۲	احمد ، حمید احمد :
۲۳۶ ، ۲۳۳	اعظم ، حسین :	۳۶ ، ۳۷	احمد نخی ، احمد احمد :
۱۸۲	اعظم جاد (پیش) :	۱۹۱	ارنگه (شیرخواب) :
۲۹۲ ، ۱۳۶	افتخار الدین ، میان :	۲۸۴	امیر بخش :
۹۰ ، ۹۵ ، ۹۶ ، ۸۵ ، ۸۳	افسر حامد الله :	۲۳۰	امیر خانی :
۲۲۴	اقصد فقی امره ہوی :	۲۰۹ ، ۹۳	ایر خانی :
۲۲۴	افضل بیگ مرزا :	۶۳	ابن الرشید :
	افضل حسین ثابت ، دیکھیے ثابت کھنوی	۲۸۱	ابولین ، مشر :
۲۱۰	افضل محمد :	۱۱۱ ، ۱۱۲ ، ۱۱۳ ، ۱۱۴ ، ۱۱۵	افغان ، سوز و جدت :
۱۷۹ ، ۸۲ ، ۵۴ ، ۳۱	اقبال ، ... :	۱۶۳ ، ۱۶۴ ، ۱۶۵	افروز ، یار محمد انصاری :
۱۸۳ ، ۱۸۱		۱۲۹	الوزکی ل پاشا :
۳۰۳	اکبر الا آبادی :	۳۳۲	افروز سعید :
۲۵	اکبر بادشاہ :	۳۳	افیس امام :
۱۸۲	اکبر حیدری (سر) :	۳۳۲	افیس بانو :
۲۷۱	اکرم (پیر جامد) :	۱۲۹	افیس جہان :
۱۳۰	اکمل ، دام پرتاپ :	۷۱	اوسند رنا تھہ :
۱۰۵	انطاف حسین :	۲۰۷	اودنگ ذریب :
۱۶۹	انام احمد ، شاہ :	۱۹۶	اودر سین :
۶۹	انان الله ، طا :	۱۹۷	اودگلوئی ، مشر :
۳۳۰ ، ۳۲۹	انانت کھنوی :	۱۰۳	ادلاد حسین :
۲۳۰	انتیاز بی بی :	۲۰۱	ادفکا دستگہ :
	انتیاز علی تاج ، دیکھیے تاج ، انتیاز علی	۱۰۵	ادیس احمد :

- بخش علی : ۱۵۸  
 بدالدين : ۲۶۱  
 بدالسنایکم : ۳۳۹  
 بدی پرشاد سحرے : ۴۸  
 برج اافی : ۲۵  
 برج موہن لال : ۵۰  
 برجیس باؤ : ۳۳۲  
 برجیس ظالمہ : ۶۹  
 سقہ دہلوی، بیاراج بیاد : ۲۹۸  
 ۲۹۹  
 برکت علی خان زکرم جامہ : ۹۵  
 بزداران : ۴۸  
 برین، مشر : ۲۷۸  
 بزم آندری، عاشق حسین : ۳۴۹  
 ۳۵۰، ۳۵۱  
 بسل الا آبادی، سکھ دیو پرشاد سنہا :  
 ۳۵۹  
 خات علی جانب دہلوی، دیکھے باب  
 دہلوی  
 بخش مرادی لال : ۲۹۹  
 بشیر احمد، میان : ۲۲۷  
 بشیر پرشاد سنہا : ۳۱۰، ۳۰۹  
 بھیس : ۸۴  
 بخش چند : ۲۹۵  
 ۱  
 آتش مکھنوی : ۲۱۸  
 آدربری، پردیسر : ۷۹  
 آذر مکھنوی، انور حسین : ۴۲، ۴۳  
 ۴۳۶، ۴۳۷  
 آزاد، ابوالکلام، مولانا : ۱۱۹۸، ۱۱۹۹  
 ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲  
 آزاد، چراغ علی شاہ : ۲۲۸  
 آزاد سبحانی : ۳۰۴  
 آزاد، محمد حسین : ۳۲۷، ۳۲۹، ۳۳۹  
 آفرودہ، محمد صدر الدین : ۸۷  
 آغا جون : ۲۶۵  
 آغا حشر کاشمیری : ۳۱  
 آغا شاعر قزلباش : ۲۹۸  
 آتاب احمد خان (صاحبزادہ) : ۶۷  
 آتاب منے آغا مکھنوی : ۲۹۴  
 آند بہاری لال گیتا : ۲۵  
 آند زاین طا : دیکھے آنت زاین  
 آیزے، ورین : ۲۸۲  
 ب  
 باقر عظیم آبادی : ۱۶۰، ۱۵۱  
 باقر اختر (سلمان) : ۲۳۶

- بلخ لکھنوی، نجف علی : ۳۲۹  
 بہار، شید جبر حسین : ۲۹۵، ۲۹۴  
 بہزاد لکھنوی، سردار عرفان : ۱۴۴  
 بخود مولائی، محمد احمد : ۳۳۰  
 بخود دہلوی، حید الدین : ۳۵۰  
 بیدم شاہ دادئی : ۱۰۵  
 بلی، شامس گرام : ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۵۵  
 بھگت رام، پنڈت : ۲۰  
 بھگوان سرورپ : ۴۷  
 بہوانی سنگ (جاہانا) : ۳۷، ۳۸  
 بھیم سین : ۱۴۱

## پ

- پال زلر : ۷۴  
 پراگ داس : ۴۵  
 پرچودہ چندر : ۲۹  
 پریشان، عبد الحمید : ۱۵۰  
 پطرس خیاری، احمد شاہ : ۱۸۴، ۱۷۲

۲۸۱، ۲۷۹

- پکراج (عرف کھو) : ۱۰۴  
 پنڈی داس : ۲۹۰

## ت

- تاج اتیاز علی : ۱۷۵، ۱۷۴  
 تاجور نجیب آبادی، احسن اللہ خان : ۲۷۸، ۱۷۳  
 تاجل جلاپوری، قہل حسین : ۱۶۳  
 ترکی، غلام محمد : ۳۳۸  
 تسکین : ۲۹۶  
 تینیم، محمد حبیب اللہ : ۳۱  
 تلون : ۲۸۰  
 تلکین : ۲۷۱  
 تلکین سرست، محمد نادر الدین : ۲۳۷  
 تنہا عادی : ۱۶، ۱۵  
 تنجاسنگھ : ۱۹۳  
 تیمور، امیر : ۶۴

## ٹ

- ٹامس گرام پیل، دیکھیے بلی، ٹامس گرام  
 ٹینگور، ابا بندو ناتھ : ۱۸۰، ۱۹۰  
 ٹینی سن : ۲۷۷  
 ٹھاکر پونچھی، جگن ناتھ : ۱۴۲، ۱۴۱

## ث

- ثابیت لکھنوی، افضل حسین : ۲۸۱، ۲۷۹  
 ثاقب، احسن اللہ خان : ۲۱۴، ۲۱۶  
 ۲۱۵  
 ثاقب، تید حسن رضا : ۱۵

- مایٹر، محمدین (ڈاکٹر) : ۱۷۸، ۱۷۹

۲۷۷، ۲۷۸

ج

چاندانی : ۵۰  
چٹائی، عبدالرحمن : دیکھئے عبدالرحمن  
چٹائی

چکبست : ۲۴

چب لال : ۲۵

ج

حالی : (۵، ۶۵، ۶۷، ۸۲)

حامد (اُستاد) : ۱۷۶

حامد (اُستاد) : ۲۶۶

حامد، حامد علی : ۱۳۹

حامد حسین : ۲۰۶

حامد علی خان : ۱۲۲

حبيب (پير خان) : ۱۲۷

حبيب حسن : ۱۲۸

حبيب الرحمان خان شردانی : ۶۷

حام الدين : ۲۱۳

حام الدين قاضي : ۱۸۸، ۱۱۷

حام الدين حيدر : ۲۳۳

حسرت، چراغ حسن حيدر : ۱۳۶

حسن جان بیگم : ۳۳۲

حسن نظامی (خواجہ) : ۱۹۱، ۲۰۱

۳۵۰

فرچھری، عبدالحفیظ مدنی : ۱۵۸

ثرفاطر (خوشیہ) : ۱۷۰

ج

جانب دلیوی، شانت علی : ۱۹۱، ۱۹۲

۳۰۴

جادیاقبال : ۱۶۰

جنرل حسن بہار : دیکھئے بہار، جبر حسن

حکمراد آبادی : ۸۸

حکمتا محمد رشاد شہوے : ۲۸

خیل مانچوری : ۹۵، ۹۶

خلیل، علی احمد : ۹۶

خان، خلیل احمد : ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸

جمعیت داسے : ۲۶۱

جیل میاں (پیر حید احمد خان) : ۸۲

جیل منٹھری : ۳۳

جیل حسین : ۲۰۴

جمیلہ حامدہ، النساء بیگم : ۳۳۹

جوان اسمی لال : ۲۲

جوش لمسیانی : ۶۰، ۶۱

جوش ملیح آبادی : ۲۳۶

جیلانی نادر : ۲۱۰

جیلانی بیگم : ۳۳۷

جیس، مشر :



۳۹۱ : رئیس امروہوی

۲۸ : ریاض، ریاض احمد :

۱۱۷ : ریاض الفارسی، ریاض الدین :

۱۹۷ : ریڈنگ، لارڈ :

۱۳۷ : ریہاز (ربیع حاکم) :

ز

۲۹۳ : زبرکھوی، نفعی آغا :

۲۳۶ : زکی حسین :

۳۴ : زیب النساء (بیکم نئی) :

۲۲۰ : زین العابدین احمد (چیلے) :

۳۴ : زینت (میں نئی) :

س

۶۰ : سادول :

۳۵ : ساحر دہلوی، امرنا محمدان :

۴۲ : ساغر نظامی :

۶۰ : ساگر نگرودی، بلونت کمار :

۳۶۶ : سالک نکھوی، محمد حسن :

۲۹۷ : سالک ظم دراعے صاحب :

۱۱۲۹، ۱۱۲۸ : ساغر صدیقی، محمد اختر :

۱۳۲، ۱۳۱

۲۰ : سالک دہلوی، سراج الدین احمد خان :

۳۵، ۷۶

۲۶۶، ۲۶۵ : سبط حسن فاطمہ (شید) :

۴۷ : سام سوپ (درام دریا) :

۱۹۷، ۱۹۶ : سجاد (جا) :

۱۷۶ : سچیم بخش :

۱۱۸، ۱۱۷ : سحر، عز الدین :

۳۵۱ : سزم و دہلوی، جعفر مہدی :

۲۳۶ : رسا، محمد علی :

۳۴۳ : رشید، پیارے صاحب :

۲۹۲، ۱۲۵ : رشید احمد صدیقی :

۲۲۵ : رضا، نام :

۲۰ : رضا آبادی، رضا علی خان :

۴۷ : سعد، حب لال :

۲۳۶ : رفیع احمد قدوائی :

۱۱۷ : رفیع الدین، قاضی :

۳۳۳ : رفیق نکھوی، رفیق حسین :

۶۴ : رکن الدین عباسی :

۲۱ : رگو میر تندی :

۱۲۲، ۱۲۳ : رگو نندن سرن :

۱۷۹ : رنجیت سنگھ (جہاد جا) :

۵۰ : رنگی لال :

۳۲۷ : رنگیو، سعادت، یار خان :

۶۰ : روشن نگرودی، روشن لال :

۲۹۹ : روشن پانی پتی، شگن چندر :

۲۷۷ : روشن صدیقی :

۲۲۵	شیدہ سی :	۶۹	سبط رسول، غاروقی :
۱۳۲۳، ۲۰۹	شیدہ مسعود حسن رضوی :	۲۲۰	شہزاد ظہیر، شیدہ :
۲۳۲، ۳۲۴، ۳۲۶، ۳۲۵		۳۸	سحر، عبدالعزیز :
۱۶۴، ۱۲۵، ۹۵	شیدہ سلمان ندوی :	۲۹	سحر، محمد حسین قاضی :
۳۲۲	شیدہ بیگم :	۱۹۶	سردار سنگھ کوشل :
۲۸۲	سیدہ، دہم :	۴۱	سرلا دیوی :
۲۸۱، ۲۸۱	سیاہ اکبر آبادی، عاشق حسین :	۱۹۴	سرچنی دیوی :
۲۲، ۱۰۴، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹		۳۲۹	سردار، جب علی بیگ :
ش		۲۹۳	سری رام (لالہ) :
۱۵	شاد عظیم آبادی، علی محمد :	۸۲	سعید احمد خان :
۲۱۸	شانتی (بنت ناصر) :	۱۶۳	سعید کامٹوی :
۴۳	شاہد احمد دہلوی :	۳۰۶	سعید حسین :
۳۲	شاہدہ (بنت نجم) :		سعید رضا گہر، سید رضا :
۲۸۰	شاہین (بنت داشتہ) :	۳۴	سیدہ (بنت نجم) :
۶۴۴	شانی، نرینہ سہاسی :	۶۲	سکندر لودھی :
۶۴	شبنی :	۳۹	سکندر حیات خان (نمر) :
۲۹۳	شجاع الدولہ :	۲۲۴	سلطان محی الدین :
۲۵۲	شجیع، معظم جاہ (پرنس) :	۲۰۲	سلیم پانی پتی، وحید الدین :
۳۰۴، ۶۴، ۶۶	شرر، عبدالحمید :	۳۴۸	سیکھان خان :
۱۶۶	شرف الدین شاہ :	۲۹۹	سنگیت (بنت طالب) :
۱۲۴	شعبہ (پیر خان) :	۳۸	سورج پرشاد شہوے :
۳۹	شفق عازم دہلوی، شہر حسین نقوی :	۲۲، ۲۱۸	شیدہ حسین نون :
۲۲۸، ۱۲۳، ۲۲۵	شفقت، نفیٰ نقوی، شہر حسین :	۱۲۵، ۱۲۳	شیدہ عابد حسین :
۸۳	شفقت اللہ :		



- شفیق الرحمان قدوائی : ۱۲۳  
 شکیب (بنت ناصر) : ۳۱۸  
 شکیب (پیرخان) : ۱۲۷  
 شکیلہ بیگم : ۶۹  
 شکیلہ خاتون : ۲۰۹  
 شمس مینری شمس الدین احمد : ۳۱  
 شمس الدین : ۶۳  
 شمس الدین (پیشو) : ۲۳۲  
 شمس الرحمن فاروقی : ۲۷۱  
 شمس الدین حیدر : ۲۳  
 شمس الدین حیدر : ۲۳۶، ۲۳۵  
 شمس الدین (نشی) : ۲۱۲  
 شہاب الدین (چودھری سر) : ۲۹  
 شہباز بیگ پیرزا : ۲۲۵، ۳۲۳  
 شہزاد (پیرداش) : ۲۸۱، ۲۸۰  
 شودخ کا شیریں، عدا کریم : ۲۸۷  
 شوق قدوائی، احمد علی : ۳۰۵  
 شوخی، عبدالعزیز : ۳۸  
 شوکت میرٹھی، احمد حسن : ۳۱۶  
 شوکت تھانی، محمد عمر : ۷۳  
 شوکت حسین رضوی : ۲۳۴  
 شیخ امیر : ۱۴۲  
 شہید اناموی : ۱۰۳  
 شہید، رام چھپال سنگھ : ۱۹۱  
 شیر سنگھ فیروز پوری : ۱۹۰  
 شیر شاہ سوری : ۴۱  
 شیر محمد اختر : ۱۷۵، ۱۷۳، ۱۷۷  
 شیل، ادالتر (متر) : ۱۸۱  
 شیلانجیلین : ۲۸۱، ۲۸۰  
 شیورانج بہادر (راجا) : ۲۵۵  
 شیوشنکر لال : ۳۱۰  
 ص  
 صابر حسین : ۲۵۱  
 صادق انوی، حاجی محمد : ۲۲۷  
 صبغتہ اللہ شہید انصاری : ۳۳۳  
 صدر الدین چغتہ : ۱۷۶  
 صدیقی حسن خان (نواب) : ۲۰۳  
 صدیقی علی شاہ : ۳۳۹  
 صغیر انسا : ۶۵  
 صفدر علی : ۱۴۹  
 صفی بھٹوی، علی نقی : ۲۵۰، ۲۹۳  
 صفی اللہ : ۱۶۲  
 صفیہ (بنت حسان) : ۱۲۷

## ض

عبدباری (عباد بن ندوی): ۷۸

عبدالحلیم : ۱۵۹

عبدالحق (دشمن): ۱۶۶

عبدالحق (مولوی): ۳۰۴، ۳۰۵

عبدالحکیم : ۱۵۸

عبدالحق بنال، دیکھئے بنال سیوادی

عبدالرحمن (سر): ۱۸۳

عبدالرحمن چٹائی : ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸

۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۳، ۲۷۷

عبدالرحمان نگرانی : ۱۶۷

عبدارحم چٹائی : ۱۷۶، ۱۸۱

عبدالرزاق (شاہ) : ۲۵۶

عبدالغفور خان : ۲۶۱

عبدالقادر : ۲۳۷

عبداللطیف (منشی): ۳۷

عبدالماجد : ۱۵۸

عبدالماجد : ۲۷۵

عبدالمجید شواجہ : ۱۲۳

عبدالماجد، بیابادی : ۳۵۵

عبدالمولی : ۶۷

عبدالمشرقی چٹائی : ۱۷۶، ۱۷۹

عبدالله عمادی : ۲۱۶

عبدالله سندھی : ۱۷۶

ضامن، ضامن علی (پرنسپل): ۲۰۴

ضمیر (رشید گو): ۳۴۹

ضمیر الدین نیری : ۲۱۳، ۲۱۴

ضیاء اردبیلی : ۴۶

ضیاء، عظمت علی :

## ط

طالب دہلوی شیش چندر : ۲۹۷

۲۹۸، ۲۹۹

طالب رزاقی، محمد قطب الدین حسن

## ۳۵۵

## ط

ظالم سنگھ (رانا) : ۳۷

ظفر علی خان : ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰

۲۹۱، ۲۹۲

ظفر ہدی : ۳۶۶

## ع

عابد اختر (عماد) : ۲۳۶

عابد، عابد علی : ۲۷۷

عادل بکھڑی، علی عمر : ۳۰۴

عادل الرحمن چٹائی : ۱۸۶

عالمگیر اورنگ زیب : ۲۷۷

عباس (ملا) : ۶۴

غ

عثمان علی خان (قلام، ۱۹۳، ۹۵)

غالب : ۸۲، ۲۲۸

۱۸۲، ۲۵۲

غضنفر علی : ۱۳۹

عربی، محمد حسین : ۳۱۳، ۲۲۸

غضنفر علی بخش : ۲۳۳

عزیز جلال آبادی، محمد عزیز الرحمن :

غلام احمد علی : ۲۳۷

۲۷-۲۸

غلام جیلانی (حکیم) : ۳۱۷

عزیز قدوسی : ۱۶۳، ۲۳۳

غلام حیدر خان : ۷۶

عزیز بھٹوی، محمد ابدی : ۱۲۹، ۲۵۱

غلام ساحر ملوی : ۳۸

عشرت النساء یلگم : ۱۷۰

غلام کبریا : ۱۶۲

عطاء اللہ شاہ بخاری (سید) : ۲۹۱

غلام محمد صدیقی : ۶۵، ۶۶

عقلمت علی (قاضی) : ۲۰۷

غلامی، غلام رسول : ۲۷۶

عظیم حسین (میاں) : ۳۹

غوث محمد : ۱۳۳

علی بیاد (منشی) : ۳۷

غوثیہ (نور عالمہ) : ۱۷۰

علی حسن، عظیم آبادی : ۱۵

غیاث الدین بیہن : ۶۳

علی حسین (حافظ) نور : دیکھیے نوز

علی حسین

ف

فانی : ۸۸

علی محمد : ۱۱۰

فانودہوی : ۲۲۸

علی محمد : ۱۱۲

فدا بخاری : ۲۲۸

علی محمد عباسی : ۶۵

فردوس جہاں : ۱۴۹

علی نقی، امام : ۲۰۵

فرزادہ (شہناج خان) : ۱۳۷

علی نقی مجتہد : دیکھیے نقی صاحب

فرید احمد عباسی : ۶۵

عمر الدین نقاش : ۱۷۷

فرید الدین (مستر) : ۸۷

عمر خیام : ۱۸۳

غیاث اللہ خاں شرقی : دیکھیے شرق علامہ فصاحت بھٹوی : ۲۹۲، ۳۱۴

## ک

- کاظم جنگ : ۳۳۸  
کابل ، کابل حسین : ۳۶۶  
کرمانشاه : ۱۸۸ ، ۱۸۷  
کوشن چندر : (۱۷۱) ، (۱۷۲) ، (۱۷۳)  
کریم بخش : ۷۲  
کریم خان : ۲۲۰  
کسری مناس : ۱۱۲  
کشن پرخاد (مہاراجا) : ۲۰۸  
کشوربانو چغتائی : ۱۸۶  
کنھیالال : ۲۵  
کوبرس ، الگزبڈر : ۲۷۹  
کوکب آفندی : ۳۵۲

## گ

- گاندھی (مہاتما) : ۶۰  
گدوہ ، مشر : ۲۱۲  
گلاب داس : ۲۲  
گلاب سنگ (مہاراجا) : ۲۸۷  
گنگا رام (سر) : ۱۷۲  
گورائ دتال : ۳۱۲ ، ۳۱۳  
گودکی : ۷۵  
گوری مشکراد : (۲۷۱) ، (۲۷۲)

نہج کلنوی ، جیڑ علی : ۳۳۹

فضل الہی ہشتی : ۲۷۱ ، ۲۷۵

۲۷۷

فضل حسین (سر) : ۴۹

فوز ، علی حسین : ۳۰۲ ، ۳۰۳

فہیم احمد فی : ۲۸

فیاض گویا دی ، فیاض احمد خاں :

۱۱۹ ، ۳۳

فیروز دین (مودی) : ۲۶۲

فیروز طغرائی ، فیروز الدین احمد :

۳۱۵ ، ۳۱۶ ، ۳۱۷

فیض ، فیض احمد : ۱۳۷

## ق

- قادر بیگم : ۳۳۷  
قادر میثانی : ۳۵۷  
قاصر ، برہم ناتھ دت : ۲۱۲ ، ۲۱۳  
۳۱۹  
قنیل دانا پوری : ۱۷  
قطب الدین  
قیس کوٹوی ، نور محمد : ۲۸۱ ، ۲۸۷  
قیصر جان : ۱۲۹  
قیصر مسند (صلاح الدین) : ۳۲۹

گردن سروپ، دیکھے اور انوہر سیکے  
گہر عظیم آبادی، مسجد رضا

ن

لاڈل بیگم : ۳۳۷

لائق صاحب : ۱۵

لیکے، سترک : ۱۸۱، ۱۸۰

فلت سنگھ : ۲۱۳

نعل محمد : ۱۶۳

م

الویہ، مدن موہن (پنٹ) : ۲۰

انی ناگپوری، بشیر خان : ۲۳۰

اہر بکھڑی، باسط حسن : ۲۶۶

بتلا، مردان علی خان : ۳۳۰

بہشہ : ۸۴

مقرر اس (ڈاکٹر) : ۱۸۹

مجید لاہوری : ۱۳۷، ۱۰۰

مجید ملک : ۱۸۲

مجتبیٰ حسین، ناسر : ۱۲۹۵

محبوب الرحمن : ۳۹

محبوب عالم (منشی) : ۲۹

محبوب علی خان (نظام) : ۶۲

محبوبن : ۳۵۵

حسن کاکوروی : ۳۸

حسن احمد حسن : ۲۰۹

عشر بکھڑی : ۲۵۱

عشر مرزا پوری، فرزند علی : ۱۴۸

عصو طار حسن : ۳۹

محمد اقبال خان (دیکم) : ۱۳۲

محمد حسن عباسی : ۶۶

محمد احمد : ۳۰

محمد اختر (سید) : ۲۳۳، ۲۳۶

محمد ادیس : ۱۶۳، ۴۱

محمد اسحاق : ۱۶۳، ۲۸

محمد اشراف خان : ۲۶۱

محمد اسرار علی جعفری : ۳۳۲

محمد اکبر خان : ۷۶

محمد ایوب خان (میلڈ مارشل) : ۱۳۶، ۱۳۷

۱۸۳

محمد بخش حسینی : ۱۸۵

محمد حلیس، قاضی : ۲۰۷

محمد حسن، اثر قاضی، دیکھے اش محمد حسن

محمد حسین (قاضی) سکر دیکھے سکر محمد حسن

محمد حسین روشی، دیکھے روشی محمد حسین

محمد حسین خان : ۱۲۳، ۱۲۴

محمد حمید اللہ خان (نواب) : ۱۶۸

محمد داؤد عباسی : ۶۶، ۶۷، ۵

- محمد رفیع : ۳۳  
 محمد زکریا کاندھلوی : ۳۹  
 محمد سرور (جامی) : ۱۷۵، ۱۷۴  
 محمد شاہ : ۴۵  
 محمد شفیع : ۳۲  
 محمد شوق (مید) : ۲۱۸  
 محمد صادق علی : ۲۰۳  
 محمد عصمت اللہ : ۱۸۳، ۱۸۵، ۱۸۶  
 ۸۹  
 محمد عالم (حافظ) : ۲۷۷  
 محمد علی جوہر (مولانا) : ۶۸، ۶۹  
 محمد مبین چریاکوٹی : ۳۲۸  
 محمد مجیب : ۱۲۵  
 محمد محمود شریف : ۳۱  
 محمد مخدوم : ۴۲  
 محمد نبی خان : ۱۳۳  
 محمد ادرث حسن : ۲۶۶  
 محمد حیدر کلائی : ۲۷۷  
 محمد سلیم : ۴۴  
 محمد شام فرنگی علی : ۳۳۳  
 محمد یعقوب (کنج) : ۲۳  
 محمد یوسف (مید) : ۶۱  
 محمد یوسف : دیکھیے یوسف، محمد یوسف  
 محمد یوسف (بیان) : ۱۷۲  
 محمد یوسف قادری : ۳۵۵  
 محمد یوسف مخدوم ذوال : ۶۴  
 محمد یوسف (نوی) : ۱۲۵  
 محمد واجد عباسی : ۶۳، ۶۵، ۶۶  
 ۶۷، ۶۸، ۶۹  
 محمد واجد خان : ۷۸، ۷۹  
 محمد بیگ میرزا : ۳۴۳، ۳۴۵  
 محمد حسین : ۳۰۶  
 محمد حسین بیگ ناز : ۳۳۵  
 محوی متعلق بکھنوی، محمد حسین :  
 ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶  
 محمود، راجندر سنگھ (مہالانا) : دیکھیے  
 راجندر سنگھ (مہالانا)  
 مدنی لوہن (لوہی) : دیکھیے لوہی  
 مدنی لوہن  
 رمضان حسین (مید) : ۳۲۳  
 مرزا جواد بکھنوی : ۳۲۸  
 مستقیم اللہ عباسی : ۶۳  
 مشرت جنتانی : ۱۸۶  
 مسعود بیگ میرزا : ۲۴۵  
 مسیح الدین خان : ۳۳۷  
 مسیح الزماں (مید) : ۲۰۲، ۲۰۵  
 ۳۳۲

- مشتاق حسین (نقاد الملک) : ۶۶  
 مشرقی (علامہ) عنایت اللہ خان : ۲۷۹  
 مصطفیٰ احمد شاہ : (۷۰)  
 مضطر حیدری ، دلاور حسین : ۲۲۳  
 ۲۲۲  
 مضطر ، محمد علی : ۱۴۹  
 مطیع اللہ : ۸۲  
 منظم (پیر حاد) : ۲۷۱  
 معین اللہ دکنہ : ۳۳۷ ، ۳۳۸  
 معین الدین (نمدی) : ۱۶۷  
 معین الدین احمد شاہ (نمدی) :  
 ۱۶۷ ، ۱۶۷  
 مفتون کرٹوی : ۲۸ ، ۲۹  
 ملا ، آخند زلیخ (چندت) : ۲۸  
 ملا حامد صری نورا قاضی : ۱۹۵ ، ۱۹۶  
 ملی مرزا اکھنڈی : ۳۲۹  
 ممتاز (احمد خان) : ۸۲  
 ممتاز محمد خان دو قسانہ : ۴۹  
 منصور (احمد خان) : ۸۲  
 منظر بکھنڈی ، منظر حسن : ۲۶۵ ، ۲۶۶  
 منظور المتی نعمانی : ۱۷۱  
 منور بکھنڈی : ۲۱  
 منور بیگ پیرزا : ۳۲۲  
 سوز حسین دھوی : ۲۳۴  
 سیرنگھ آبادی ، اسماعیل خان : ۲۱۹  
 سیر حسین (سیر انہوی) : ۳۰۶  
 سیر خان : ۲۴۰  
 سیرپاسان : ۷۵  
 سوتاسنگھ رامپور : ۱۹۳  
 سوسا چشتی ، مانجوری : ۶۵  
 سوسا کاکم (امام) : ۲۲۵  
 سوسن علی (سید) : ۳۵۲  
 سومہ : ۸۴  
 سوتد حسن : ۲۱۰  
 سبجوگنشی ، سید عبدالقیوم : ۴۱  
 سمدی انوار (سید) : ۲۰۵ ، ۲۰۶  
 سمدی حسن نامری : ۲۲۳  
 سمدی سنگھ : ۲۰۶  
 سندھ ناتھ : ۷۱ ، ۷۲ ، ۷۳  
 ۷۷  
 سیر ، زراکین پرشاد : ۲۵ ، ۲۶  
 ۲۶ ، ۲۷  
 سیدش داس (دراے صاحب) : ۲۹۷  
 سیدش داس (منشی) : ۳۱۱  
 سیر میر تقی : ۲۰۵ ، ۲۲۷  
 سیراجی (دشائے خان) : ۲۷۸

میران بخش (دھاش) : ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹  
 میر حسن (دشید) : ۵۴  
 میرن دیوی (دشید حسن ہدی) : ۳۰۶

## ن

نادر، کلب حسین : ۳۲۹  
 ناسخ لکھنوی : ۱۶۳  
 ناصر مجازی : ۱۲۸

نثار آبادی، نثار حسین : ۱۰۵، ۱۰۶

نجم، ابراہیم ندوی، اشید : ۱۶۰

نجم آندی، میرزا جمال حسین : ۴۳۹

۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲

نجم الدین : ۲۶۵

نجمہ دہشت نگی : ۳۲

نجیب (پیر حسان) : ۱۲۷

نصاح سنگھ (ڈاکٹر) : ۱۷۸

ندیم جعفری، فیض احمد، ۲۲۷

نذیر احمد (ڈبئی) : ۸۷

نذرت جانی : ۴۲

نذیل (پیر راشد) : ۲۸۱

نسرین (بنت جام) : ۲۷۱

نسرین (بنت راشد) : ۲۸۰

نیمہ خاتون : ۱۵۹

نشر جالندھری، محمد عبد القیوم خان :

۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳

نصیر خان : ۲۴۰

نظام الدین : ۲۸۷

نظر سجادوی، یوگ راج : ۲۰

نظم طباطبائی : ۳۳۸، ۳۶۳

نظیر خان : ۲۴۰

فقہ صاحب (شیخ فاضل نقی مجتہد)

۳۳۳

نکسن، مسٹر : ۸۹، ۹۰

نندکار سنگھ : ۲۶۰

نہے آغا زبرکھنوی : دیکھیے زبرکھنوی

نور آبادی : ۲۷، ۱۱۸، ۳۰۹

## ۳۱۰

نور الحسن ہاشمی : ۹۰

نور جہاں (ملکہ ترقم) : ۲۳۲

نور محمد : ۱۱۰

نوگشور (نشی) : ۳۳

نہال سیوار دی، احسان خانانی : ۴۰

نہرو، جی ابرہیل (پنڈت) : ۳۲۶

نیاد فچتوری : ۱۹۶

نیرنگ کاکردی، عبد الوحید : ۲۸

نیر مسعود ڈاکٹر) : ۳۳۲

## و

واہد حسین : ۲۶۵



۲۴۰	داسطی بفضل رسول :	۲۵	ہر ناتھ :
۱۷۰	حی النسا بگم :	۳۷	ہریش سنگھ (ہارانا) :
۱۵۰	وحید الا آبادی :	۲۹۵، ۲۹۴	ہزار بھنوی، سید حسن :
۱۷۰	دودا احمد :		ہنرک، بکے : دیکھیے، بکے، ہنرک
۱۸۵	وزیر النساء بگم :	۲۳	ہنر، منصب علی (میر) :
۳۱۸	دخوانا ناتھ دتا :		خی
۸۲	دقار (احمد خان) :		یامین (منجہ راشد) :
۲۱۸	دیران دیوی :	۱۳۱	یزدانی جالندھری :
۵		۲۲۵، ۲۲۴	یعقوب بیگ سرزا :
۳۲۹	ہادی علی میرزا :	۱۷۸	یوسف حسن (حکیم) :
۶۴	ہمدون الرشید :	۳۲۹	یوسف سرست (محمد شرف الدین) :
۲۲	ہاشمی، التفات رسول :	۲	یوسف، محمد یوسف :
۲۳۶	ہاشمی بانو :		یگ راج نظر سولہوی : دیکھیے نظر
۳۳۷	ہدایت علی الدین :		سولہوی، یگ راج

# مطبوعات (کتب در سائل)

الف مقصودہ		اسلاف میرٹس	
۱۳۲	اب میں دلی نہیں رہتا :	۱۲۸	اسلام اور عربی تمدن :
۲۰۹	اہمیتی :	۲۱۵	اشعار و نظر :
۹۹	احمد راد (رد و نامہ) :	۲۰۹	انکار و پس :
۱۳۲	اداس پٹائییاں :	۱۶۸	اقبال کی شاعری :
۲۳۱	ادب اور ادیب :	۱۹۵	اکالی (مفتہ دار) :
۲۳۱	ادبی ڈرامے :	۱۹۸	ابلاغ (مفتہ دار) :
۱۶۸	ادبی نقوش :	۱۳۶	المی دوا :
۲۳۱	اردو ادب آزادی کے بعد :	۲۹۲	الہیاد الجہاد :
۲۰۵	اردو ادب کی تاریخ :	۸۸	الخیل (ماہنامہ) :
۳۲	اردو ڈراما اور اسٹیج :	۱۳۶	الزام کس پر ہے :
۲۲	اردو شاعری کا سماجی پس منظر :	۲۴۱	الغافل کی خوشبو :
۲۰۹	اردو مرثیہ کا ارتقا :	۱۳۴	القرآن الرشید :
۲۰۶	اردو مثنوی کی روایت :	۲۶۲	الہام متکون :
۴۵	اورالوں کی سبج :	۱۹۸	الہام (مفتہ دار) :
۱۶۲	اورمغان جدید :	۳۰۴۹۰۵	الناظر (ماہنامہ) :
۸۲	اورمغان حالی :	۲۰۶	المانت کی اندر کبھی :
۳۰۴	ازواج الانبیاء :	۳۲۴	اشفاق و وفا :
۲۹۱	اس بازار میں :	۱۳۴۹۳۶	امروز (روزنامہ) :

۲۹۰ :	آراۓ (روزنامہ)	۲۹۸ :	اسکین رپورٹر :
۱۲۶ :	آستین جاسانپ	۹۳ :	اسرارِ لطافت :
۱۷۵ :	آفاق (روزنامہ)	۱۳۷ :	انجام (روزنامہ)
۲۰۹ :	آئینہ ....	۳۲۰ :	اندلسیہ
۲۵ :	آئینہ بخور	۳۰۴ :	انشائی قربانیاں
۳۳۰ :	آئینہ زمیں و آسمان	۳۲ :	انصاف کا کھڑا
۲۲۱ :	آئینہ معرفت	۲۹۹ :	افرادِ نظر

## ب

۷۵ :	بجن (ہندوستان)	۲۲۰ :	انبیاء
۳۲ :	بدھیش بادشاہ (کلی)	۲۱۹ :	اہلِ سیف
۷۲ :	بھارت (ہندوستان)	۲۲۹ :	ایازِ بزم
۱۳۶ :	بھگت گانگ (جین حیات)	۲۷۱ :	ایمان کی کہانی
۲۳۶ :	برق و باران (ضمیمہ)	۲۸۲ :	ایمان میں اجنبی
۲۱۹ :	برگ و بار (قاصر)	۲۲۱ :	ایمان میں رشتہ گوئی
۳۳۰ :	بزمِ سلیمان (ادیب)	۲۳۰ :	ایمانوں کا مقدس ڈراما
۲۴۸ :	بڑی جوتلی (محمود بیگ)	۳۶۶/۳۲۱ :	ایشیا (ہفتہ وار)
۴۸ :	بوستان (سعدی)	۷۵ :	ایک شمع ہزار دیوانے
۲۱ :	بوسے گل (راکھ)		۱
۲۹۲ :	بوسے گل، "دل" و "چراغِ محفل"	۳۲۹ :	آبِ حیات
۱۵۸ :	بیانِ انوار	۳۰۶ :	آبشار
۳۳۹ :	بیسویں صدی میں اردو ناول	۲۹۸ :	آجکل (ماہنامہ)
۲۷۱ :	بھارت کے نامور ماہرین	۷۴ :	آدمی اور کتے
۱۲۲ :	بھنور (شکار پوٹھی)	۱۲۲ :	آدمی چاند کی رات

نیری صورت میری آنکھیں دہندہ تھا: ۷۵

تردنی (مفتون) : ۲۴۰

تعداد پر چٹائی : ۱۸۲

تصویر چہرہ دا ہتھام : ۱۳۷

تعبیر تشریح تنقید (کتاب القرآن) : ۲۵۱

تفصیل لطائف (جہان) : ۲۵

طاس بحر (شیم) : ۲۳۶

تہ خدمت (خوش) : ۲۹۲

تیمور کا گھرانا (چٹائی) : ۱۸۲

تہا تہنا (دہندہ تھا) : ۷۴

تہذیب بحوث (نجم) : ۳۵۲

تہذیب نسوان (ہتھام) : ۷۴

تہذیب (دو ہتھام) : ۲۹۸

ٹ

ٹریڈر جیٹ (ہتھام) : ۱۶۰

ٹیلیفون کی کہانی (کتاب القرآن) : ۲۰۶

ٹھوکر (دہندہ تھا) : ۷۵

ج

جام جم (مضطر) : ۲۲۲

جامد (ہتھام) : ۱۳۵

جان برادر (شیم) : ۲۳۶

جب پھر دیتے ہیں (ٹھاکر پونچھی) : ۱۴۲

جذبات بسل : ۳۰۹

پ

پاکستان سے ہندوستان تک (دہندہ تھا) : ۷۵

پت جھوکے پھر ٹپے (ٹھاکر) : ۱۴۲

پرچم ضیا (نامہ) : ۲۱۹

پردہ سادہ (بھووشی) : ۲۲

پہن دیوار بزم (خوش) : ۲۱۲

پہنایت (ہتھام) : ۱۰۰

پیادہ کا موسم (دہندہ تھا) : ۷۵

پیادے بادل (ٹھاکر پونچھی) : ۱۴۲

پیام تعلیم (ہتھام) : ۱۳۶، ۱۳۵، ۱۳۲

پیغام صلح (مفت دار) : ۱۷۲

پھولوں کا بار (نجم آندی) : ۲۵۱

ش

شاہین (شاہ معین الدین احمد) : ۱۶۷

شاہین اسلام (معین الدین احمد) : ۱۶۷

شاہین اردو (محمود احمد عباسی) : ۲۸

شاہین فرزند شاہین : ۳۵

شاہ کے اپنی (حسین حسان) : ۱۳۶

شجاعت الود (انور کاسمی) : ۱۶۳، ۱۶۴

شعیت انسان (محمود احمد عباسی) : ۲۸

شعیت مزید (محمود احمد عباسی) : ۷۰

شعرۃ الکرام (محمود احمد عباسی) : ۲۸

شعرۃ شعرا سے اردو (۷۰) : ۷۰

جدید ایشراق در بیان ننگ مفتون: (۲۲:۱۲۱)

جواہر پامے (ناصر) ۳۱۹

۱۲۰ ہر سخن (ادیب) : ۳۲۸

جہے بکشان (نہی) ۳۲

جہاں میں رہتا ہوں (ہندو ناتھ): ۷۳

جہاں نما (ابن ہاشم) : ۱۰۰

### ج

چاندن کے سایے (ٹھاکر پونجی): ۱۳۲

چاندی کے ستار (ہندو ناتھ): ۷۳

چٹان (مفتی وار) : ۲۹۰

چراغِ بزمِ دہم آفری: ۳۳۹

چغتائی آرٹ (چغتائی): ۱۸۳

چغتائی اور اس کے نقاد : ۱۸۲

چغتائی کی عربی تصویریں : ۱۸۴

چندوں کے چاند (ٹھاکر پونجی): ۱۴۲

چہ قلندر گفتیم (شودش) : ۲۹۲

### ح

حرفِ غزل : ۲۰۵

حرفِ ناتمام (طالب) : ۲۹۹

حرفِ نیم شب (شمیم) : ۲۳۶

حزبت (دور نامہ) : ۹۹

حسرت کمرہ (شفقت) : ۲۲۸

حسین شہید بہروردی نوشی : ۲۵۲

حضرت آردوکی (صلاحیہ) : ۳۵۰

حقیقت تو کمبو (محمد حوٹائی) : ۷۰

حمید نظامی (خود مرض) : ۲۹۲

حیاتِ سلیمان (ندوی) : ۱۶۸

حیاتِ شیدنا (امجاد) : ۲۲۱

### خ

خالصا خبار (مفتی وار) : ۱۹۰

خاٹا زنجیر (نیرم) : ۲۲۷

خدا نگ تازہ (طالب) : ۳۰۰

خلافیت معاویہ دینید (محمد حوٹائی) : ۷۰

خلفائے راشدین (شاہ حسین الدیج) : ۱۰۰

خوارزمی (سری نام) : ۶۵

خجستان کیفی (طالب) : ۳۰۰

خورشیدِ دانا (سج الزماں) : ۲۰۶

خوشترنگ پھول (چوان) : ۲۵

خیالستان (ابن ہاشم) : ۹۸

### د

داستانِ میری، تو کتھرا (ہندو ناتھ): ۷۳

دایہ حسرت (شفقت کالمی) : ۲۲۸

دلستانِ آردو (ادیب) : ۲۲۷

دود کاوشہ (ہندو ناتھ) : ۷۵

دستگیر (ابن ہاشم) : ۲۹۸

دلی انعامہ کوٹادلی کی (محمد بیگ) : ۲۳۸

۷۵ :	دیا	۳۶ :	دلی میں مرثیہ گوئی (ادیب)
۲۶۳ :	روحِ ادب	۱۲۵ :	دنیا کے بچے حسین خاں
۳۲۸ :	روحِ نفیس	۲۱ :	دو چرخ
۲۳۶ :	روشن اندھیرا	۱۲۶ :	دیک (عین خاں)
۹۹ :	روای (باناس)	۱۲۸ :	دین رحمت (شاہ معین الدین احمد)
۴۶ :	رہنایانِ ہند	۳۰۵ :	دیوانِ اظفری
۱۹۹۱۹۵۱۸۹ :	ریاست (مفتی داد)	۳۰۵ :	دیوانِ بیر محمدی
۲۰۰ :	ریاست	۱۰۶ :	دعوتِ میر سید ہادی (نثار)
۲۰۶ :	ریاستہائے متحدہ کی تاریخ	۳۱۹ :	ڈال ڈال، بات بات (ناصر)
۲۶۸ :	زخمِ حسرت	۱۲۲ :	نویسی (ٹھاکر پوٹھی)
۱۴۲ :	زلف کے سر پہ تنک	۳۱۹ :	نور و فکر (ناصر)
۱۸۹۴۵ :	زمانہ (باناس)	۷۵ :	راتِ اندھیرا ہے
۱۳۶ :	زمین کے بھائی بہن	۱۲۲ :	رات کے گھونگٹ
۲۸۸۱۵۹ :	زمیناد (روزنامہ)	۲۸۲ :	رام، راشد پر
۱۲۲ :	زندگی کی دوڑ	۲۵ :	رام بن باس
۷۵ :	زمین سے ہر د	۱۲۶ :	رامو نے پڑھنا سیکھا
۷۳ :	ساقی	۲۵ :	رباعیاتِ جہان
۳۰۰ :	سبزہ بیگاد	۲۹۹ :	رنگِ آلا
۱۸۳ :	ستاروں	۱۹۵ :	رحیم (روزنامہ)
۴۹ :	سراج الدین علی خان آوند	۳۱۶ :	رفیق الاطبا (باناس)
۳۲۵ :	سرکارِ دہ عالم		

۸۰ :	ریششو	۱۶ :	سوائے نشاط
۴۶ :	شعاع بہر	۴۶ :	سفید جوگن
۹۹ :	شعاع پنجاب	۸۲ :	سفینہ ادب
۶۱ :	شکستہ (نامک)	۴۳ :	سلطان عالم و اجل شاه
۱۲۵ :	شعی	۶۱ :	سودا (ڈراما)
۱۲۲ :	شعی ہر رنگ میں جلتی ہے	۱۰۵ :	سودا گر پیر
۱۹۳ :	شہادت کا تازہ قطرہ	۷۵ :	سوز، دیت ہنگامہ
۱۰۰ :	شیرازہ (مفتہ دار)	۲۵ :	سوز دل
۱۹۱ :	شیر پنجاب (مفتہ دار)	۲۶۶ :	سبیل یحییٰ
ص		۲۹۲ :	تدوین شاہ شاہ بخاری
۲۳۶ :	صح فادان	۱۰۵ :	سیر پرستہ
ط		۱۶۷ :	سیرۃ النبی
۳۰۵ :	طباقہ ناصری	۲۰۱ :	سیف و قلم شش
۳۲ :	طلوع شمس	شاخاد (دوبہی)	
عرب کی موجودہ حکومتیں		۳۲ :	شاعر اعظم نہیں
۱۱۰ :	عردہ (نامیہ)	۳۰۶ :	شاعر کا دل
۱۶ :	عظیم آباد کی شہزادی محفلیں	۲۷۸، ۱۷۳ :	شامکار
۲۳۶ :	عکس گل	۲۹۲ :	شبِ جلے کہ سن بودم
۱۸۳ :	عمر خیام (مستود)	۱۱۲ :	خبر رفتہ
۱۸۳، ۱۸۳ :	عمل چٹائی	۲۷۱ :	شبنون (نامیہ)
غ		۲۶۳ :	شرح بال جبریل
۱۲۹۰ :	غبارِ خاطر	۳۲۲ :	شرح طباطبائی اور تنقید کلام غالب

## ف

۲۵	۱	کلمات جوان	
۲۸۶	۱	کلمات موسی	۲۵۲ :
۲۰۶	:	کلمات میسک	۲۵ :
			۳۲۷ :
۷۲	:	کمال	۳۲۹ :
۲۹۱	:	گفتنی با گفتنی	۳۲۷ :
۲۱۵	:	کلمات بنگ	۲۹۲ :
۹۵	:	کلمات انصاحت	
۵۲	۳۸ :	گمستان (سعدی)	
۳۳۰	:	کلمات سخن	
۱۹۵	:	گوردگشتال (سفره دار)	
۲۱۵	:	گوردگشتال ناسر	
۲۰	:	گیتا	

## ق

		قذیل (سفره دار)	۱۷۵، ۱۷۴، ۱۷۳، ۱۷۲، ۱۷۱، ۱۷۰
		قواعد کلیه بجا کا	۳۳۰ :
		قوس قزح	۲۷۷ :
		کا بن	۱۸۲ :
		کار چنانی	۱۸۲ :
		کامیاب تلوار	۳۲ :
		کتاب القوت	۵۲ :
		کتاب الفحو	۵۲ :
		کرینت (پانام)	۷۸ :
		کرینت سو (شکود)	۹۰ :
		کشیر کی سیر	۳۰۰ :
		کشود کا قفا	۳۲ :
		کلمات اشعرا	۳۰۵ :
		کلمات اجدی	۳۰۵ :

## ل

۲۸۲		لا : انسان (راشد)	
۱۷۲		لاط (انگیزی - سفره دار)	۱۷۲ :
۶۵	:	لحن داودی	
۳۲۹	:	لکهنو کا شای اشج	
۳۲۹	:	لکهنو کا عروای اشج	
۱۸۲	:	لکان	
۷۵	:	لیدر	
۱۷۷	:	لیل و نهار (سفره دار)	



۲۶۶ :	منظوم نظامہ	۱۸۲ :	اٹھن آکٹس چٹائی کا حکمہ
۲۶۷ :	مواضع افسانہ و دیبہ	۲۸۶ :	ادب
۲۹۲ :	نوت سے دیبہ	۹۰ :	ماہ نو
۳۵۰ :	موجودہ معراج	۱۰۴ :	ماہ دہم
۱۶۴ :	ہماجرین	۷۲ :	انی ڈارنگ
۳۱۹ :	حکمت مکتوب ایہ	۲۶۲ :	شنوی مولانا آدم
۳۱۹ :	میراجی	۳۲۴ :	جاسین رنگین
۳۲۱ :	میری دنیا	۳۶ :	ماددات ہر
۲۰۱ :	ن	۱۸۹ :	عزیز رہبانہ
۲۱ :	نماز دل	۲۲۱ :	مختصر تاریخ ادب اردو
۱۲۵ :	نماز دل اسلام	۶۱ :	مذہب اور شاعری
۴۶ :	نثر فریاد	۳۳۰ :	مراثی و بختہ
۲۴۸ :	نظمستان (ماہنامہ)	۱۸۳/۱۸۲/۱۸۱ :	مرقع چٹائی
۶۱ :	نظمستان (ماہنامہ)	۱۸۳ :	
۸۲ :	نظمستان (ماہنامہ)	۳۱۶ :	میساک (ماہنامہ)
۲۶۳ :	نظمستان (ماہنامہ)	۲۵۱ :	مشورہ (ماہنامہ)
۳۲۴ :	نظمستان (ماہنامہ)	۳۵۲ :	معراج فکر
۱۹۵ :	نظمستان (ماہنامہ)	۲۸۶ :	میساک، نیران
۲۲۸ :	نظمستان (ماہنامہ)	۶۴ :	مکتوبات حال
۳۶۶ :	نظمستان (ماہنامہ)	۲۲۱ :	مکتب ادب کے شاعرانہ
۱۸۲ :	نظمستان (ماہنامہ)	۷۵ :	منزل ایک، مسافر
۲۲۸ :	نظمستان (ماہنامہ)		

۵	نفسا صبر (باہنامہ) : ۱۷۳	نفسا صبر (باہنامہ) : ۱۷۳
۱۶۶ :	نفسا قی جانزے (باہنامہ) : ۱۷۳	نفسا قی جانزے (باہنامہ) : ۱۷۳
۲۳۶ :	نقشِ چغتائی : ۱۸۴، ۱۸۲	نقشِ چغتائی : ۱۸۴، ۱۸۲
۲۳۴، ۲۳۵ :	نقیب (باہنامہ) : ۱۲۵	نقیب (باہنامہ) : ۱۲۵
۲۵۹ :	نکار (سختہ دار) : ۱۳۷	نکار (سختہ دار) : ۱۳۷
۲۳۷، ۱۷۳ :	نکارِ جنات ادیب : ۳۳۰	نکارِ جنات ادیب : ۳۳۰
۶۸ :	نکدای (سختہ دار) : ۱۳۷، ۱۰۰	نکدای (سختہ دار) : ۱۳۷، ۱۰۰
۱۱۲، ۱۹۱ :	نوائے راز : ۴۲	نوائے راز : ۴۲
۱۳۷ :	نوائے وقت (روزنامہ) : ۱۵۱، ۱۵۰	نوائے وقت (روزنامہ) : ۱۵۱، ۱۵۰
۱۹۵ :	نوباد (باہنامہ) : ۸۸	نوباد (باہنامہ) : ۸۸
۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵ :	نئی بیماری : ۷۲	نئی بیماری : ۷۲
۱۸۲ :	نئے ادبی رجحانات : ۲۲۰	نئے ادبی رجحانات : ۲۲۰
۳۶۹ :	نئے نام : ۲۷۱	نئے نام : ۲۷۱
۳	نیزنگ خیال (باہنامہ) : ۲۷۱، ۲۷۲	نیزنگ خیال (باہنامہ) : ۲۷۱، ۲۷۲
۲۹۹ :	و	و
۱۶ :	دادیاں اور دیرانے : ۱۴۲	دادیاں اور دیرانے : ۱۴۲
۱۴۲ :	واقعاتِ اطفری : ۲۵۵	واقعاتِ اطفری : ۲۵۵
۲۸۲، ۲۸۳ :	وقت کا آسمان : ۲۸۲، ۲۸۳	وقت کا آسمان : ۲۸۲، ۲۸۳
۴۱۶، ۴۱۷ :	وکیل (اگر تشر) : ۴۱۶، ۴۱۷	وکیل (اگر تشر) : ۴۱۶، ۴۱۷
۳۰۰ :	۲۱۷	۲۱۷
۱۴۳ :	یادگارِ برق	یادگارِ برق
۱۶ :	یادگارِ مکتبی	یادگارِ مکتبی
۱۴۲ :	یادوں کے گنبد	یادوں کے گنبد
۲۸۲، ۲۸۳ :	یاما (کو پڑھ) : ۲۸۲، ۲۸۳	یاما (کو پڑھ) : ۲۸۲، ۲۸۳
۴۸ :	یوسف زلیخا (جالی) : ۴۸	یوسف زلیخا (جالی) : ۴۸
۳۰۰ :	یہ بھی دلی	یہ بھی دلی
۱۴۳ :	یہ رشتے یہ لوگ	یہ رشتے یہ لوگ
۷۴ :	یہاں سے وہاں تک	یہاں سے وہاں تک

### بچہ تعلیم کے مسائل



مصنف: م. ا. قاسمی  
صفحات: 172  
قیمت: 57/- روپے

### مطالو قیاری خاطر



مصنف: عہدالتوی دوستی  
صفحات: 228  
قیمت: 68/- روپے

### وہ صورتیں الٹی



مصنف: م. ا. ک. دام  
صفحات: 258  
قیمت: 88/- روپے

### غالب اردو نگارم کا انتخاب



مصنف: محبوب  
صفحات: 132  
قیمت: 59/- روپے

### وجہ: شاعر اور شخص



مصنف: محسن عالم  
صفحات: 144  
قیمت: 60/- روپے

### مکملی اداس



مصنف: فراق گورکھپوری  
صفحات: 260  
قیمت: 90/- روپے

### دلی کی چند عجیب ہستیاں



مصنف: اشرف صدیقی، دہلوی  
صفحات: 224  
قیمت: 80/- روپے

### تذکرہ ماہ و سال



مصنف: م. ا. ک. دام  
صفحات: 432  
قیمت: 130/- روپے